آبلہ پا
رضیہ فصیح احمد

آبلہ پا

رضیہ فصیح احمد
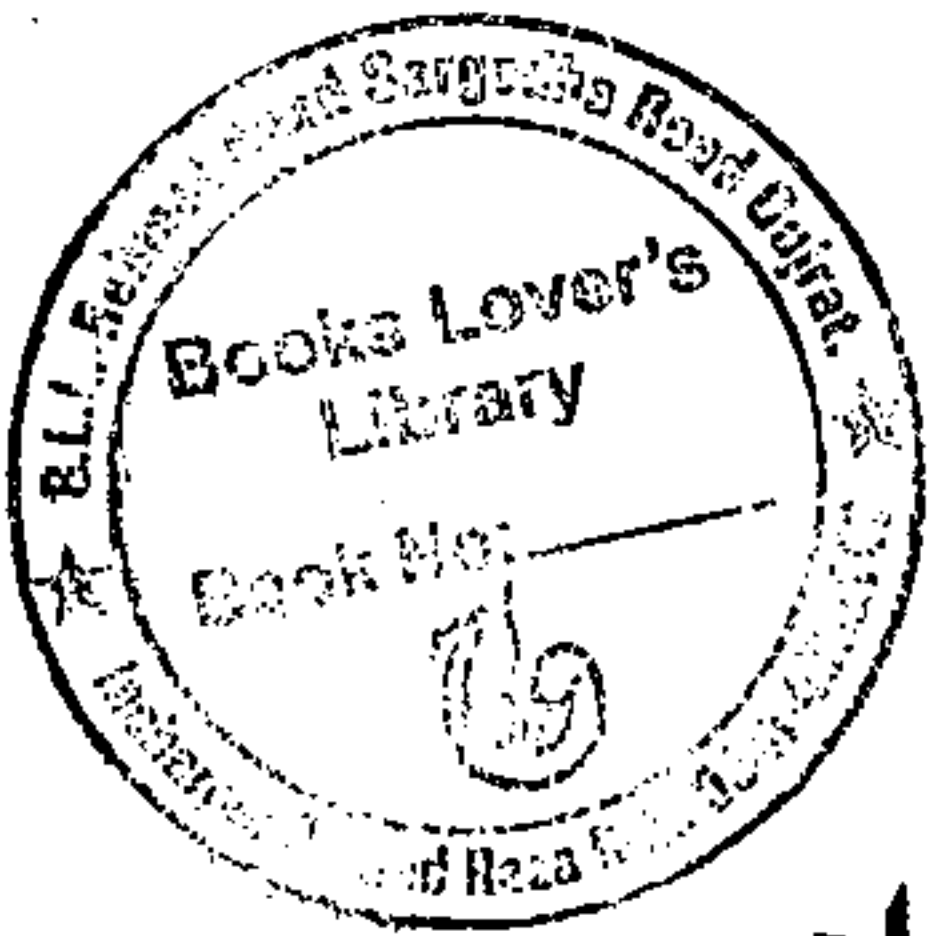
Marfat.com

آبلہ پا

Aabla Pa

(Novel)

By : **Razia Fasih Ahmad**

پہلی اشاعت : مئی ۲۰۰۳ء

ناشر : اکادمی بازیافت

اردو سینٹر، کمرہ نمبر۴ (پہلی منزل) اردو بازار، کراچی۔ فون : ۲۶۳۴۳۳۰

کمپوزنگ : لیزر پلس، اردو بازار، کراچی

قیمت : ۲۵۰/روپے (پاکستان میں)

۲۵/امریکی ڈالر (بیرونِ ملک)

Marfat.com

"ف" کے نام

Marfat.com

حصّہ اوّل

Marfat.com

۱

کوئٹہ کے ہوٹل ''چمنستان'' میں یہ میری دوسری شام تھی۔ بابا یہاں اپنے کسی کام کے سلسلے میں آئے تھے۔ انھوں نے کہا تھا اگر مناسب ہوا تو بعد میں تمھیں بلوا لوں گا۔ میں کل شام یہاں پہنچی تھی، تھکن ہونے کے سبب کل اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ کھانا بھی وہیں منگوا لیا تھا۔ آج میں ہوٹل کے بڑے سے لان میں مچھلیوں کے حوض کے نزدیک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ چنار کا ایک درخت میرے سر پر سایہ کیے تھا۔ حوض کے اوپر دیوار پر لگی ہوئی سرخ، سبز اور نیلی روشنیاں ابھی ابھی جلی تھیں۔ سامنے سرو کے درخت پر لپٹی ہوئی رنگین بتیاں بھی جل اٹھی تھیں۔ سبز بھیگی ہوئی گھاس پر سے لانبا راستہ طے کر کے جو ہوا مجھ تک آرہی تھی، اس میں خنکی تھی۔ اس شام جب دوسرے شہروں میں بڑی گرمی پڑ رہی ہوگی، یہ خنکی خوش گوار تھی مگر کبھی کبھار اس خوش گوار ہوا کے تیز جھونکے بھی میرے بازوؤں پر سردی کا احساس جگا دیتے تھے۔ اس وقت تھوڑے تھوڑے سے فاصلے پر بہت سے گروپ خوش گپیوں میں مصروف تھے، میں ان میں سے کسی سے بھی متعارف نہیں تھی۔ سب کمروں کے مختلف عمروں اور صورتوں کے بچے لان میں کھیل رہے تھے۔ ان میں سے ایک بچے نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ وہ گورا گورا موٹا موٹا سا تھا۔ اس کے بال سنہری اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ اس کی عمر تین سال کی ہوگی لیکن وہ بلا کا شریر تھا۔ اس کے ساتھ پندرہ سولہ سال کا ایک ملازم لڑکا تھا جس کے قابو میں وہ کسی طرح نہیں آتا تھا۔ ایک سرکنڈا اس کے ہاتھ میں تھا جس سے وہ کبھی پھول جھاڑنے لگتا، کبھی کرسی پر بیٹھے ہوئے بچوں کے بید کے سوراخوں میں سے چھونے لگتا اور ان کے پیچھے دیکھنے پر ہنستا کھلکھلاتا

Marfat.com

بھاگ جاتا۔ اس کی ہنسی دوسروں کے مقابلے میں زیادہ شریر اور معصوم تھی۔ یوں تو سارے بچے اچھے لباس میں تھے لیکن اس کے کپڑوں کی تراش خراش میں زیادہ نفاست اور کسی اچھے درزی کی کاری گری صاف جھلکتی تھی۔ میں نے اسے کئی مرتبہ اپنے پاس بلایا مگر وہ کلیلیں کرتے ہرن کی طرح اُچک کر اِدھر اُدھر ہوگیا۔ میں تنہا بیٹھی رہی، اجلے آسمان پر دسویں کا چاند جگمگا رہا تھا۔ بابا ابھی تک نہ آئے تھے۔ ہوٹل میں رات کے کھانے کا وقت نو بجے تھا۔ بابا نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ اگر میں پونے نو بجے تک نہ آؤں تو تم ضرور کھا لینا کیوں کہ ممکن ہے کہ میں وہیں کھانا کھالوں۔ پونے نو ہو رہے تھے اور میں گومگو کے عالم میں تھی کہ جاؤں یا تھوڑی دیر اور بابا کا انتظار کرلوں۔ اتنی دیر میں ایک سایہ بوبی بوبی کہتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ لان کی چوڑی اور نیچی تین چار سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ اوپر آیا تو میں نے چاند کی روشنی میں دیکھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں صرف اس کی گہری سیاہ آنکھیں ہی دیکھ پائی پھر میں نے منھ پھیرلیا۔ وہ میرے نزدیک سے گزر گیا۔ تھوڑی دیر میں اسی شریر بچے کو لیے ہوئے وہ میرے پاس سے گزرا۔ وہ بچے سے انگریزی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ اتنا چھوٹا سا بچہ خوب رواں انگریزی بول رہا تھا۔ میرے نزدیک سے نکلتے ہوئے بچے نے بھی اور اس لڑکے نے بھی ایک اچٹتی ہوئی سی نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گئے۔

جب نو بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے اور بابا نہ آئے تو میں کھانے کے لیے چلی گئی۔ اس وقت ڈائننگ ہال کی قریب قریب تمام میزیں بھری ہوئی تھیں، بیرے بڑی مستعدی سے پلیٹیں اٹھانے، مختلف میزوں پر مختلف کورس دینے، پانی کا جگ اِدھر سے اُدھر لے جانے میں مصروف تھے، میں جا کر اپنی میز پر تنہا بیٹھ گئی۔ میری میز کے بالکل سامنے کھڑکی کے نزدیک وہی لڑکا بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ پر بوبی بیٹھا تھا مگر وہ کھانا کھانے کے بجائے سامنے دیوار پر لگی جلتی بجھتی رنگین روشنیوں کو دیکھ رہا تھا اور ایک سانس میں سوال کیے جاتا تھا کہ یہ کس طرح جلتی ہیں؟ بجھتی کیوں نہیں؟ یہ کبھی سرخ، کبھی نیلی اور کبھی ہری کیوں ہوجاتی ہیں؟ ان کے درمیان جو گھڑی لگی ہے، اس میں اس وقت کیا بجا ہے اور آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے؟ لڑکا مستقل مزاجی سے اس کے سوال کا جواب دیتا اور پھر اس کی توجہ کھانے کی طرف دلاتا۔ بوبی ایک نوالہ لیتا اور پھر سوالوں کی

Marfat.com

بوچھاڑ کر دیتا۔ یہ دیکھ کر جانے کیوں مجھے ہنسی آ گئی۔ لڑکے نے میری طرف دیکھا اور بے بسی سے مسکرا دیا جیسے کہہ رہا ہو، کیا کروں اس بچے نے عاجز کر دیا ہے، نہ کھاتا ہے، نہ کھانے دیتا ہے۔ اس کے بعد کھانے کے دوران میں وہ اکثر میری طرف دیکھتا اور میرے ہاتھ کپکپا کر رہ جاتے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر یہ یوں ہی دیکھتا رہا تو میں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہ کھا سکوں گی۔ مجھے اس وقت بوبی کے پے در پے سوالات بہت غنیمت معلوم ہوئے جو اس لڑکے کی توجہ اپنی طرف کر لیتے تھے۔

بابا تیز تیز قدم رکھتے آئے اور ''گڈ گرل'' کہہ کر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کے بھاری بھرکم سراپے کے آگے وہ لڑکا بہت کچھ چھپ گیا اور میں اطمینان سے کھانا کھانے لگی۔ بوبی کے پیہم سوالات اور لڑکے کی پیار بھری ڈانٹ ابھی جاری تھی۔ یہاں تک کہ دوسری میزوں کے بہت سے لوگ مسکرا مسکرا کر ادھر دیکھنے لگے۔ بابا نے بھی مڑ کر اُدھر دیکھا اور مسکرا کر بولے۔ ''بچے سب ایک سے ہوتے ہیں۔''

میں سوچنے لگی، اس بچے کے ماں باپ شاید کلب یا پکچر گئے ہیں۔ اب انھیں آ جانا چاہیے کیوں کہ کھانے کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ ساڑھے نو بج گئے۔ ایک ایک کر کے سب لوگ میزوں سے اٹھ کر چلے گئے، وہ لڑکا کھانا ختم کر کے بچے کا ہاتھ پکڑے باہر جانے لگا۔ ہماری میز کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اس نے بابا کو وِش کیا۔ بابا نے بچے کے موٹے موٹے سرخ گال کو پیار سے نوچ دیا۔ وہ بابا کا ہاتھ جھٹک کر اچھلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ''پیارا بچہ ہے۔'' بابا نے کہا اور کافی پینے میں مشغول ہو گئے۔ میں دیر کا کھانا کھا چکی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اس بچے کے ماں باپ ضرور کھانے پر گئے ہیں، تبھی اب تک نہیں لوٹے اور اس وقت یہ بڑے بھائی کے چارج میں ہے۔

کھانا کھا کر ہم باہر نکلے تو بابا نے پوچھا، ''تھوڑی دیر باہر بیٹھو گی؟''

''سردی لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ واقعی ہوا اور خنک ہو گئی تھی۔

''کمرے سے کوئی گرم چیز پہن آؤ۔'' بابا نے کہا۔

جس وقت میں سیڑھیاں چڑھ رہی تھی، میں نے دیکھا کہ بوبی اس لڑکے کا ہاتھ پکڑے آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ قدموں کی چاپ پر پلٹ کر اس نے مجھے دیکھا اور بولا:

"Daddy, look at this girl, is she like my mummy?"

Marfat.com

لڑکے نے بے خیالی میں مڑ کر دیکھا، مجھے دیکھ کر جلدی سے اس نے اپنا منہ پھیر لیا اور تیزی سے بولا، "No, she is not"۔ اس کی آواز میں جھنجھلاہٹ اور بیزاری غصے کی حد تک پہنچ گئی تھی۔

"Don't ask me silly questions". اوپر پہنچنے کے بعد مجھے اس لڑکے کی آواز سنائی دی۔

میرے قدم جم گئے۔ ایک تو اس بچے نے اسے ڈیڈی کہا تھا۔ وہ لڑکا اس بچے کا باپ تھا اور پھر مجھے اپنی بیوقوفی پر غصہ آنے لگا۔ اگر باپ نہ ہوتا تو بوبی اسے ڈیڈی کیوں کہتا مگر وہ تو بہت کم عمر نظر آتا ہے... اور اس سے بھی زیادہ دھچکا مجھے جس چیز سے لگا، وہ تھا اس کا چبھتا ہوا فقرہ "No, She is not"۔ ممکن ہے بوبی کی ماں مجھ سے بہت زیادہ خوب صورت ہو۔ پھر بھی اس میں اس درجے بگڑنے کی کیا بات تھی؟ یہ خفگی اور جھنجھلاہٹ تو ایسی تھی جیسے کسی ملکہ کو کسی چوڑھی چماری سے تشبیہ دی جائے۔ جب ان دونوں کے قدموں کی چاپ بند دروازے کے پیچھے ڈوب گئی تب آہستہ آہستہ اوپر چڑھ کر اپنے کمرے میں پہنچی، کاندھوں پر شال ڈال کر میں بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔ ہوٹل کی عمارت نصف دائرے کی شکل میں بنی ہوئی تھی۔ تین ونگ سامنے اور دو سامنے کے لمبے برآمدے سے ملحق پیچھے کی طرف چلے گئے تھے۔ سامنے درمیان میں آفس، لاؤنج اور کھانے کا کمرہ تھا، اس کے دائیں بائیں دو منزلہ رہنے کے کمرے، ہوٹل کے کمروں اور لان کے درمیان جو سڑک تھی وہ خاص سڑک سے نکل کر نصف دائرے کی صورت میں گزرتی ہوئی آگے جا کر پھر اس سڑک سے مل جاتی تھی۔ بڑے لان میں جہاں میں ابھی بیٹھی تھی، ایک قدِ آدم دیوار بھی نیم دائرے کی شکل میں چلی گئی تھی۔ یہ دراصل کسی بڑے فقیر کے مزار کی دیوار تھی جس کا دروازہ دوسری طرف سڑک پر کھلتا تھا۔ اس دیوار پر بہت سی سرسبز بیلوں نے اپنا گھر بنالیا تھا۔ کمروں کے آگے بھی چھوٹے چھوٹے لان تھے جہاں کیاریوں میں پھول لگے ہوئے تھے اور دو چار اونچے اونچے درخت بھی۔ آفس کی عمارت کے سامنے لان کے آگے پتھروں پر چونا ڈال کر انگریزی اور اردو میں ہوٹل کا نام زمین پر لکھا ہوا تھا۔ یہیں ایک بڑے سے پنجرے میں آسٹریلیا کے طوطے اور مور پنکھیا کے ایک چھوٹے سے درخت پر مینا کا پنجرہ تھا جو دن بھر اپنی باریک آواز میں انسانی بولی کی نقل

Marfat.com

اتارتی تھی اور پھر لہک لہک کر گانا شروع کر دیتی تھی۔ ہر ونگ میں آگے کی طرف تین زینے تھے۔ ہر زینہ دو suites تک پہنچاتا۔ ہمارا زینہ بوبی کے اور ہمارے کمروں کا مشترک زینہ تھا۔ ایک ونگ کے پیچھے یہاں سے وہاں تک پتلا سا برآمدہ تھا جس تک جانے کے لیے صرف ایک لوہے کا بل کھاتا ہوا زینہ تھا۔ یہ اپنی گولائی کی وجہ سے بچوں کی توجہ کا مرکز تھا اور کوئی بہت کم اِدھر سے آتا جاتا تھا، ہر ونگ کے پیچھے سوائے ریت اور پتھروں کے کچھ نہ تھا۔ جہاں میں کھڑی تھی، وہاں سامنے کے دائیں طرف پہاڑوں کا سلسلہ ''چلتان رینج'' کہلاتا ہے جس پر مری بریوری اور سمنگلی ہوائی اڈے کے شیڈ اور درخت نظر آتے ہیں۔ اس وقت ان دونوں جگہوں کی روشنیاں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ بائیں طرف بے برگ و گیاہ ''مردار'' کا سلسلہ ہے، اس کے اونچے اونچے پہاڑ صبح کی دھند میں ڈوبے ہوئے بہت دور نظر آتے تھے مگر شام کو جب آسمان صاف اور نیلا ہوتا اور ڈوبتے سورج کی شفق کا عکس اُن پر پڑ رہا ہوتا تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ کئی قدم آگے سرک آئے ہیں اور ابھی ہمارے سر پر آن کھڑے ہوں گے مگر اس وقت اندھیرے میں یہ پھر دور چلے گئے تھے... ان پر کوئی آبادی نہیں تھی، اس لیے روشنی بھی نہیں تھی، صرف ایک تارہ عین اوپر یوں چمک رہا تھا، جیسے چوٹی پر بنے ہوئے کسی مکان کے دریچے کی روشنی ہو آس پاس دیوہیکل، ننگے پربت کی چوٹیوں کے کنگورے آسمان پر تا حدِ نظر پھیلے ہوئے تھے۔ دور سامنے کوئٹہ شہر کی روشنیاں ڈھیر سے جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہی تھیں۔ میں نے نیچے دیکھا ہوٹل کے سرو اور مور پنکھیا ٹھنڈی ہوا میں ہل ہل کر سرگوشیاں کر رہے تھے۔ لان پر چار چار، پانچ پانچ کی ٹکڑیوں میں لوگ پھر آ جمے تھے۔ بابا کا بھاری بھرکم جسم حوض کے کنارے جھکا ہوا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر میں برابر کے بند دروازے پر نظر ڈالتی ہوئی نیچے چلی گئی... بوبی کے شور مچانے کی آواز نیچے تک آ رہی تھی۔ اس وقت ان دونوں کی زینے پر کی گئی گفتگو پھر میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ خاص طور پر جھنجلایا ہوا جملہ:

"No, She is not."

نیچے پہنچی تو بابا نے کہا، ''آؤ چند خواتین سے تمھارا تعارف کروا دوں تا کہ دن میں تم بور نہ ہو۔'' بابا ایک گروپ میں مجھے لے کر پہنچے جہاں چار جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلی مرتبہ کے تعارف میں مجھے کبھی کسی کے نام یاد نہ ہوئے۔ بہت سے آدمیوں کے

Marfat.com

جلدی جلدی بولے جانے والے سارے نام آپس میں گڈمڈ ہوجاتے ہیں۔ میں صرف اتنا سمجھ سکی کہ ان میں سے ایک جوڑا عراقی ہے، ایک ایرانی اور باقی دو پاکستانی۔ گفتگو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہورہی تھی کیوں کہ اس وقت یہاں ایک زبان تھی جسے سب سمجھتے تھے۔ میں سوچنے لگی کتنی عجیب بات ہے کہ وہ تین غیرملکی جن کی زبان کا رسم الخط ایک ہے، بہت الفاظ بھی ایک ہیں ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے اور گفتگو کے لیے ایک ایسی چوتھی زبان کا سہارا لیتے ہیں جو تینوں زبانوں سے مختلف ہے۔ عراقی بیوی اسی ہوٹل کے متعلق گل افشانی کر رہی تھی۔ ''دِس ہوٹل نو گڈ۔ نو گڈ فیڈ'' بمعنی ''فوڈ'' ''ٹو ڈیز نو میٹ۔ اِن عراق ایوری ڈے میٹ۔'' پھر وہ اپنی شکستہ انگریزی میں عراق کی امارت اور موڈرن ہونے کے قصیدے پڑھتی رہیں۔ خصوصاً بغداد کے۔ وہ بتاتی رہیں کہ ہم تم لوگوں سے بہت آگے ہیں کیوں کہ یورپین لباس پہنتے ہیں۔ عورتیں ملازمتیں کرتی ہیں اور مردوں کے ''استعمار'' سے صاف بچ گئی ہیں۔ اس پر ایرانی خاتون کو جوش آیا۔ انھوں نے اپنی ایک شفاف ٹانگ دوسری پر رکھ کر پینترا بدلا اور طہران کے قصیدے پڑھنے لگیں۔ ''طہران بہشت بر روئے زمین است۔'' ایران کی عورتیں اتنی خوب صورت ہیں کہ ان کی کوئی بھی معمولی شکل و صورت کی لڑکی ملکہ فرح کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ وہاں کے ہوٹل یہاں کے ہوٹلوں سے دس گنا زیادہ خوب صورت ہیں۔ وہاں بیروں کے بجائے بے حد حسین لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ اور وہاں ہر قسم کا انگریزی مال خصوصاً کپڑا مل سکتا ہے جس کا آج کل یہاں کال ہے۔ یہ وہ دُکھتی رَگ تھی جس پر دونوں پاکستانی خواتین نے آہِ سرد کھینچی اور ان میں سے ایک نے لوگوں کو بتایا کہ محض جاپانی کپڑا حاصل کرنے کس کس طرح انھیں چمن اور بوستان کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ جہاں ہر قدم پر چیکنگ کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ دوسری چھوئی موئی سی خاتون نے انکشاف کیا کہ جب وہ پشاور میں تھیں تو ہر ماہ لنڈی کوتل جاکر مزے سے ریشمی اور اونی کپڑا خرید لاتی تھی۔ چیکنگ سے بچنے کے لیے بہت سے تیر بہ ہدف نسخے ان کے ناخونوں میں پڑے تھے۔ ایک ساری پر دوسری ساری باندھ لینے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ ایک مرتبہ خوب صورت سجاوٹ کی ٹرے میں وہ مزے سے چپلی کباب کھاتی ہوئی نکل آئی تھیں۔ اپنی گھڑیاں نہ لے جانا اور وہاں سے گھڑیاں انگوٹھیاں پہن آنا تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اس وقت میں نے دیکھا وہی لڑکا نپے تلے قدم رکھتا، آکر اس گروپ

میں بیٹھ گیا اور اپنی شیریں آواز میں بابا کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا... جب خنکی اور رات بڑھی تو آہستہ آہستہ سب اپنے کمروں کی طرف کھسکنے لگے... جب عراقی اور ایرانی جوڑے اور چمن سے کپڑا لانے والی لمبی چوڑی خاتون اپنے میاں کے ساتھ چلی گئی تو چھوٹی موٹی خاتون نے جھک کر مجھ سے پوچھا۔

''کب آئیں تم؟''

''کل آئی تھی۔''

''کتنے دن رہو گی؟''

''چند مہینے۔''

''اچھا... یہ تو بڑا اچھا ہوا۔ خوب دل لگ جائے گا، تمھارا۔ یہ جو بیگم اٹھ کر گئی ہیں، میں تم کو بتاؤں اتنا بولتی ہیں، اتنا بولتی ہیں کہ کسی اور کو تو بولنے ہی نہیں دیتیں۔ میں نے ان کا نام بیگم گراموفون رکھ دیا ہے۔ کہیں ان کے سامنے نہ کہہ دینا پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جائیں گی۔ ذرا ذرا بات پر تلملا جاتی ہیں۔ مرچ ہیں بالکل۔ ہاں، لو اب چلو۔'' وہ میاں سے مخاطب ہوگئیں۔

سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ ان خاتون کا قد بہ مشکل چار فٹ چند انچ ہوگا۔ جہاں کہیں بندِ قبا باندھ لیے تھے۔ وہیں چربی ہائے واویلا کرتی باہر نکل پڑی تھی۔ تین دائروں میں اس کا سارا وجود بٹا ہوا تھا۔ (کسی ٹائر کے اشتہار میں اسی قسم کا آدمی بنا ہوتا ہے) چوڑے چپٹے منہ پر عینک ستم پہ ستم۔ اس پر آواز جیسے پھٹا بانس۔ خود ایسی روانی سے بولتی تھیں جیسے اگلے کئی سال تک رکنے کا نام نہیں لیں گی اور ان دوسری خاتون کا نام رکھا تھا۔ بیگم گراموفون۔ اللہ اکبر! مجھے پہلے ہی دن یہاں کے سب کیریکٹر دلچسپ لگنے لگے۔

OOO

Marfat.com

۲

دوسرے دن سے آہستہ آہستہ مجھے ہوٹل کے رہنے والوں کے متعلق معلومات ہونی شروع ہوگئیں۔ یہ بھید زیادہ تر بیگم گراموفون اور میڈم ڈبل روٹی (چھوٹی موٹی خاتون کا یہ غائبانہ نام بیگم گراموفون نے رکھا تھا) کے ذریعے کھلتے... کون کہاں سے آیا ہے اور کیوں۔ کتنے دن ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ سنگل کمرے میں جو انگریز خاتون ہیں، وہ عرصہ دس سال سے تنہا یہاں رہ رہی ہیں۔ مدت ہوئی ایک مشہور مسلم خاندان کے صاحب زادے بہ صد شوق انھیں بیاہ کر لائے تھے۔ بعد میں اَن بن ہوئی اور یہ صاحب زادی بھی اب تک دو شادیاں رَچا چکی تھیں۔ بڑی بی کی عمر پچاس سے تو ہر صورت زیادہ ہوگی۔ چہرے پر جھریوں کا وہ جال تھا کہ توبہ ہی بھلی مگر وہ صرف نزدیک ہی سے نظر آتا تھا۔ دور سے وہ ان کے رکھ رکھاؤ اور ٹھسے میں چھپ جاتا تھا۔ رات کو گلابی اور سیاہ آبِ رواں ایسے باریک گاؤن پہن کر پارٹیوں میں جاتی تھیں تو آنکھوں میں چکاچوند ہوتی تھی، ایک ان ہی کی طرح کے کھوسٹ ان کے کمرے کے پروانہ وار چکر لگاتے تھے۔ کبھی یہ ان کے کمرے کے آگے سے پھول توڑ رہی ہیں۔ کبھی وہ شبِ ہجر کی سی طول طویل کار لیے ان کے کمرے کے سامنے کھڑے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے میں مگن تھے یا دوسروں سے ڈرتے تھے کہ نہ کبھی لان پر آکر بیٹھتے اور نہ کسی سے بات چیت کرتے۔ چند ایک جوڑے یو این او کی طرف سے تپِ دق کے سروے کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ یہ ڈنمارک کے باشندے تھے۔ میاں لوگ ناشتے کے بعد المونیم کے چھوٹے ناشتے دانوں میں ہمارے ملک کے کارخانے داروں کی طرح اپنا دوپہر کا کھانا (جس میں پاکستانی کھانا مع

Marfat.com

چپاتی ضرور رکھواتے) لے کر اپنی سبز پری ایسی خوب صورت کار میں چلے جاتے تو بیویاں رانوں تک اپنی فراکیں اونچی کر کے لمبی لمبی لان پر لیٹ جاتیں۔ یہ گویا جلد ٹین کی جا رہی ہے۔ سارا سارا دن یوں ہی پڑی رہتیں یا جنگلی قسم کے کتوں کے آگے پیچھے بھاگتی اور لاڈ کرتی رہتیں۔ شام کو یہ لوگ پھنسی پھنسی نیلی پیلی جینس پہن کر ایک خاص ادا سے اٹھلاتی ہوئی چلتیں جس سے انگ انگ ہلتا۔ ایرانی بیگم باوجود یورپین لباس پہننے کے اِن کی طرف دیکھ کر "نو حیا"، "نو آبرو" کہہ کر برے برے منھ بناتیں۔ بیگم گراموفون اور میڈم ڈبل روٹی تو ان کی اِنھیں حرکتوں کی وجہ سے کبھی گھاس نہ ڈالتی تھیں۔ شام کو اپنے اپنے شوہروں کو لے کر ان لوگوں سے اتنی دور جا کر بیٹھتیں کہ ان کی نظر کا پردہ پوری طرح قائم رہے۔ ایک فرنچ صاحبہ مع اپنے چار موٹے موٹے خوب صورت بچوں اور ان کی نینی کے میرے بعد آئی تھیں۔ ان کے میاں چند ہفتوں کے لیے فرانس گئے ہوئے تھے۔ آتے ہی انھوں نے گریک اور امریکن انجینئروں سے دوستی گانٹھی۔ دوسرے دن ان کے بچے نینی کے ساتھ ان کی بڑی سی نیلی شیو میں پہلے سیر کے لیے جاتے پھر وہ ان کے ساتھ پکنک یا شوپنگ کے لیے نکل جاتیں۔ شام کو ان میں سے ہی کسی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتیں۔ سگریٹ پیتیں اور ساقی گیری کے فرائض انجام دیتیں۔ نینی چاروں بچوں کے ساتھ بڑی سی میز پر الگ الجھی رہتیں۔ ہمیں سردی لگتی اور یہ خاتون بڑے بڑے پھولوں کے چست کپڑے پہنے جن میں اسٹریپ لگے ہونے کے سبب شانے اور خاصا آگا پیچھا ننگا ہوتا، مزے سے پھرتیں۔ ان ہی کو دیکھ کر ایک مرتبہ بیگم گراموفون نے کہا تھا۔ "قسم لے لو بہن، اس کو دیکھ کر مجھے سردی لگتی ہے۔ دل چاہتا ہے اپنی شال اتار کر اس کے کندھوں پر ڈال دوں۔" اس پر میڈم ڈبل روٹی نے ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ "میں تم کو بتاؤں یہ دور سے دیکھنے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ میں نے جو ایک دن پاس سے دیکھا تو اس کی جلد اتنی داغ دار ہے، ایسی داغ دار ہے جیسے ہزاروں مکھیاں ایک ساتھ فراغت پا کر اڑ گئی ہوں، اللہ قسم۔"

"اے توبہ... کیا تشبیہ دی ہے۔ میرا تو جی متلا اٹھا۔" بیگم گراموفون نے نہ جانے کیوں شال کا کونا منھ پر رکھ لیا۔

ان لوگوں کے علاوہ چار ونگ کی ان کی دو منزلہ عمارتوں میں آدمی ہی آدمی بھرا

Marfat.com

پڑا تھا۔ پھر لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ کوئی ایک دن کے لیے کوئی دو دن کے لیے اور کوئی ایک آدھ ہفتے کے لیے۔ چند ہی دن میں میری طبیعت یہاں کے مکینوں اور ان پر کیے جانے والے تبصروں سے بھی اکتا گئی۔ اب میں روز صبح کو نیچے اتر کر بیٹھنے کے بجائے بالکنی میں کرسی ڈال کر پڑھنے کو ترجیح دیتی۔ کبھی کبھی اس کی دیوار سے اٹھ کر جھانک لیا کرتی کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ شام کو بابا اگر کسی کام سے نہ گئے ہوتے تو مجھے ضرور اپنے ساتھ نیچے چلنے کو کہتے۔ شامیں اتنی خوش گوار تھیں کہ کمروں میں بیٹھنا اچھا بھی نہ لگتا تھا۔ لان میں دور دور ٹکڑیوں میں لوگ بیٹھے ہوتے اور بچے اکٹھے ہو کر لمبے چوڑے لان میں بھاگتے کھیلتے پھرتے۔ بوبی بھی ان میں ضرور شامل ہوتا اور وہ لڑکا جسے بوبی نے اس دن ڈیڈی کہا تھا، کبھی کبھی کسی گروپ میں بیٹھا نظر آتا۔ وہ مجھ پر اچٹتی سی نگاہ بھی ڈالتا تو اس کی گہری سیاہ آنکھوں کی تاب نہ لا کر میں کانپ سی جاتی... ہم ایک گروپ میں بیٹھے ہوتے تو وہ مجھ سے باتیں کرنے کی کوشش بھی کرتا مگر میں بیگم گراموفون اور میڈم ڈبل روٹی کے خوف سے صرف ہوں ہاں کر کے رہ جاتی۔ پھر ایک دن بابا نے مجھ سے پوچھا۔

''تم کیا کرتی رہتی ہو سارا دن؟''

''کچھ نہیں، پڑھتی رہتی ہوں۔''

''تمھارا دل نہیں گھبرا جاتا پڑھتے پڑھتے؟''

''گھبرا جاتا ہے۔''

''تو تم آس پاس کے کمروں میں چلی جایا کرو نا۔''

''ان میں میری عمر کی کوئی لڑکی نہیں۔''

''پھر بھی عورتیں تو ہیں۔ وہ کیا کرتی رہتی ہیں سارا دن؟''

''رمی یا مایون کھیلتی ہیں، کپڑے، پکچرز یا میک اپ کی باتیں کرتی ہیں۔''

بابا ہنسے، یہ تو تم بھی کر سکتی ہو، کہ نہیں؟''

''نہیں...'' میں نے خاموشی سے کہا۔

''کیوں؟''

''مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

تو شاہینہ، روبینہ، تاجو کے گھر کیوں نہیں چلی جاتیں، وہ تو تمھاری عمر کی ہیں۔

Marfat.com

''مگر وہ بھی کپڑے، پکچرز اور میک اَپ ہی کی باتیں کرتی ہیں۔''

بابا زور سے ہنس پڑے۔ تو بھئی لڑکیاں اور عورتیں اسی قسم کی باتیں کرتی ہیں۔ تم کیا چاہتی ہو کہ میزائل اور disarmament کی باتیں کریں۔

''پتا نہیں...'' میں دھیرے سے بولی۔

''تم آخر کیا چاہتی ہو؟'' بابا سنجیدہ ہو گئے۔

''میں... میں کچھ کرنا چاہتی ہوں... آپ نے ذکر کیا تھا کہ نزدیک جو پبلک اسکول ہے، اس کے پرنسپل آپ کو جانتے ہیں۔ آپ کہیں تو میں وہاں چلی جایا کروں۔''

''کیوں؟... پھر الف بے سے پڑھائی شروع کرنے کا ارادہ ہے؟'' بابا ہنسنے لگے۔

''جی نہیں... پڑھانے... سارا دن یہاں دل نہیں لگتا۔''

بابا کچھ سوچنے لگے۔ پھر بولے، ''کیا کرنا ہے بیٹی۔ تم تھوڑے سے دن کے لیے یہاں ہو، کیوں دردِ سر مول لیتی ہو۔ یہ کام تم جیسی لڑکیوں کے نہیں ہوتے۔ یہ وہی کر سکتی ہیں جو شروع سے کام کرنے کی عادی ہوں... یا جنھیں روپے کی ضرورت ہو۔ تمھیں کس چیز کی کمی ہے بیٹی، تم عشرت وغیرہ کے ساتھ بازار چلی جایا کرو، رمی وغیرہ کھیلا کرو... اور کیا... اتنی بور ہو گئی ہو کہ استانی بننا چاہتی ہو۔''

''کیا پڑھانے کو آپ اتنا برا سمجھتے ہیں بابا؟'' میں روہانسی ہو گئی۔

''نہیں۔'' بابا کھنکارے۔ ''برا وُرا تو نہیں سمجھتا لیکن ہر کام، ہر ایک پر نہیں سجتا۔ تم کل سے پڑھانے جاؤ تو یہ ہوٹل والے کیا سوچیں گے کہ شاید ہم اس ہوٹل کے اخراجات کا بار نہیں اٹھا سکتے۔'' مجھے کچھ غصہ سا آ گیا... ''بابا! اگر وہ یہ سوچتے ہیں تو سوچنے دیجیے، کیا فرق پڑتا ہے...''

بابا پھر ہنس پڑے۔ ''میرا خیال ہے، اب تم واقعی مجھ بڈھے کے ساتھ رہ رہ کر تھک گئی ہو۔ چند دن کے لیے اپنی خالہ کے پاس کراچی چلی جاؤ۔''

''اچھا...'' میں نے کہہ دیا۔ حالاں کہ مجھے خالہ کے پاس جانے کا بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ ان کی لڑکیاں مجھے نری احمق سمجھتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک دن میں کئی مرتبہ یہ فقرہ دہراتی، ''اگر ہمارے ڈیڈی کے پاس اتنا روپیہ ہوتا جتنا جیبی کے بابا کے پاس ہے، تو ہم سچ مچ عیش کرتیں، پر یہ نہ جانے کون بوڑھی روح ہے۔''

Marfat.com

بابا نے میری ملازمت کے بارے میں پھر کچھ نہ کہا۔ جس سے میں سمجھ گئی کہ وہ اس کے حق میں نہیں ہے اب میرے لیے کیا تھا۔ صبح سے شام تک بالکنی میں بیٹھ کر کتابیں پڑھنا، نیچے عورتوں اور بچوں کا شور، خاموشی سے برداشت کرنا اور کبھی کبھی بیروں کو چوری چھپے کوئی چیز تیزی سے لیے اپنے کوارٹروں کی طرف جاتے دیکھنا۔ سب طرف سے مایوس ہوکر میں نے بوبی سے دوستی گانٹھی۔ اس کو دیکھ کر میری بوریت ایک دم ختم ہوجاتی تھی۔ وہ اتنا چونچال تھا کہ اسے دیکھ کر خود بھی چستی کا احساس ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ میرے بلانے پر میرے پاس آنے لگا، اس سے دوستی کرنے کے لیے میں اس کے لیے ٹافیاں چاکلیٹ، بہت سے کھلونے اور رنگ کرنے کی ایک کاپی اور رنگین پنسلوں کا ڈبا لے آئی۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر تصویروں میں اُول جلول سے رنگ بھرتا اور قہقہے لگاتا۔ معصوم، زندگی سے لبریز قہقہے... میں اسے یہ چیزیں لے جانے نہ دیتی، نہ جانے اس کا باپ کیا سوچے اور وہ یہ چیزیں پاکر پھر میرے پاس آئے یا نہ آئے۔ اس میں میری خودغرضی بھی شامل تھی۔ اپنے ڈیڈی کی وہ ہمیشہ تعریف کرتا۔ اپنے نئے کھلونے اور کپڑے وہ مجھے لاکر ضرور دکھاتا اور جب پوچھو، ''تمھاری ممی کہاں ہیں؟'' تو بڑی بے پروائی سے ''پتا نہیں'' کہہ کر کھیل میں مشغول ہوجاتا۔ شاید اتنے اچھے ڈیڈی کو پاکر اس نے کبھی ممی کی کمی یا ضرورت محسوس نہیں کی تھی... وہ ہمیشہ انگریزی ہی میں بات کرتا، میں اس سے اردو بولتی تو یہ دیکھ کر دکھ ہوتا کہ اسے اردو برائے نام آتی ہے۔ ایک دن میں بازار گئی تو اس کے لیے ایک قاعدہ لائی۔ ابھی ہمارے ہاں کے قاعدے ایسے نہیں ہوتے کہ جھٹ سے بچوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلیں۔ خراب کتابت و طباعت، بے ڈھنگی سی تصویروں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے میں نے اس کے لیے ٹافی کا ایک پیکٹ بھی خریدا اور روز دو ایک حرف اسے پڑھانے لگی۔ پھر ایک دن جب بوبی کے پیچھے تقریباً تمام ہوٹل کے بچے میرے کمرے میں چلے آئے تھے۔ میں نے ان سب کا امتحان لیا۔ وہ بچے جو فرسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ اسٹینڈرڈ میں پڑھ رہے تھے، بہ مشکل اردو پڑھ اور لکھ سکتے تھے۔ عارضی طور پر یہاں رہنے کے سبب ان میں سے کوئی بھی آج کل اسکول نہیں جا رہا تھا۔ مائیں ان کو پڑھنے کا حکم دے کر رمی کھیلنے کسی ایک کے کمرے میں اکٹھی ہوجاتی تھیں اور یہ سارے میں اُدھم مچاتے پھرتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ اردو پڑھنا چاہیں تو میں روز تھوڑی دیر پڑھا سکتی ہوں۔

Marfat.com

انھیں معلوم تھا کہ بوبی کو پڑھائی کے بدلے کھلونے اور رنگ کے ڈبے بھی ملتے ہیں، اس لیے وہ مجھ سے پڑھنے کو آمادہ ہوگئے، اب صبح کے وقت میرا کمرہ آٹھ دس بچوں کی موجودگی میں باقاعدہ کلاس سے کم نہ لگتا۔ مجھے ان کے اردو پڑھنے کے بدلے میں کچھ نہ کچھ دینا بھی پڑتا۔ ان کے والدین اس معاملے میں قطعی غیر جانب دار تھے۔ ان میں سے اکثر کو یہی معلوم تھا کہ سب بچے میرے کمرے میں اکٹھے ہوکر کھیلتے ہیں...

ایک شام جب میں سیڑھیاں اتر رہی تھی، وہی گہری سیاہ آنکھوں والا لڑکا اپنے کمرے سے نکلا، میرے برابر پہنچ کر اس نے سلام کیا اور بولا، ''میں کئی دن سے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔''

''کس بات کا؟'' میں نے بغیر رکے پوچھا۔

''آپ بوبی کے ساتھ اپنا وقت ضائع کرتی ہیں۔ اشرف مجھے بتا رہا تھا کہ آپ اسے کہانیاں سناتی ہیں اور اردو بھی پڑھاتی ہیں۔''

''آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''جی نہیں... مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ میں تو آپ کا شکر گزار ہوں۔ ورنہ اشرف نہ معلوم اسے کہاں کہاں لیے پھرتا۔''

''اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں۔ میں خود بور ہوتی تھی، تھوڑی دیر بچوں کے ساتھ دل بہل جاتا ہے۔''

ہم نیچے پہنچ گئے تھے۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ لان میں پہنچ کر بولا، ''اجازت ہو تو تھوڑی دیر آپ کے پاس بیٹھ جاؤں۔''

میں نے کسمسا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا، ''بیٹھ جایئے۔''

ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میرے ہاتھ تیزی سے سوئٹر بننے میں مصروف تھے اور میں شیشے کی دیوار کے پیچھے سرخ مچھلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ ان میں سے کچھ بے سدھ سطح آب پر پڑی دکھائی دیتی تھیں جیسے چنار کے سوکھے ہوئے پتے پڑے ہوں۔ میں سوچنے لگی یہ مچھلیاں شیشے کے پار زندگی کی چہل پہل کو دیکھ سکتی ہیں۔ انھیں بہترین خوراک اور ہر قسم کا آرام میسر ہے انھیں مگرمچھوں اور بڑی مچھلیوں کا خوف نہیں، پھر بھی وہ قید ہیں۔ وہ اس زندگی سے مطمئن تو نہیں ہوں گی۔ ان کی زندگی میں سمندر کی بے کراں وسعتیں جو نہیں

ہیں۔اگر یہ شیشے کی دیوار ٹوٹ جائے، پانی بہ جائے تو وہ اس سبزے پر سسک سسک کر دم توڑ دیں۔ یہ قید ہی ان کی زیست کا بہانہ ہے۔ شاید یہ فطری اور خود ساختہ پابندیاں ہی انسان کی زندگی کا بھی بہانہ ہیں اگر یہ نہ ہوں تو انسان ایک دوسرے کو نوچ کر کھا جائیں... دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ وہ لڑکا مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے... میرے ہاتھ کپکپا سے گئے...

''آپ کیا بنتی رہتی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہ کچھ بنتی رہتی ہوں۔ مجھے بننا اچھا لگتا ہے۔''

''آپ تھکتی نہیں؟ میں دیکھتا ہوں، آپ کچھ پڑھتی ہیں تب بھی آپ کے ہاتھ چلتے رہتے ہیں۔''

''بعض دفعہ تھک جاتی ہوں۔ چھوڑنا چاہتی ہوں مگر چھوڑ نہیں سکتی۔ ایک دفعہ سلائیاں اور اُون میرے ہاتھ میں آجائیں تو جیسے چپک کر رہ جاتی ہیں۔''

''آپ، تخلیقی قوت کی مالک معلوم ہوتی ہیں۔''

''میں اچھی پینٹنگ نہیں کر سکتی، لکھ نہیں سکتی، صرف کاڑھ اور بن سکتی ہوں اور جب کوئی چیز شروع کرتی ہوں تو مجھے اس کو ختم کرنے کا اتنا ہی شوق ہوتا ہے جتنا کسی مصور یا افسانہ نگار کو اپنی تخلیق ختم کرنے کا۔''

''میں آپ سے ایک بات پوچھوں۔'' اس نے قدرے جھجک کر کہا۔ ''کیا آپ کسی دوسرے کی شروع کی ہوئی چیز کو بھی اسی تن دہی سے تکمیل کو پہنچا سکتی ہیں۔''

مجھے یہ سوال بہت عجیب سا لگا... یہ سوال اس کے ذہن میں کیوں آیا؟

''کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔'' میں نے کہا، ''کہ کسی دوسرے کی چیز کو میں نے ہاتھ میں لیا ہو... شاید، اگر وہ میری پسند کے مطابق ہو تو میں اسے اسی تن دہی سے مکمل کر دوں۔''

وہ دھیرے سے مسکرایا جیسے میرے اس جواب سے اسے کوئی خاص خوشی ہوئی ہو۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر وہ بولا، ''بوبی آپ کو پسند ہے؟''

''مجھے بچے اچھے لگتے ہیں۔ خاص طور سے شریر، تن درست اور خوب صورت بچے۔ اور بوبی میں یہ تینوں باتیں ہیں۔''

Marfat.com

میں نے دیکھا کہ اس بات نے اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا کردی اور پھر نہ جانے کیسے وہ سوال میری زبان پر آگیا جسے پوچھنے کا شعوری طور پر میرا کوئی ارادہ نہیں تھا، ''بوبی کی امی کہاں ہیں؟''

اس سوال نے پہلے اس کی آنکھوں کی جلتی لو کو دھندلایا۔ پھر مسکراتے ہونٹوں کو سکیڑ دیا۔ وہ سرگوشی میں بولا، ''بوبی ایک بھٹکی ہوئی روح ہے۔ اس کے ماں باپ ایک دوسرے سے بچھڑ کر کھو گئے ہیں...'' اور پھر وہ یوں کھو گیا جیسے اسے میری موجودگی کا احساس ہی نہ ہو... مجھے خیال آیا شاید اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہے یہ شخص، اور وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ میرے اس سوال نے نہ جانے کتنے زخموں کے پھائے بے دردی سے چھڑا دیے ہیں، اس کی آنکھیں تک زخمی نظر آ رہی تھیں۔ ''اس کے ماں باپ ایک دوسرے سے بچھڑ کے کھو گئے ہیں...'' اس ایک جملے میں کتنا درد تھا... لیکن یہ درد، یہ تڑپ ہمیشہ اس کی آنکھوں میں نظر نہیں آتی تھی۔ وہ عموماً ہشاش بشاش دکھائی دیتا تھا۔ صرف اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں کہیں ہلکا سا ایک سایہ تیرتا تھا جس نے اس کی آنکھوں کو اور گہرا کر دیا تھا مگر وہ سایہ ہر ایک کو نظر نہ آسکتا تھا۔

بابا اچانک آئے تو مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ میرا اس لڑکے کے ساتھ یوں تنہا بیٹھنا پسند نہ کریں۔ میں کچھ گھبرا سی گئی... لڑکے نے کھڑے ہوکر بابا سے ہاتھ ملایا اور انھوں نے کہا، ''ہیلو اسد اچھے تو ہو۔''

تب مجھے پتا چلا کہ اس کا نام اسد ہے۔ پھر بابا اور وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے جن میں میں نے حصہ نہیں لیا۔ میں جانے کیا سوچ رہی تھی۔ شاید اس لڑکے کی چمکیلی آنکھوں میں تیرتے سائے کے متعلق۔ اچانک بابا مجھ سے مخاطب ہوئے، ''کیوں سنو گی پرانے گانے؟''

''جی کون سے گانے؟'' میں ایک دم چونک کر بولی۔

''سو رہی ہو؟' ارے ابھی اسد میاں نے پیش کش کی ہے کہ کانن اور سہگل کے ریکارڈ سنوائیں گے۔ میرا خیال ہے، آج کھانے کے بعد تھوڑی سی موج کی جائے۔''

Marfat.com

''جی، ضرور...'' میں نے کہا۔

کھانے کے بعد جب ہم گانا سننے اس کے کمرے میں جا رہے تھے، اچانک مجھے اس کی گہری کالی آنکھوں سے ڈر لگنے لگا۔ میں نے بابا سے کہا، ''مجھے دور سے گانے کی آواز بہت اچھی لگتی ہے۔ میں یہیں لان میں بیٹھ کر سنوں گی۔''

''خیال تو اچھا ہے۔'' بابا بولے، ''دور سے آوازوں میں جادو بھرا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ اسد میاں تم بھی ریکارڈ پلیئر آن کر کے یہاں آ بیٹھو۔''

''شاید دوسرے لوگوں کو اعتراض ہو۔'' اسد نے کہا۔

''ارے نہیں، سہگل اور کانن کے گانے سننے پر کس کافر کو اعتراض ہوگا۔ ایسا ہی ہے تو چلو کمروں کے آگے والے لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

ہم کمروں کے آگے چھوٹے سے پلاٹ میں بیٹھ گئے۔ اسد ریکارڈ پلیئر آن کر کے کھڑکیوں کے پٹ کھول کے، ہمارے پاس آ بیٹھا۔ جوں ہی کانن کی تیز گھنگروؤں میں لپٹی آواز ''من موہن تم سکھین سنگ ہنس ہنس کھیلو پھاگ'' ابھری، ایسا معلوم ہوا جیسے بابا پر کسی نے سحر کر دیا ہو۔ وہ آنکھیں بند کرے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر مدہوش سے ہو گئے۔ ان کے چہرے پر چاندنی میں ایسا سکون، ایسا نور تھا جیسے ان کی روح مسرت کے کسی انتہائی بلند نقطے کو چھو رہی ہو۔ اب میں تھی اور وہ سیاہ گہری آنکھیں جو میری طرف نہ دیکھتے ہوئے بھی مجھے اپنی طرف دیکھتی ہوئی نظر آتی تھیں... چاندنی رات میں کانن کی آواز کا جادو ان سیاہ آنکھوں کے ساتھ میرے دل میں جا کر جانے کیا بھید کہہ رہا تھا۔ بابا کے چہرے پر سکون تھا اور میری روح میں ایک خاموش تلاطم، جیسے کچھ ہونے والا ہو، کوئی بہت ہی عجیب ان ہونی سی بات۔ کانن کے بعد سہگل اور سہگل کے بعد کانن دونوں اپنی آواز میں زندہ تھے، امر تھے۔ ہم تینوں خاموش تھے۔ بابا کبھی کبھی سر ہلا کر والہانہ منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا دیتے جیسے بے اختیار داد دے رہے ہوں۔ اسد کبھی بابا کی طرف کبھی میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ میں کبھی چاند کی طرف، کبھی چاندنی میں سوئے ہوئے پھولوں کی طرف اور کبھی اس تنہا تارے کی طرف دیکھ رہی تھی جو مردار کی خوف ناک چوٹیوں پر طمانیت سے

Marfat.com

مسکرا رہا تھا۔

حد سے زیادہ خاموشی، سکون اور مسرت نے جانے کیا ہیجان برپا کیا کہ دو آنسو میری آنکھوں سے نکل کر گالوں پر بہنے لگے، جنھیں میں نے چپکے سے صاف کرلیا۔

ریکارڈ ختم ہوئے تو ہم چونکے۔ بابا کی واہ واہ بے اختیار تھی جیسے خواب سے چونک کر ایک دم پکار اٹھے ہوں۔ ہم سب ساتھ اوپر چڑھے اسد رخصت ہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور ہم اپنے کمروں میں آ گئے۔ بابا کے سونے کے بعد بہت دیر تک میں بالکنی میں کھڑی چاندنی میں سہگل اور کانن کے گانوں کی بازگشت سنتی رہی۔

OOO

Marfat.com

۳

آج کئی دن بعد میں بیگم گراموفون اور میڈم ڈبل روٹی کے ساتھ باہر آ کر بیٹھی تھی۔ دونوں اپنے اپنے گھروں کی امارت کے قصے سنا رہی تھیں۔ کچھ یوں کہ ابھی ایک کا جملہ ختم نہ ہوتا کہ دوسری اپنی داستان شروع کر دیتیں اور ابھی وہ آدھی بات بھی نہ کہہ پاتیں کہ پھر پہلی اپنی ٹوٹی بات کا سرا جوڑ لیتیں۔ خاموشی سے سنتے ہوئے یہ منظر مجھے بہت عجیب لگ رہا تھا جیسے کسی اسٹیج کا سین ہو۔ بیگم گراموفون بولیں۔

''بہن نہ پوچھو کیا کیا اس پار چھوڑ آئے۔ ہم ساتوں بہنوں کا جہیز تیار تھا۔ سات ریڈیو، سات مشینیں، سات مسہریاں یہاں تک کہ دو دو کے حساب سے پندرہ کیمرے...''

میڈم ڈبل روٹی برداشت نہ کر سکی۔ فوراً بات کاٹ دی، ''میں تم کو بتاؤں ہماری تو تین کوٹھیوں پر پڑوس کے سکھوں نے قبضہ جما لیا۔ میری امی کے ایسے ایسے زیور کہ دیکھ کر آنکھیں پھٹیں، ان چڑیلوں نے پہن ڈالے۔ بعد میں ایک دفعہ میرا بھائی گیا کہ سب کچھ تمھارا ہے، بس ہمارے خاندانی البم ہمیں دے دو تو وہ بھی انھوں نے نہ دیے۔''

بیگ گراموفون نے بے چینی سے پہلو بدلا اور ہاتھ سے گویا انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کر کے بولیں، ''اور ہاں، ہمارے ابا کے پاس ایک اتنا خوب صورت...''

جب وہ دونوں ساتھ ساتھ بولنے لگیں تو اکتا کر میں لان میں کھیلنے والے بچوں کو دیکھنے لگی۔ ان کی بھولی باتیں اور چھوٹے چھوٹے کھیل جو زندگی اور تخیل کا دلچسپ امتزاج تھے، مجھے بہت بھلے لگتے تھے۔ یوں تو بیگم گراموفون اور میڈم ڈبل روٹی کی باتیں

بھی حقیقت وتخیل کا عجیب وغریب امتزاج تھیں لیکن نہ جانے کیوں میں ان سے کسی بہتر کام کی متوقع تھی۔ بچوں میں ایک چور تھا باقی فوج (یہ زیادہ تر فوجیوں کے بچے تھے) جنرل صاحب چور کو پکڑنے جا رہے تھے۔ ان کے حوالی موالی جو بریگیڈیئر، کرنل اور میجر تھے، سب چور کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ آخر جنرل صاحب نے چور کو پکڑ لیا اور اسے اوٹ پٹانگ سی کوئی سزا دے دی۔ ذرا سی دیر میں میں نے دیکھا کہ ساری فوج مع چور کے ہرے بھرے لان پر قلابازیاں کھا رہی ہیں۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ ان سب بچوں میں بوبی نہیں ہے۔ میں نے اٹھ کر ایک بچے سے پوچھا۔

"بوبی کہاں ہے بیو؟"

"بوبی بیمار ہے۔" تین چار بچوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ بچوں کی اطلاعات اکثر صحیح ہوتی ہیں۔ بوبی کا نوکر بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں لان پر سے اٹھ کر آئی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے بوبی کے رونے کی آواز سنی۔ اوپر پہنچ کر میں نے آہستہ سے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ملازم لڑکے نے دروازہ کھولا۔ بوبی واقعی بیمار تھا اور اسد ڈاکٹر کو پہنچانے گیا تھا۔ جھجکتی ہوئی میں اندر چلی گئی۔ آج پہلی مرتبہ اسد کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ یہ کمرے ہوٹل کے دوسرے کمروں سے بہت مختلف نظر آ رہے تھے، جیسے اسد سال ہا سال سے یہاں رہ رہا ہو۔ فرش پر عمدہ دبیز قالین تھا، بہترین قسم کے پردے تھے، ریڈیو اور ریکارڈ پلیئر تھا، آتش دان پر عمدہ مجسمے، دیواروں پر بہترین آرٹسٹوں کی تصاویر تھیں۔ نئی وضع کے گل دانوں میں تازہ پھول لگے ہوئے تھے۔ دوسرا کمرہ بھی جو اسد کے سونے کا کمرہ تھا، ہوٹل کے بجائے کسی نہایت پرتکلف قسم کے مکان کا کمرہ نظر آ رہا تھا۔ تیسرے چھوٹے کمرے میں جو غالباً بوبی کا بیڈ روم تھا، بوبی لیٹا رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور گال لال بھبوکا ہو رہے تھے۔ ملازم دوا پینے کے لیے جتنی خوشامد کرتا، بوبی پاؤں چلا چلا کر اتنے ہی زور سے روئے جاتا۔ میں نے اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے سنہری بال ہٹا کر پیار کیا اور معلوم ہوا جیسے میں نے کسی انگارے پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اسے بہت تیز بخار تھا۔ کرسی گھسیٹ کر میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ میں نے اشارے سے ملازم کو دوا ہٹا دینے کو کہا اور بوبی سے باتیں کرنے لگی اور وہ غنودگی کے عالم میں اونگھنے لگا۔ پھر دوا ہاتھ میں لے کر باتیں کرتے ہوئے سہارا دے کر میں نے اس کے

Marfat.com

ہونٹوں سے لگا دی اور وہ بے خیالی میں پی گیا۔ پھر پانی پی کر وہ خاموشی سے لیٹ گیا۔ میں نے اس کی گردن تک سرخ پلش کا لحاف اچھی طرح اوڑھا دیا۔ اس کے بکھرے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارا اور پلٹی تو دیکھا اسد کچھ فاصلے پر کھڑا بڑی غور سے میری حرکتوں کو دیکھ رہا ہے۔ میں گھبرائی، پھر خود پر قابو پا کر بولی، ''کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟''

''نہیں... ڈاکٹر نے ٹھنڈ سے احتیاط کرنے کو کہا ہے۔ کھانے کی، ناک میں ڈالنے کی، بھاپ لینے کی اور سینے پر مالش کرنے کی دوا دی، ہے اور ہر گھنٹے بعد نمک کے غرارے کرنے کو کہا ہے اور بوبی میاں اتنے ضدی ہیں کہ ایک دوا کے لیے دو گھنٹے خوشامد اور دس وعدے کرنے پڑتے ہیں۔''

''مگر ابھی تو بہت خاموشی سے دوا پی لی۔'' میں نے کہا۔

''یہی تو میں دیکھ رہا تھا... مشکل یہ ہے کہ مجھے چھٹی نہیں مل سکتی۔ بوبی اشرف کے بس کا نہیں ہے، ذرا آنکھ بچے گی تو ہوا میں نکل جائے گا، سوچ رہا ہوں کوئی نرس رکھ لوں۔''

''کیا ضرورت ہے، جب تک آپ نہیں ہوں گے، میں دیکھ لیا کروں گی۔'' میں نے کہا۔

''واقعی؟'' اسد نے چمکتی آنکھوں سے متعجب ہو کر پوچھا۔

''مجھے بھی اور کام ہی کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ کے بابا برا مانیں گے۔''

''کمال ہے۔ کسی بچے کی تیمارداری کرنے میں برا ماننے کی کون سی بات ہے۔''

''میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔ کام تو اشرف سب کر لے گا، آپ اگر اتنا ہی دیکھ لیں کہ بوبی نے وقت پر دوا پی لی اور...''

''میں سب دیکھ لوں گی، آپ بے فکر رہیں۔''

''آپ... آپ واقعی بہت اچھی ہیں۔''

بوبی سو گیا تھا۔ ہم دونوں ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ اسد بولا، ''بوبی ذرا سا بیمار ہو جائے تو مجھے جانے کیا ہونے لگتا ہے۔ دل کہتا ہے، اسے اگر کچھ ہو گیا تو...''

''بچے بیمار ہوتے ہی رہتے ہیں۔'' میں نے کہا، ''اس ہوٹل میں دیکھ لیجیے کوئی نہ

Marfat.com

کوئی بچہ بیمار رہتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے... میں زیادہ جذباتی نہیں ہوں لیکن بوبی میری کمزوری بن گیا ہے۔ میں اس کا اتنا عادی ہوگیا ہوں کہ اس سے علاحدگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اس سلسلے میں میرے اوپر ایک بہت بڑا حادثہ گزر چکا ہے۔ اب بھی خیال آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں..."

اس سے پہلے کہ زیادہ دیر ہونے کا بہانہ کرکے میں جاسکوں، اس نے یہ قصہ سنانا شروع کردیا اور میں بندھ کر رہ گئی...

"یہاں سیون اسٹریمز (seven streams) کے نزدیک میرے ایک دوست رہتے ہیں۔ ایک رات ٹہلتے ٹہلتے وہ اور ان کی بیگم یہاں آگئیں۔ ان کے بچے بوبی کو بہت پیار کرتے ہیں، اس لیے بیگم نے دوسرے دن بوبی کو ان کے ہاں بھیج دینے کی فرمائش کی۔ میں راضی ہوگیا۔ صبح کام پر جاتے وقت میں نے اشرف سے کہا کہ دس بجے کے قریب بوبی کو ان کے گھر لے جائے اور دو ایک گھنٹے کے بعد واپس لے آئے۔ اتفاق سے میں اس دن جلد کام سے فارغ ہوگیا اور سوچا کیوں نہ بوبی کو اپنے ساتھ ہی لے چلوں۔ جس وقت میں اپنے دوست کے گھر پہنچا، اشرف باورچی خانے میں میلے برتن دھو رہا تھا اور بوبی غائب تھا۔ جب وہ آس پاس کے گھروں میں نہیں ملا تو میں ڈر گیا۔ یہاں اکثر بچے غائب ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کہ ان ہی دوست کا چار سالہ بچہ زرد، ڈرتا کانپتا آیا اور اپنی ماں سے بولا کہ اس نے ایک چھوٹے سے بچے کو نالے میں گرتے دیکھا تھا۔ ان کے گھر کے نزدیک ایک بڑا سا نالہ ہے۔ یہ سیون اسٹریمز سے نکل کر بنگلوں کے باغوں میں پانی پہنچاتا ہے۔ بچے کی بات سن کر ہم سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس کی ماں نے پوچھا، "بیٹے کیا وہ بچہ بوبی تھا؟" لڑکا جو خوف سے بے ہوش ہونے کے قریب تھا، آہستہ سے بولا، "معلوم نہیں۔" میں یہ سن کر بے تحاشہ بھاگا... اتنی ہی دیر میں بات پھیل گئی اور نالے کے ساتھ ساتھ مجھے بے تحاشا بھاگتے دیکھ کر اور لوگ بھی آپہنچے، میں اپنی اس وقت کی حالت بیان نہیں کرسکتا۔ اگر مجھے بوبی کو بچا لینے کی امید نہ ہوتی تو کبھی کا گر کر بے ہوش ہوچکا ہوتا۔ نالے کی روانی دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس وقت تک کافی آگے نکل چکا ہوگا۔ نالے کے ساتھ ساتھ بھاگتے

Marfat.com

ہوئے مجھے یہ ہوش نہیں تھا کہ میں اس وقت پاگلوں سے بدتر نظر آرہا ہوں۔ نہ مجھے یہ اندازہ تھا کہ میں کتنی دور نکل آیا ہوں۔ جہاں نالہ مڑتا، میں بھی اس کے ساتھ مڑ جاتا۔ ایک بنگلے میں پانی کے داخلے کی جگہ جالی لگی ہوئی تھی، اس جگہ میں نے دور ہی سے ایک ننھا سا ہاتھ اوپر نکلا ہوا دیکھا اور بال جو بہت سے تنکوں اور کوڑے کے ساتھ الجھے ہوئے پانی پر تیر رہے تھے۔ اس وقت اور بہت سے لوگ وہاں پہنچ گئے تھے۔ یکایک میری ساری قوت میرا ساتھ چھوڑ گئی... اس اٹھے ہوئے ہاتھ اور الجھے ہوئے بالوں نے مجھے یقین دلایا کہ یہ زندہ بچے کا ہاتھ اور بال نہیں ہیں۔ یک لخت میرے پیٹ میں شدت سے کچھ محسوس ہوا جیسے وہ ایک دم کھوکھلا ہوگیا ہو۔ میرا جی متلایا اور چیزیں نظروں کے سامنے دھندلانے لگیں۔ شاید میں بے ہوش ہوکر زمین پر گرنے والا تھا کہ کسی نے مجھے سہارا دیا۔ اتنی دیر میں کسی اور شخص نے بچے کو باہر نکال کر گھاس پر لٹا دیا تھا۔ اُدھر نہ دیکھنے کی کوشش کے باوجود میری نظریں وہاں چلی گئیں اور میں یوں چونک اٹھا جیسے میں نے دنیا کا کوئی بہت بڑا عجوبہ دیکھ لیا ہو... وہ بوبی نہیں کوئی اور بچہ تھا۔ اس وقت اطمینان اور شکر کا جو سانس میں نے لیا، اس سے میں آج تک شرمندہ ہوں۔ ایک معصوم بچے کی موت پر سکھ کا یہ سانس شاید سنگ دلی کی بدترین مثال ہو لیکن یہ احساس کہ مرنے والا بچہ بوبی نہیں ہے، اتنا قوی تھا کہ ایک لمحے کو میں یہ بھول گیا کہ اس بچے کی جان بھی اتنی ہی قیمتی تھی جتنی میرے بوبی کی اور لوگوں نے بھی فوراً اندازہ لگا لیا کہ وہ میرا بچہ نہیں ہے۔ وہ ملیشیا کی قمیص اور ملیشیا ہی کی چھوٹے پائینچوں کی شلوار پہنے ہوئے تھا، اس کا گریبان کھلا ہوا تھا اور کپڑے کئی جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ اس وقت مجھے کچھ اس قسم کی شرمندگی ہوئی جیسے اچانک کسی چیز کو اپنی کہہ کر کسی پر چوری کا الزام لگا دیں اور بعد میں ثابت ہو وہ آپ کی چیز نہیں تھی... اس ایک لمحے کے اطمینان کے بعد مجھے دوسرے لوگوں کی طرح اس بچے کی موت کا افسوس ہوا۔ کچھ لوگوں نے اسے اسپتال لے جانے کی رائے دی۔ بعض مایوسی سے سر ہلا رہے تھے کہ اب بہت دیر ہوچکی ہے۔ اس عرصے میں ایک شخص نے بچے کے پیٹ سے پانی بھی نکال دیا تھا۔ ہم اسے پیدل اٹھا کر کار تک لائے، پھر میں اپنی کار میں ڈال کر اسے اسپتال لے گیا لیکن واقعی اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ بچے کو مرے ہوئے دیر ہوچکی تھی۔ اسپتال میں روتے ہوئے اس کے ماں باپ داخل ہوئے اور مرے ہوئے بچے کو دیکھ کر

Marfat.com

دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ میں اس وقت خاموش ایک طرف کھڑا تھا۔ شاید میں ان کے درد کو مکمل طور پر محسوس کرسکتا تھا کیوں کہ چند لمحے پیش تر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ بوبی مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس وقت یکایک دنیا میری نظروں میں اندھیر ہوگئی تھی اور بعد میں بھی میرا دل کانپتے ہوئے بار بار کہہ رہا تھا۔ اگر یہ بوبی ہوتا تو... تب بے اختیار میرا دل چاہا کہ خدا کے سامنے اپنا سر جھکاؤں اور اس کا شکر ادا کروں۔ میں جو اپنی مصروف زندگی میں خدا کو قریب قریب بھول چکا تھا۔ ایک مدت سے جیسے مجھے خدا کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے صدقِ دل سے خدا کا شکر ادا کیا لیکن فوراً ہی مجھے احساس ہوا جیسے میں نے بڑی کمینی سی حرکت کی ہو۔ میں نے خدا کا شکر اس لیے ادا کیا کہ اس نے بوبی کو بچا کر دوسرے بچے کو مار ڈالا، اور اس وقت مجھے یاد آیا کہ بوبی مجھے اب تک نہیں ملا ہے۔ کہیں اس معصوم بچے کی موت پر خوش ہونے کے جرم میں بوبی کو کچھ نہ ہو جائے۔ میں ڈاکٹر اور بچے کے ماں باپ سے ایک لفظ کہے بغیر باہر سرک آیا اور کار میں بیٹھ کر بے تحاشا پھر اپنے دوست کے گھر کی طرف چلا۔ بہت سے لوگ باغ کے پھاٹک پر کھڑے اس نامعلوم بچے کی موت پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ وہیں اشرف کے پاس بوبی اپنا منا سا منھ کھولے حیرت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ میں کار سے اترا، بے تحاشا اس کی طرف لپکا اور اسے اپنے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا... یہ ایسا منظر تھا جسے بہت کم لوگ سمجھ پائے۔ اس کے بعد جب بھی کبھی میں نے غور کیا، میں خود پوری طرح اس بات کو نہ سمجھ سکا لیکن مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ جس وقت میں بوبی کو گود میں لے رہا تھا، ایک منا سا ہاتھ بہتے ہوئے پانی سے نکلا ہوا اور چند الجھے ہوئے بال میری نظروں کے سامنے تھے۔ اس کے بعد بھی یہ منظر اکثر بیٹھے بیٹھے میری نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے اور میں اب بھی یہ سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں کہ خدانخواستہ اگر وہ بوبی ہوتا تو کیا ہوتا...''

یہ قصہ سنا کر وہ خاموش ہوگیا... اس کی آنکھوں میں تیرتا سایہ گہرا ہوگیا تھا۔ جیسے پانی میں سے ابھرا ہوا وہ ہاتھ اب بھی اس کے سامنے ہو۔

''واقعی بہت خوف ناک تجربہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''جی ہاں... اب بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا کوئی حادثہ سچ مچ پیش نہ آجائے۔

Marfat.com

بوبی بہت شریر ہے اور اشرف لڑکا ہی تو ہے۔'' وہ کھویا کھویا سگریٹ پیتا رہا۔ پھر بولا، ''لوگ کہتے ہیں کوئی ایسی ہستی ضرور ہونی چاہیے جو ہر وقت بوبی کا خیال رکھ سکے۔'' وہ خاموش ہوگیا۔ یہ خاموشی جیسے مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی مگر میں یہ سوچنے میں مصروف تھی کہ بوبی کی ممی کہاں ہیں؟ وہ بوبی کے باپ سے بچھڑ کر آخر کہاں کھو گئی ہے!!! سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ ہوئی تو میں چونک پڑی۔ پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں تنہا اسد کے کمرے میں بیٹھی ہوں۔

''اچھا میں چلتی ہوں۔'' میں جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسد میری گھبراہٹ کو پا گیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اس کے کمرے کا دروازہ بند کردیا اور اپنے کمرے میں آگئی اور جیسے اسد کی وہ کھوئی کھوئی نگاہیں میرے ساتھ ہی چلی آئیں...

○○○

Marfat.com

۴

جس دن بوبی نے غسلِ صحت کیا، اسی دن اسد بارہ میل دور ایک جھیل پر ہونے والے ''جشنِ ماہ تاب'' کے ٹکٹ خرید کر لایا۔ وہ شاید اِس دیکھ بھال کا بدلہ اتارنا چاہتا تھا جو بوبی کی بیماری کے دوران میں نے کی تھی۔ یہ ''جشنِ ماہ تاب'' دراصل ایک مشاعرہ تھا جس میں مقامی اور مہمان شعرا شرکت کر رہے تھے۔

''آپ کو مشاعروں سے شوق ہے؟'' اسد نے بابا سے پوچھا۔

''مجھے تو نہیں البتہ اس پگلی کو ہے۔'' بابا نے کہا۔

وہ تو میں کمروں میں جا بہ جا بکھرے ہوئے ''دیوانوں'' کو دیکھ کر پہچان گیا تھا۔ اس نے میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور بولا، ''آپ خود بھی شعر کہتی ہوں گی؟...''

''جی نہیں...'' میں نے مختصراً کہا۔

''کہنے تو چاہییں۔'' بابا بولے، ''بالکل شاعروں ایسی حساس طبیعت پائی ہے، پھر اردو سے آپ کو اتنا عشق ہے کہ شاید ہی کسی کو ہوگا۔''

''تبھی آپ زمانے بھر کے بچوں کو اکٹھا کر کے اردو پڑھاتی ہیں۔'' اس نے مذاق کیا۔

''اور بھئی وہ تمھاری اردو یونی ورسٹی کا کیا ہوا؟'' بابا مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''کچھ بھی نہیں...'' بابا نے اردو کی بیماری کا سوچ کر میں افسردہ ہوگئی۔ بابا شاید میرے موڈ کو ٹھیک کرنے کے لیے ہنس کر بولے، ''تم سوچ رہی ہو کہ اردو یونی ورسٹی کو دیا گیا تمھارا عطیہ بے کار گیا۔''

Marfat.com

''بابا، آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔'' میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''دیکھا اس پگلی کو، بس بسورنے لگی۔'' بابا نے اس سے کہا، ''کسی کا دکھ ہو، آپ سینے سے لگائے رکھتی ہیں۔'' اور پھر بڑی سنجیدگی سے بولے۔

''بیٹی، دل سے دی گئی قربانیاں اور عطیے رائیگاں نہیں جاتے، انتظار فرض ہے۔''

بابا کی اس بات نے مجھے حوصلہ دیا۔ بابا جو ہر معاملے میں اتنی بے اعتنائی سے رہتے ہیں، کبھی کبھی بڑی پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ آخر بابا جو ہیں۔

دوسرے دن شام سے ہی بابا کے سر میں درد تھا، اس لیے مجھے خیال ہوا کہ جشنِ ماہ تاب کا پروگرام پورا نہ ہوسکے گا مگر بابا کو احساس تھا کہ میں منھ سے نہ کہوں پھر بھی مجھے وہاں نہ جاسکنے کا افسوس رہے گا۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو فون کیا کہ مجھے لے جائیں اور اسد سے بھی کہہ دیا کہ وہ ہم لوگوں کے ساتھ ہی چلا جائے۔ چچا احمد بہت پیاری شخصیت کے مالک ہیں۔ انھیں خود شعر و شاعری سے دلچسپی ہے۔ وہ راستے بھر ہم دونوں کو ہنساتے اور شعر سناتے گئے۔ کبھی وہ اسد سے شعر سنانے کی فرمائش کرتے جسے وہ ٹال جاتا۔ پھر انھوں نے مختلف شعرا کے کلام پر تبصرے شروع کیے۔ اسد کی ہوں ہاں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس معاملے میں قطعی کورا ہے۔ تو وہ صرف میرے لیے ''جشنِ ماہ تاب'' میں شریک ہوا ہے اور اب رات بھر میری خاطر بور ہوگا۔ میں نے سوچا۔

معلوم ہوا کہ حالیہ تعینات ایگزیکٹو آفیسر صاحب نے اس جھیل پر بہت محنت کی تھی۔ پہاڑوں کو کاٹ چھانٹ کر پھول پودے لگوائے تھے اور اس کارگزاری کی داد لینے انھوں نے افسروں ماتحتوں اور ''قوم'' کو بلایا تھا۔ مشاعرہ صرف بہانہ تھا اور جن بڑے شاعروں کی آس لگائے میں آئی تھی، ان میں سے ایک بھی موجود نہ تھا۔ البتہ جھیل کو خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ چاندنی رات میں یہ سجاوٹ اور لطف دے رہی تھی۔ کھمبوں پر پتے باندھ کر ان میں لگائے گئے، گیس دور سے اچھا سماں پیش کر رہے تھے، دور جھیل میں ایک پہاڑی جزیرہ بھی اسی طرح سجایا گیا تھا اور روشنی کے کھمبوں کی قطاروں کا عکس پانی میں بڑا دل کش نظر آ رہا تھا۔ سڑک سے نزدیک ہی ایک کھلی بارہ دری میں شاعروں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ نیچے پانی کے بڑے سے حوض کے دائیں بائیں کرسیاں تھیں۔ درمیان میں صوفے جن پر خواص بیٹھے تھے۔ پیچھے چڑھائی پر دریاں بچھائے، یا زمین پر

Marfat.com

عوام اور 'مفتی' میں سپاہی لوگ بیٹھے تھے۔ طلبہ کا طبقہ خواص میں بھی تھا، عوام میں بھی اور شاعروں میں بھی۔ مشاعرہ شروع ہوتے ہی ہوٹ ہونا شروع ہوگیا۔ مقامی شعرا کی زبان سمجھ میں نہ آئی تو طلبہ بیداد پر اتر آئے۔ پھر فضا ہی ایسی ہوگئی کہ جو شاعر آتا ہوٹ ہوجاتا۔ ایک شاعر ردیف پر آکر کچھ اس طرح زور دیتے جیسے طبلے پر تھاپ پڑ رہی ہو۔ بس پھر کیا تھا، پوری ''قوم'' ان کے ساتھ ردیفوں کو زور دے کر دہراتی اور یوں معلوم ہوتا جیسے آس پاس کے پہاڑ، ندی، نالے، درخت سب ان کی ہم نوائی کر رہے ہوں۔ ایک شاعر صاحب نے گیت پیش کرنے کا مژدہ سنایا اور بڑے اسٹائل سے ''کلاسیکی فلمی'' موسیقی کے انداز میں گانا شروع کردیا۔ اب اِدھر اُدھر سے آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ سی ایچ آتما، سی ایچ آتما، کوئی پکارا۔ مشاعرہ سننے آئے ہیں فلمی گانا نہیں۔ لیکن ان شاعر کے کان پر جوں نہ رینگی، یہاں تک کہ لڑکوں نے ان ہی کی کھرج میں ان کے ساتھ گانا شروع کردیا۔ خیر، وہ بہ اطمینان گیت ختم کرکے بیٹھ گئے۔ ایک اور صاحب سیاہ شیروانی میں اٹھے تو ان کے ساتھ ہاو ہو کا طوفان بھی اٹھا۔ ان میں خود اطمینانی اور خود اعتمادی کی کمی تھی۔ جس طرف شور زیادہ ہوتا، اسی طرف ہاتھ پھیلا پھیلا کر زور سے پڑھتے۔ شعر کچھ اس قسم کے تھے کہ دنیا کا ستایا ہوا ہوں، تو تم بھی ستالو، لوگوں نے بجائے رحم کھانے کے اور ہلڑ مچایا۔ آخر میں ان کا پکا ہوا رنگ تپے ہوئے توے کی طرح تمتمانے لگا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھ کر رومال سے پنکھا جھلنے لگے تو ایک کہنہ مشق شاعر اٹھے۔ نہایت بردباری سے بولے، ''دیکھیے، آپ صاحبان میرا ساتھ دیجیے۔'' یہ کہہ کر وہ سمجھے کہ پالا مار لیا مگر اِدھر انھوں نے غزل شروع کی، اُدھر آوازیں بلند ہوئیں۔ بک اَپ چاچا بک اَپ (buck up)۔ کوئی شعر دل کو لگتا تو پکار ہوتی ''مکرر ارشاد چاچا سہارن پوری۔'' اتنے شاعروں میں بہ مشکل دو تین شاعر جمے۔ یہ وہ تھے جن کی آواز پاٹ دار تھی، ترنم اچھا تھا اور جن کی نظمیں یا غزلیں طلبہ کے جوان جذبوں سے میل کھاتی تھیں۔ جب ہوٹنگ زیادہ ہوئی تو اسد نے بڑے خلوص سے جھک کر مجھ سے پوچھا، ''اب ان مشاعروں کو ختم نہیں کردینا چاہیے، بڑی آوٹ آف ڈیٹ قسم کی چیز ہوکر رہ گئے ہیں۔''

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں... مگر شاید ان کا ہوتے رہنا ہی اچھا ہے۔'' میں نے کہا۔

Marfat.com

''کیوں؟'' اسد نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس لیے کہ ان بے چارے شاعروں کی آواز بہت سے وہ خواص سن لیتے ہیں جنھیں کبھی اردو نظم یا غزل پڑھنے کی توفیق نہیں اور بہت سے وہ عوام جو پڑھنا نہیں جانتے۔'' میرا اشارہ ان صوفوں کی طرف تھا جن پر خاص خاص مہمان بیٹھے جمائیاں پر جمائیاں لے رہے تھے اور ان لوگوں کی طرف جو بڑے بڑے پگڑ باندھے دریوں پر بیٹھے تھے اور مشاعرہ سننے کے لیے اپنی بے رنگ و روغن صدیوں پرانی سائیکلوں پر اتنی دور سے آئے تھے۔

''مگر ان شاعروں کو کتنا برا معلوم ہوتا ہوگا کہ لوگ کان دھر کر ان کا کلام سنتے تک نہیں۔'' اس نے کہا۔

''برا تو ضرور لگتا ہوگا مگر یہ سوچ کر صبر کر لیتے ہوں گے کہ ہمارے مخاطب یہ شور مچانے والے نہیں، وہ ہیں جو غور سے سن رہے ہیں، ممکن ہے یہ اس ہلڑ بازی کے عادی ہو جاتے ہوں۔ اور کیا، ان کے لیے یہ قدر افزائی نہیں ہے کہ اتنی دور سے انھیں بلایا جاتا ہے، اتنے اور ایسے ایسے لوگ انھیں سننے آتے ہیں۔ ممکن ہے اتنی دور آنے جانے میں انھیں کوئی ایسا حادثہ بھی پیش آتا ہو جو کسی اچھی نظم یا غزل کا محرک ہو۔'' مشاعرے کی اتنی صفائی پیش کرنے کے باوجود میں نے دیکھا کہ اسد اس سے کچھ متاثر نہیں تھا۔ اور بھی بہت سے لوگ کچھ شاعروں کے حلیوں سے بیزار ہو کر اور کچھ نہ سمجھنے کی وجہ سے چپکے چپکے کھسک گئے تھے اور جھیل میں بوٹنگ کر رہے تھے۔ ایک مشہور شاعر کی نظم ''پرتو'' خوب جمی۔ جب اس نے اپنے آدرش کا سراپا کھینچ کر آخر میں کہا کہ ''کہیں یہ پرتو خیال ہی تو نہیں،'' اسد میری طرف جھکا اور بولا، ''شکر ہے کہ میرا آئیڈیل خیالی نہیں، جیتا جاگتا انسان ہے۔''

''اچھا!'' میں نے اس انکشاف پر تعجب کا اظہار کیا۔

''اور اس سے بھی زیادہ شکر کا مقام ہے کہ اس وقت وہ میرے نزدیک ہے۔''

میرا دل دھڑک اٹھا۔ کان کی لویں جلنے لگیں۔ مجھے معلوم تھا یہ ہوگا۔ وہ آنکھیں بہت دن سے خاموشی میں مجھ سے یہی باتیں کہہ رہی تھیں مگر جب یہ بات زبان سے ادا ہوئی تو میرے دل کو جانے کیا کیا ہونے لگا، یکایک وہ جھیل اور اتنے سارے آدمی اٹھ کر

Marfat.com

جیسے کہیں دور چلے گئے۔ میں خلوت کی عجیب وغریب دنیا میں پہنچ گئی اور یہ جملے بار بار میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ مشاعرہ ختم ہوا تو چچا احمد کو کسی نے دور سے پکارا اور وہ اُدھر چلے گئے۔

''ہم کار کے نزدیک جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں، چچا وہیں آ جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ذرا... شاعر وغیرہ چلے جائیں، مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔'' وہ بولا۔

''ڈر لگتا ہے؟ یہ کیوں۔'' میں کچھ نہیں سمجھی تھی۔

''میرے پاس اس وقت آئینہ نہیں ہے، ورنہ میں آپ کو دکھاتا کہ شب بیداری سے یہ آپ کی سرخ سرخ آنکھیں، یہ تمتمایا ہوا چہرہ، یہ سفید لباس کیا غضب ڈھا رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ ان تیز نگاہ شاعروں کے پاس سے گزریں اور کسی نظم کا عنوان بن جائیں...'' میں ہنس دی۔

''شاعری کا کچھ نہ کچھ اثر تو آپ پر بھی ہو ہی گیا۔'' میں نے کہا۔

''آپ مذاق سمجھ رہی ہیں۔'' وہ بولا۔

''جی ہاں... قطعی۔''

''حالاں کہ جب وہ شاعر اپنے محبوب کا سراپا کھینچ رہا تھا تو میں سچ مچ ڈر رہا تھا کہ کہیں اس نے آپ کو دیکھ تو نہیں لیا۔ جب اس نے اس کو خیالی پرتو کہا تو میں نے شکر ادا کیا۔ اسی لیے تو میں نہیں چاہتا کہ آپ وہاں سے گزریں۔''

''مذاق چھوڑیے، آیئے چلیں۔''

پھولوں کے تختوں کے پاس سے گزرتے، سیڑھیاں چڑھتے ہم شاعروں کی بارہ دری کے پاس سے گزرے، جو اب خالی ہو چکی تھی۔ پھر ریتیلی چڑھائی پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے جب ہم اوپر کی طرف چڑھ رہے تھے، اچانک اسد بڑی ہی گمبھیر آواز میں بولا، ''اگر تم نے مجھے نہیں تھاما تو میں گر جاؤں گا۔'' میں نے پلٹ کر اس کو دیکھا، وہ کیا کہہ رہا تھا۔ کیا اشعار واقعی اس کے دل و دماغ پر نشے کی طرح چھا گئے تھے۔ وہ پھر بولا۔ اب کے اس کا لہجہ بہت اداس تھا، ''مجھے سہارا چاہیے صبی، کسی ایسی ہستی کا جو مجھے ہمیشہ سنبھالے رکھے، ورنہ... ورنہ میں نہیں جانتا، میرا کیا حشر ہوگا...''

Marfat.com

''کیا ہوا؟'' میں اس کا اداس چہرہ اور آنکھوں میں تیرتے سائے کو گہرا ہوتے دیکھ کر گھبرا گئی۔

''میں... میں بہت تنہا ہوں... بہت اداس ہوں اور بہت برا ہوں۔'' وہ آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ میری طرف بڑھا۔ میں نے اسے تھام لیا۔ وہ یخ ہو رہا تھا... ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہم اوپر آ گئے۔

ریت کے ٹیلوں کے سائے میں ہماری کار کھڑی تھی۔ ہم اس کے نزدیک کھڑے ہو گئے۔ چاندنی رات کا جادو اپنا اثر کر چکا تھا۔ میرا دل پانی میں ہلنے والی روشنیوں کی طرح ڈانوا ڈول ہو رہا تھا۔ چند منٹ خاموشی رہی پھر اس نے ہنس کر کہا، ''مشاعرے کا کوئی اور فائدہ ہو نہ ہو، ایک فائدہ ضرور ہے۔''

''کیا؟'' میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کبھی کبھی ایسے دو دل جنھیں مل جانا چاہیے، مشاعرے میں مل جاتے ہیں۔'' وہ شرارت سے مسکرایا اور یک لخت... چاندنی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جانے کیسے ایک خیال میرے دل پر بجلی بن کر گر پڑا۔ شاید اس کی اپنی بیوی سے پہلے پہل ملاقات کسی مشاعرے میں ہی ہوئی ہو۔ شاید اس سے بھی اس نے یوں ہی اظہارِ الفت کیا ہو۔ اس کے سامنے بھی اپنی آنکھوں کی، گہرائیوں کا جادو یوں ہی جگایا ہو۔ اس کا ہاتھ تھام کر یوں ہی پکارا ہو، ''میں... میں بہت تنہا ہوں۔ بہت اداس ہوں اور بہت برا ہوں۔'' شاید یہ تین آزمودہ ٹکڑے ہیں، جن کا اثر وہ پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ مجھے الجھن سی ہو رہی تھی، سکون و آسودگی، وہ جذب و مستی کے چند لمحے جن سے میں ابھی گزر رہی تھی، ختم ہو چکے تھے۔ شاید یہ اس خوب صورت ماحول سے ریتیلے ٹیلوں پر آنے کا اثر تھا یا وہ ازلی خوف جو انسان کو دل بھر کے خوش بھی نہیں ہوئے دیتا، اس وقت مجھے یہ خیال ہوا کہ ہر جذبے کے لیے خارجی اثرات سے زیادہ اندرونی احساسات کتنی بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک ہی بات دو مختلف صورتوں میں کتنے مختلف اثرات پیدا کرتی ہے۔ بارے چچا احمد آ گئے اور ہم سب کار میں بیٹھ گئے۔ ان کی باتونی طبیعت نے ہمارے راز کو افشا ہونے سے بچالیا۔ وہ راستے بھر خود ہی باتیں کرتے رہے۔ انھیں یہ خیال بھی نہ آیا کہ ہم دونوں یوں خاموش کیوں بیٹھے ہیں جیسے ان

Marfat.com

کے ساتھ کار میں نہیں جا رہے کسی اور ہی فضا میں پرواز کر رہے ہیں۔ ہوٹل پہنچ کر ہم اترے تو بابا ڈریسنگ گاؤن پہنے اوپر بالکنی میں کھڑے تھے۔

''آ گئے؟'' انھوں نے کہا اور دونوں دوستوں میں وہیں سے باتیں ہونے لگیں۔ بیگم گراموفون کے کمرے کی کھڑکی کا پٹ کھلا اور کوئی شیشے سے ناک لگا کر باہر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ شاید ہمارے ساتھ چچا احمد کو دیکھ کر انھیں مایوسی ہوئی۔ کھڑکی کا پٹ جلد ہی بند ہو گیا۔ ہم چچا احمد کا شکریہ ادا کر کے اندر آئے اور سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اسد نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہم دونوں خاموشی سے اتنی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے گویا وہ تیس نہیں ایک سو تیس سیڑھیاں تھیں۔ جب میں نے دروازہ کھولنے کے لیے نوب پر ہاتھ رکھا، اسد نے بڑھ کر اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر سرگوشی میں بولا۔

''مجھے سہارا دوگی نا؟''

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ہماری نظریں ملیں اور ہم جیسے ایک دوسرے میں کھو گئے۔ اندر کمرے سے آنے والی قدموں کی چاپ نے مجھے چونکا دیا اور میں خدا حافظ کہہ کر اندر آ گئی۔ بابا کمرے میں موجود تھے۔

''ہیلو... کیسا رہا مشاعرہ؟''

''اچھا خاصا...'' میں نے کہا۔

''اوہ... نیند کی وجہ سے تمھاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں، جاؤ جلدی سے سو جاؤ۔''

''آپ ابھی تک نہیں سوئے بابا؟''

''سو گیا تھا، کار کی آواز سے آنکھ کھلی۔''

بابا اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں کپڑے تبدیل کر کے آئی تو نیند کا کوسوں پتا نہ تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ چاند کی روشنی میرے پیچھے کی پوری کھڑکی میں سے گزر کر کہکشاں سی بناتی ہوئی سامنے دیوار سے جا ٹکرائی تھی۔ میں صوفے سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ چاندنی، وہ سیلِ نور مجھ پر سے یوں گزر رہا تھا جیسے میں اس میں نہا

رہی ہوں۔ سامنے درمیانی میز پر کھلا ہوا کسی شاعر کا دیوان چاندنی میں اتنا خوب صورت نظر آ رہا تھا جیسے اس فرشتے کی نوٹ بک جو حضرت ابو بن ادھم کے سامنے خدا سے محبت کرنے والے بندوں کے نام لکھ رہا تھا... یہاں تک کہ چاندنی میں مجھے خود اپنا وجود ہلکا پھلکا آسمانی سا نظر آ رہا تھا۔ یکایک بہت... بہت ہلکی آواز میں کانن کا وہی ریکارڈ بجتا سنائی دیا۔ من موہن... یہ اسد کے ڈرائنگ روم میں بج رہا تھا۔ دونوں کمروں میں چار قدم کا فاصلہ تھا۔ دونوں کے دروازے بند تھے مگر آواز ایک کھڑکی سے گزر کر دوسری طرف سے اندر آ رہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کھڑکی کے راستے میں اسد کو دیکھ سکتی ہوں، جیسے وہ اسی طرح اپنے کمرے میں کھلی کھڑکی کے سامنے صوفے پر چاندنی میں نہایا ہوا بیٹھا ہے۔ نیند اس سے کوسوں دور ہے۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں گہرے سائے کے بجائے تازہ محبت کا سرور ہے۔ کانن کی آواز کا جو تار اس کے کمرے سے نکل رہا تھا، میرے دل کو جکڑ رہا تھا۔ ہم دونوں اس وقت ایک ہی جیسے کمروں میں یکساں کیفیت سے سرشار تھے۔ میں اسی طرح سر ٹکائے بیٹھی رہی۔ کانن کی آواز کبھی ہلکی اور کبھی ذرا سی تیز ہوا کے دوش پر سوار اندر آتی رہی۔ اور صبح جب بابا نے مجھے اسی حالت میں سوتا پا کر اٹھایا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے صرف ایک لمحے کے لیے میری آنکھ جھپکی ہو۔ کانن کا ریکارڈ اب تک میرے کانوں میں بج رہا تھا، گو اسے بند ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔

اور پھر وہی ہوا جو ایسے موقعوں پر ہر لڑکی کے ساتھ ہوتا ہوگا۔ میں اسد کی ایک جھلک تک دیکھنے کو بے تاب رہنے لگی۔ صبح کو جب وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے جاتا تو میں بالکنی میں کھڑی دیکھ رہی ہوتی۔ وہ اوپر دیکھ کر مسکراتا۔ صبح سویرے کی خوب صورت فضا میں اس کا چہرہ پھول کی طرح شگفتہ ہوتا۔ وہ ہاتھ ہلاتا اور اپنی فوکس ویگن میں بیٹھ کر ہوا ہو جاتا۔ جب وہ کھانے کے کمرے میں ہوتا تو میں غسل خانے کے سامنے والی گلی کی کھڑکی سے اسے دیکھا کرتی۔ وہ ڈائننگ ہال کی بڑی سی کھڑکی کے سامنے والی میز پر دائیں طرف بیٹھا ہوتا۔ وہ میز پر تنہا ہوتا کیوں کہ بوبی کی شرارت کی وجہ سے اب اسے کمرے ہی میں کھانا کھلایا جاتا تھا۔ رات کو پردے ہٹے ہوئے ہوتے اور ہال کی تیز روشنی میں اس کا ایک ایک نقش واضح اور جگمگاتا ہوا نظر آتا۔ وہ اس کے سیاہ کندھوں تک چلے گئے بال، وہ اس کا فراخ ماتھا جو روشنی کی کرنوں میں آئینے کی طرح چمکتا۔ وہ اس کی سیاہ گہری آنکھیں،

ستواں ناک، خمیدہ لب۔ وہ اس کا ہر چیز بڑی آہستگی اور احتیاط سے اٹھانا اور کبھی کبھی غیر شعوری طور پر میری کھڑکی پر نظر ڈالنا (گو میں اسے نظر نہ آتی ہوں گی) پھر کسی کے پاس سے گزرتے ہوئے مسکرا کر سر ہلانا۔ بعض اوقات جب تک وہ کھانا کھا کر نپے تلے قدم رکھتا ہال سے باہر نہ نکل جاتا میں اسے دیکھتی رہتی۔ مجھے وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا لیکن ان ہی لمحوں میں یک لخت میرے دل میں ایک درد سا اٹھتا، وہی نامعلوم سی رقابت کا احساس۔ یہ آنکھیں کسی اور کی نگاہ کا مرکز رہی ہوں گی، یہ پیشانی کسی اور کی سجدہ گاہ رہی ہوگی۔ اسے مجھ سے کہیں زیادہ قربت حاصل ہوگی۔ اُس نے آنکھوں میں نزدیک سے جھانکا ہوگا۔ اس نے اَن گنت مرتبہ اس چمکتی پیشانی کو چوما ہوگا۔ ان بل کھاتی لمبی لمبی بھنوؤں پر ہاتھ پھیرا ہوگا۔ میں ایک پھریری لیتی اور جتنا اس حقیقت کو بھولنے کی کوشش کرتی، وہ میرے دل پر نقش ہوتی جاتی، یہاں تک کہ اس کش مکش میں میرا دل پتھر کی طرح بوجھل ہوجاتا... اس بوجھ میں سب سے بڑا بوجھ اس کی خاموشی تھی۔ اگر وہ اس سلسلے میں مجھ سے کھل کر بات کرلیتا تو شاید میرا دل ہلکا ہوجاتا... شاید میں نامعلوم لمس کے ان نشانوں کو بھول جاتی جو مجھے ہر جگہ نظر آتے تھے۔ اگر وہ یہ اقرار بھی کرلیتا کہ وہ ابھی تک اس سے محبت کرتا ہے تو کسی طرح میں اپنے دل کو بہلا لیتی۔ اس کی محبت کے دو حصوں میں سے ایک ہی کو کلیجے سے لگا لیتی لیکن وہ خاموش تھا۔ جیسے اس نے مجھے اس قابل ہی نہ سمجھا تھا کہ اپنے راز میں شریک کرسکے جیسے قیمتی چیز عام نظروں سے چھپا کر رکھی جاتی ہے، اسی طرح وہ اپنی پہلی محبت کا بھید مجھ سے چھپا رہا تھا۔ اور خود اس سے کچھ پوچھنا میری فطرت کے خلاف تھا... مجھ سے یہ بات راز رکھنے کا دکھ اصلی تھا یا رقابت کے احساس کو دبانے کے لیے میرے ضمیر نے گھڑ لیا تھا کہہ نہیں سکتی لیکن میں سچے دل سے مانتی تھی کہ اسد کی خاموشی کا وزن میرے دل پر اس کی محبت کی تقسیم سے کم نہ تھا۔ اس کی محبت کی تقسیم کا ثبوت ہر وقت میرے سامنے تھا جس سے اسد اتنے پیار سے بات کرتا تھا کہ بعض اوقات میں تڑپ اٹھتی تھی۔ وہ اسے اتنی آہستگی سے گود میں لیتا جیسے کوئی نازک پھول اٹھا رہا ہو۔ وہ اس کے گالوں پر اتنی بار پیار کرتا کہ وہ دمک اٹھتے اور بوبی پریشان ہوکر اس کی گود سے اتر کر بھاگ جاتا۔ اسد بڑی آہستگی سے ہنستا اور اسے جاتا ہوا دیکھتا رہتا۔ ایسے موقعوں پر مجھے خیال آتا، بوبی کی ممی کی شکل ایسی ہی ہوگی۔ اس کی رنگت میدے کی طرح

Marfat.com

سفید اور بال سنہری ہوں گے اور اس کے گال بھی یوں ہی تمتما اٹھتے ہوں گے۔ اس احساسِ رقابت کے باوجود میں بوبی کو چاہتی تھی، وہ مجھے پسند تھا، اس کی معصوم ادائیں اس کی بھولی بھولی صورت اور پھر وہ اسد کا خون ہی تو تھا، اس کی آنکھیں اس کی طرح سیاہ تھیں... ان دونوں میں صرف آنکھوں کا رنگ مشترک تھا۔

○○○

Marfat.com

۵

اچانک ایک شام بابا نے کہا کہ وہ کسی کام سے کراچی جا رہے ہیں اور مجھے اتنے دن چچا احمد کے ہاں رہنا ہوگا۔ میں جلد جلد اپنا سوٹ کیس ٹھیک کرنے لگی۔ بابا کے اتنے اچانک جانے کے پیچھے کوئی خاص بات نظر آ رہی تھی، مجھے اتنا وقت بھی نہ ملا کہ اسد سے بات کرسکتی۔ جس وقت ہم چل رہے تھے، اسد نیچے آ کر ہمارے نزدیک کھڑا ہوگیا مگر اس نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ جب آخیر وقت میں بابا کو کوئی چیز یاد آئی اور وہ اسے لانے اوپر لپکے تو میں نے جلدی جلدی اسد کو ساری بات بتائی۔ وہ خاموش رہا۔ ایک لفظ بھی اظہارِ افسوس یا تعجب میں نہ کہا اس نے، پھر میں نے اسے چچا احمد کا پتا بتا کر کہا کہ وہ ضرور وہاں آئے۔ اس پر وہ بولا:

''افسوس ہے، میں وہاں نہ آسکوں گا۔''

''کیوں؟'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

''تمھارے بابا نے منع کر دیا ہے۔''

اتنے میں بابا آگئے۔ ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے اور میں سوچنے لگی، کیا واقعی بابا نے اس کو چچا احمد کے ہاں جانے سے منع کر دیا ہے۔ مگر کس وقت؟ مجھے بتانے کے بعد سے تو وہ اسد سے ملے بھی نہیں تھے اور انھوں نے باہر سے آ کر اس طرح اچانک کراچی جانے کی بات چھیڑی تھی جیسے ابھی ابھی ارادہ کیا ہو... تو کیا اسد نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ چچا احمد کے ہاں آنا نہیں چاہتا تھا۔ اس قسم کے کتنے ہی سوالات میرے ذہن میں کھلبلی مچا رہے تھے۔ دل چاہا بابا سے پوچھوں مگر ہمت نہ ہوئی۔ وہ مجھے چچا احمد کے ہاں

Marfat.com

چھوڑ کر سیدھے اسٹیشن چلے گئے۔ یہاں بھی کسی کو بابا کے جانے کی پہلے سے اطلاع نہیں تھی۔

آج پہلی مرتبہ میں کسی کی جدائی کی اذیت کو اتنا محسوس کر رہی تھی اور مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ اسد کس حد تک میرے دل و دماغ پر چھا چکا ہے۔ روبینہ اور سہیلہ کی نظر بچا کر باغ کے ایک سنسان گوشے میں ٹہلتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا کہ شاید بابا مجھے اسد سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اسد انھیں پسند نہیں ہے اور ایک دم مجھے یہاں سے بھیجنے کے بجائے، انھوں نے بہتر سمجھا کہ کچھ دن کوئٹہ ہی میں اسد سے الگ رکھیں پھر گھر بھیج دیں یا کراچی جس کا ذکر وہ ایک دفعہ پہلے بھی کر چکے تھے۔ مگر کیا انھوں نے یہ سب کچھ اسد کو بتا دیا تھا۔ بتایا ہی ہوگا تبھی تو انھوں نے اس کو یہاں آنے کو منع کیا ہوگا۔ اور پھر وہ ذرا مضطرب نہیں تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ذرا سا خاموش ضرور تھا مگر کسی صدمے کے نشان اس کے چہرے پر نہ تھے، شاید وہ اس وار کو آسانی سے سہہ گیا... کیوں کہ میں نے اپنی زبان سے اس سے کچھ بھی نہ کہا تھا۔ کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ سمجھا ہو، میں اپنی مرضی سے جا رہی ہوں۔ مجھے افسوس ہوا، کاش میں اسے اپنے دل کی حالت بتا دیتی تو وہ بابا سے بہت کچھ کہہ سکتا۔ اب تو وہ خاموش رہ گیا ہوگا۔ میرا دل اچانک اتنا بوجھل ہوگیا جیسے من من بھر کے پتھر اس پر رکھ دیے گئے ہوں۔

چچا احمد کے ہاں ایک پل کو بھی چین نہ تھا۔ زندگی تیز گام کی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ صبح برج یا مایون پارٹی ہے تو دوپہر کو کوئی لنچ کے لیے آرہا ہے۔ رات کو کہیں پارٹی پر جانا ہے۔ سارا دن تیاری، تیاری، تیاری اور جو وقت بچتا، وہ تیاری کی تیاریوں میں صرف ہوتا۔ ہم رنگ چوڑیاں لانے کار بھاگی جا رہی ہے، نیا بلاوز درزی کے ہاں سلا رکھا ہے، وہ بھی لانا ہے۔ اس سب بھاگ دوڑ کے دوران میں جو باتیں ہوتیں، وہ بھی تیاریوں کے متعلق اور واپس آکر دوسروں کے کپڑے، میک اَپ اور اندازِ نشست و برخاست پر تبصرے ہوتے اور نئے نئے اسکینڈلز بنائے اور پھیلائے جاتے۔ ہوٹل کی اپنی خاموش زندگی سے یہاں آکر میں گھن چکر سی بن گئی۔ وہ صبح صادق کی دل کشیاں، وہ مردار پر چھائی ہوئی دھند، وہ دور دھند میں سے پھٹتا غبار اور اس میں سے چھنتی ہوئی سورج کی کرنیں جنھیں بالکنی میں کھڑی ہوکر میں روز اتنے شوق سے دیکھتی تھی، دیر تک سونے کی نذر

ہوگئیں۔ ڈوبتے سورج کی دل کشیاں چائے اور کاک ٹیل پارٹیوں کی بھینٹ چڑھنے لگیں اور دو چار دن ہی میں میں اتنی تھک گئی۔ جیسے ایک سار میلوں بھاگتے بھاگتے بے دم ہوگئی ہوں۔ میں ہر دفعہ ان کے ساتھ باہر جانے سے انکار کرتی اور ہر دفعہ مجھے زبردستی لے جایا جاتا۔ نتیجہ، کہ سیکڑوں آدمیوں کے مجمعے، رنگ و نور کے طوفان میں بھی میں خود کو تنہا محسوس کرتی۔ چاروں طرف روشنیوں اور قہقہوں کے سیلاب میں مجھے ہوٹل کی سکون آمیز شامیں یاد آتیں۔ وہ سرخ مچھلیاں جو شام کے سرمئی اور سبز رنگوں میں اور بھی زیادہ دمک اٹھتی تھیں۔ ان کو دیکھ کر ایک دفعہ مجھ کو خیال آیا تھا کہ میری زندگی ان مچھلیوں ایسی ہے جو شیشے کے پار زندگی کی چہل پہل کو دیکھ سکتی ہیں مگر ان میں حصہ نہیں لے سکتیں۔ مگر جب شیشے کی یہ دیوار ٹوٹ گئی اور مجھے سیکڑوں آدمیوں کے مجمعے میں بیٹھنے کا موقع ملا جہاں کئی نوجوان بڑے لیچڑ انداز میں آس پاس منڈلایا کرتے تو میں پریشان ہو اٹھتی۔ میرا دل اس شیشے کی دیوار کے پیچھے جانے کو بے چین تھا جہاں سے میں سب کچھ دیکھ سکوں مگر اس میں حصہ نہ لے سکوں۔ مجھے ایسی زندگی میں شامل ہونے کا کوئی شوق نہیں تھا جہاں صبح سے شام تک کہیں جانے یا گھر میں ہونے والی پارٹی کی تیاریاں تھیں۔ پھر مجھے کیا چاہیے، میں کون سی زندگی کے خواب دیکھ رہی ہوں، مجھے خود معلوم نہ تھا۔ میں اتنا جانتی تھی کہ رنگین صوفوں، رنگین تتلیوں اور بھنوروں سے دور کسی خاموش جگہ جانا چاہتی تھی جہاں میری زندگی اتنی بے سود اور اتنی بے مصرف نہ ہو مگر یہاں میرے چاروں طرف شیشے کی دیوار تھی یا دیوار سے آگے رنگ اور خوش بو میں ڈوبی ہوئی اُتھلی اور بے کار زندگی۔ اسد جو میری زندگی میں چمکتا تارہ بن کر ابھرا تھا، دور دھند میں غائب ہوتا جا رہا تھا۔ بابا چار روز کا کہہ کر گئے مگر اب ایک ہفتے بعد بھی نہ لوٹے تھے۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ اب بابا کا تار چچا احمد کے نام آئے گا کہ صبی کو بھیج دو اور وہ مجھے گاڑی میں بٹھا آئیں گے اور ہوٹل کے وہ شب و روز خواب و خیال ہوجائیں گے...

اور آہستہ آہستہ میں خود کو بابا کی رضا پر ڈھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ بابا مجھے مجھ سے بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ امی کے بعد انھوں نے مجھے ماں کی طرح پالا تھا، استاد کی طرح پڑھایا تھا اور ایک ماہرِ نفسیات کی طرح پرکھا تھا۔ وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ میری حساس طبیعت اس لڑکے سے میل نہ کھائے گی۔ شاید کسی کم زور لمحے میں بچے کی

Marfat.com

محبت پر میری فطری رقابت حاوی ہوجائے یا میں اپنے محبوب کے اُن اَن جانے لمحوں کی رقابت کا شتکار ہوجاؤں جن میں میرا کوئی حصہ نہیں تھا۔ اور میں نے خود کو بہلانے کے لیے اپنے آپ کو روبینہ اور سہیلہ کے حوالے کردیا۔ وہ جہاں لے جاتیں خاموشی سے چلی جاتی اور جب گھر میں کوئی پارٹی ہوتی تو سارا دن گھر کی صفائی اور سجاوٹ میں جتی رہتی۔ وہ خوش تھیں کہ آخر وہ مجھے راہِ راست پر لے ہی آئیں۔

ایک شام جب ہم ایک چائے سے لوٹے تو میں نے عجیب منظر دیکھا۔ سامنے باغ میں بابا، چچا احمد سے باتیں کررہے تھے اور نزدیک ہی ایک کرسی پر اسد بیٹھا تھا۔

اس کو اچانک دیکھ کر میرا دل خوشی سے اچھل کر حلق میں آگیا اور یوں دھڑکنے لگا جیسے ابھی ابل کر باہر آن پڑے گا۔ مجھے اپنے گال اور کان جلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ ''ارے بابا!'' میری زبان سے صرف اتنا ہی نکلا۔ ''دیکھنا دیکھنا، بابا کو دیکھ کر مارے خوشی کے لال ہوگئی ہے۔'' روبینہ چلائی۔

آہستہ آہستہ خود کو سنبھالتی، اپنے گرتے پلّو کو قابو میں کرتی، میں بابا کے پاس گئی اور انھیں سلام کیا۔ بابا نے دعا دی اور پھر میں نے اسد کی طرف دیکھا۔ اسد میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اُف! میں بتا نہیں سکتی، اس کو دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی۔ اسد جس کو اب کبھی نہ دیکھ سکنے کا مجھے یقین ہوگیا تھا، میرے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ چاکلیٹ رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا اور گلاب کی ایک سرخ کلی اس کے کوٹ میں لگی شرما رہی تھی۔ اس کے سیاہ بال اسی طرح جمے ہوئے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھیں اتنی ہی خوب صورت، اتنی ہی گہری اور اتنی ہی مدہوش کردینے والی تھیں۔ مجھے یوں لگا کہ میں نے خود کو نہ سنبھالا تو اس کی گود میں گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں گی۔ میں لڑکھڑاتی ہوئی اندر چلی آئی۔ میرا دل فرطِ خوشی میں دھڑک دھڑک کر یہی پوچھ رہا تھا۔ بابا اسے یہاں کیوں لائے ہیں، کیا ان کو معلوم تھا کہ اسد کے بغیر میرے دن کتنے بے کیف گزریں گے۔ سہیلہ نے پوچھا کہ اپنے بابا کے پاس کیوں نہیں بیٹھتیں، تو میں نے کہا، کپڑے بدل کر جاؤں گی۔ بابا کے سامنے اتنا سج بن کر بیٹھنا مجھے اچھا نہیں لگتا... کپڑے تبدیل کرنے کے بعد بھی میں بہت دیر تک ہاتھ اپنی گود میں ڈالے مدہوش سی بیٹھی رہی۔ آخر روبینہ باہر سے اٹھ کر آئی اور مجھے زبردستی گھسیٹ کر لے گئی۔ اسد نے بڑے پیار بھرے شکوے سے کہا، ''آپ بوبی کو بھول گئیں، وہ آپ

Marfat.com

کو بہت یاد کرتا ہے۔"

"آپ اسے لائے کیوں نہیں... میں خود اسے یاد کرتی تھی۔"

"بوبی کون ہے... بوبی کون ہے۔" روبینہ ہمیشہ کی طرح بے قرار ہوکر پوچھنے لگی، "بوبی... ان کا لڑکا ہے۔" آہستہ سے میں نے کہا اور یہ کہتے کہتے میرا دل جو پھول کی پنکھڑی کی طرح ہلکا تھا، پھر بوجھل ہوگیا۔ شاید میرے لہجے سے اسد نے میرے دل کی حالت کا اندازہ لگا لیا اور ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں تیرتا سایہ گہرا ہوگیا۔ پھر اس نے نہایت خوب صورتی سے موضوع بدل دیا... بابا کراچی میں ملنے والے دوستوں اور عزیزوں کے حالات سنانے لگے۔ میں ان کو سننے سے زیادہ اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ شاید بابا اب مجھے کراچی جانے کی اطلاع دیں گے یا ہوٹل کے بجائے میرے چچا احمد ہی کے ہاں رہنے پر مصر ہوں گے۔ ایسی صورت میں اسد کا یہاں آنا جانا آسان نہ ہوگا۔ اگر وہ آیا بھی تو روبینہ اور سہیلہ مجھے ایک پل کو اس کے ساتھ تنہا نہ چھوڑیں گی... میرے دیکھتے دیکھتے روبینہ نے اسد کو اپنا باغ دکھانے کی پیش کش کردی۔ وہ ہچکچاتا ہوا اٹھا اور مجھ سے بولا، "آپ، آپ بھی آیئے۔" دفعتاً مجھے روبینہ کی پنسل سے بنائی ہوئی بڑی بڑی بادامی آنکھیں اور موٹے موٹے ہونٹوں پر تیز نارنجی لپ اسٹک زہر لگنے لگی...

"میں تو اس باغ کا چپا چپا چھان چکی ہوں، آپ دیکھیے۔" میں نے کہا۔ گو میرا دل اس کے ساتھ جانے کو تڑپتا رہا لیکن میں بابا کی باتوں میں دلچسپی ظاہر کرتی ہوئی وہیں بیٹھی رہی...

چچا احمد نے اصرار سے بابا اور اسد کو یہیں کھانا کھلایا۔ کافی کے دور کے ساتھ باتیں ہوتی رہیں جس میں زیادہ تر بابا اور چچا احمد کی باتیں تھیں یا پھر روبینہ کے اسد سے دوسرے ممالک کے بارے میں پوچھے جانے والے سوالوں کی بوچھاڑ تھی۔ آخر وہ لمحہ آیا جس کا میں گھنٹوں سے امید و بیم کی حالت میں انتظار کر رہی تھی۔ بابا چلنے کے لیے اٹھے اور مجھ سے بولے، "تم ابھی ہمارے ساتھ چلوگی یا بعد میں آجاؤ گی۔" جواب دیتے دیتے میرا چہرہ سرخ ہوگیا لیکن ہمت کر کے کہہ ہی گزری، "میں ابھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔"

"اب تو ہم ہرگز اسے نہ جانے دیں گے۔ بڑی مشکل سے تو پھنسی ہے۔" روبینہ اور سہیلہ ایک ساتھ چلائیں۔

Marfat.com

''لو بھئی اب تم فیصلہ کرلو۔'' بابا نے کہا۔ میں نے دیکھا اسد بھی کش مکش کی حالت میں کھڑا ہے جیسے وہ کہہ رہا ہو، کیا میرا دل توڑ دو گی؟

''نہیں میں جاؤں گی۔'' میں نے بات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

''تم نہیں جاؤ گی۔'' روبینہ نے مجھ سے زیادہ تحکم سے کہا۔

''پھر چلی جانا بیٹی، اتنی جلدی کیا ہے۔'' بیگم احمد بولیں۔

''ہاں ہاں اور کیا...'' چچا احمد نے بھی گرہ لگائی۔ اور میں ہارے ہوئے سپاہی کی طرح گردن جھکا کر خاموش رہ گئی۔ اسد نے دوسری طرف منہ پھرلیا جیسے وہ میری مجبوری سمجھتا ہو۔ دفعتاً بابا بولے، ''نہیں بھئی آج تو ہماری بیٹی کو جانے دو۔ اتنے دن بعد ہم سے ملی ہے، پھر کسی دن آجائے گی تمھارے پاس۔'' بابا کی اس بات نے جیسے تصفیہ کر دیا۔ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''انکل نے ہمیں قائل کر دیا۔'' روبینہ بولی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' بیگم احمد بھی راضی ہوگئیں۔

میں نے خاموشی سے اپنا سوٹ کیس نوکر کے ہاتھ میں دیا اور آ کر کار میں بیٹھ گئی۔ چچا احمد کی کار ہمیں چھوڑنے جا رہی تھی۔ بابا اسد کی کار میں نہیں بلکہ شاید ٹیکسی میں آئے تھے۔ بابا اور اسد سب سے رخصت ہوکر آئے تو ایک اور ہی عجیب بات ہوئی۔ بابا اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بیٹھ گئے اور اسد آ کر میرے قریب بیٹھ گیا۔ کار چلی تو اسد نے آہستہ سے میرا ہاتھ اٹھا کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ شدتِ جذبات سے آنسو میری آنکھوں سے نکل نکل کر اس کے ہاتھ کو بھگونے لگے۔ میں نے بہ مشکل خود کو سنبھالا کہ اگر بابا نے بات کی تو میری رُندھی ہوئی آواز سن کر کیا سوچیں گے۔ مگر تعجب ہے سارے راستے بابا نے کوئی بات نہیں کی۔ اسد بھی نہیں بولا۔ میں اور چچا احمد کا باتونی ڈرائیور بھی خاموش تھا جیسے چار گونگے سفر کر رہے ہوں۔ صرف اسد کے ہاتھ میں میرا ہاتھ کپکپاتا رہا۔

ooo

Marfat.com

۶

دوسرے دن آفس کے لیے لیٹر بکس میں ایک خط ڈال کر پلٹی تو لان میں بیگم گراموفون، میڈم ڈبل روٹی اور عراقی بیگم بیٹھی تھیں۔ میں نے انھیں سلام کیا تو بیگم گراموفون بولیں، ''ارے تم کہاں چلی گئی تھیں۔ بچوں نے تمھیں بڑا مس کیا۔ خاص طور پر بوبی نے۔'' یہ کہہ کر وہ میڈم ڈبل روٹی کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائیں۔

''بابا کو کسی کام سے کراچی جانا تھا، میں ان کے ایک دوست کے ہاں چلی گئی تھی۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''تمھارے پیچھے یہاں بڑا مزہ آیا۔ ایک دن اتنے ٹورسٹ آئے، اتنے ٹورسٹ آئے کہ سارا ہوٹل بھر گیا۔''

''کہاں سے آئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''انگلینڈ سے۔ ایک بڑی بس بھری ہوئی تھی۔ ڈائننگ ہال میں ساری میزیں ملا کر ان کے لیے کمرے جتنی میز بنا دی تھی۔ اتنا شور ہوتا تھا، اتنا شور ہوتا تھا کہ کان پھٹ جاتے تھے، ایمان سے۔''

''تب تو اچھا ہی ہوا، میں نہیں تھی، ورنہ میرے کان بھی پھٹ جاتے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں تو... مزہ بھی بڑا آتا تھا۔ صبح صبح اٹھ کر وہ پیدل بازار جاتے، وہاں سے مرد اور عورتیں قراقلی ٹوپی اوڑھے تانگوں میں چلی آ رہی ہیں۔ پھر ایک دوسرے کو تانگے میں بٹھا کر تصویریں لے رہے ہیں، ہے نا۔'' بیگم گراموفون نے میڈم ڈبل روٹی سے

Marfat.com

تصدیق چاہی۔

''اور ہاں... پھر ان کو سیر کرانے کے لیے ہمارے پاکستانی بے چارے اپنی کاریں اور اسکوٹر لے کر جمع ہوجاتے۔ ایک لڑکی پیچھے اسکوٹر پر بیٹھ کر یوں مزے سے کمر میں ہاتھ ڈال لیتی اور پھر سے اُڑ جاتے دونوں۔''

''پر... بھئی، سب سے خوب صورت دانہ تو اپنے اسد کے ہی ہاتھ لگا۔'' بیگم گراموفون بولیں۔ ''اس لیے کہ اس کے پاس کار ہے اور وہ بھی ایسی اچھی فوکس ویگن۔'' انھوں نے میری طرف دیکھا... میں منھ پھیر کر حوض کی مچھلیوں کو دیکھنے لگی۔

اب میڈم ڈبل روٹی نے بولنا مناسب سمجھا، ''میں تم کو بتاؤں، وہ تو اتنی پیاری تھی، اِتنی پیاری تھی کہ کیا کہوں۔ باقی تو سب بدشکلیں تھیں، پر اس کا میدہ ایسا رنگ اور بالکل صاف جلد... کالے بال اور کالی آنکھیں۔ سب بیٹھے چٹر پٹر باتیں کرتے مگر وہ ملکہ کی طرح شان سے سیدھی بیٹھی مسکرایا کرتی۔ پتا ہے میں نے مسز رشید سے شرط لگائی تھی کہ یہ لڑکی کسی کے ساتھ نہیں جائے گی، پر اسد صاحب اسے بھی لے اڑے۔''

''پتا نہیں، رہنے والی کہاں کی تھی وہ۔'' بیگم گراموفون بولیں۔

''اسد سے پوچھیں گے۔''

اس ساری گفتگو میں وہ مجھے کیا بتانا چاہتی تھیں اور کیوں؟ یہ میں نہ سمجھ سکی۔ اس بہانے شاید وہ مجھ سے یا میری حرکتوں سے کچھ قبلوانہ چاہتی تھیں، مگر میں نے اس سلسلے میں ایک لفظ کہا نہ ان سے کچھ پوچھا۔ وہ نا امید ہوکر دوسری باتیں کرنے لگیں۔ دوسروں کے پھٹے میں پاؤں اڑانے کا کتنا شوق ہے ان عورتوں کو، میں سوچتی رہتی اب میں نے دیکھا کہ آتے جاتے، کھانے کے وقت یا شام کو لان میں بیٹھے ہوئے نہ صرف بیگم گراموفون اور میڈم ڈبل روٹی بلکہ بابا تک کی نظریں بھٹک کر میرا اور اسد کا جائزہ لیتیں۔ جیسے ہمیں چوری کرتے پکڑنا چاہتی ہیں۔ بابا پہلے سے کم باہر جاتے، جاتے تو جلد ہی واپس آجاتے۔ انھوں نے مجھے اسد سے بات چیت کرنے کو کبھی منع نہیں کیا لیکن جب بھی میں بوبی سے یا اسد سے بات کرتی، وہ دوسروں سے بات کرتے کرتے ایک دم کھو جاتے جیسے وہ ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اس چیز سے مجھے وحشت ہونے لگی۔ میں پریشان ہوتی کہ آخر کیا رویہ رکھوں... اگر صبح بالکنی میں جانا چھوڑ دیتی، شام کو

Marfat.com

نیچے آنے سے کتراتی اور دوپہر کے کھانے پر اسد سے پہلے ہی لوٹ آتی تو وہ آنکھوں میں دکھوں کی گہرائیاں بھر کر شکایت کرتا۔ اگر میں اس کی خوشی پوری کرتی تو دوسروں کی نگاہیں پراسرار ہونے لگتیں۔

کوئی چوتھے روز رات کو جب سونے سے پہلے میں ایک کتاب پڑھ رہی تھی، بابا میرے پاس آ کر بیٹھ گئے اور میں سمجھ گئی کہ آج وہ کوئی خاص بات کہنے والے ہیں۔ خاص بات کے کہنے کا انداز ہمیشہ یہی ہوتا۔ سونے سے پہلے جب ہر طرف خاموشی چھا جاتی، دن بھر کے سارے کام ختم ہو جاتے اور وہ دیکھتے کہ مجھے بھی اس وقت کوئی کام نہیں ہے، وہ ڈریسنگ گاؤن پہنے، بڑی آہستگی اور سنجیدگی سے میرے کمرے میں داخل ہوتے، پہلے کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے جن کا اصل بات سے کوئی تعلق نہ ہوتا پھر یکایک نہایت آہستگی سے اُس خاص بات کا آغاز کرتے۔ ان کے چہرے کے تاثرات اور آواز کی آہستگی سے اس بات کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا کیوں کہ بات جتنی اہم ہوتی ان کا لہجہ اتنا ہی گمبھیر اور آواز اتنی ہی نیچی ہوتی۔ چناں چہ آج بھی وہ میرے پاس بیٹھ کر چچا احمد کی باتیں کرنے لگے۔ میں نے انھیں بتایا کہ اتنے دن میں ہم نے کتنی پارٹیوں میں شرکت کی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے مگر ان کی آنکھوں سے پتا چلتا کہ وہ کہیں اور سوچ رہے ہیں۔ دفعتاً وہ بولے:

"تمھیں اسد پسند ہے؟"

میرے چہرے کو ایک دم سرخ ہوتے دیکھ کر شاید انھوں نے بھانپ لیا۔ دھیرے سے بولے:

"سوچ کر جواب دینا بیٹی، کوئی جلدی نہیں ہے..."

"میں نے اس وقت لفظِ پسند کو اور معنوں میں استعمال کیا ہے۔ پسند دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ہم چلتے پھرتے کسی آدمی یا کسی چیز کو پسند کر لیتے ہیں اور دوسرے لمحے بھول جاتے ہیں۔ مگر میری مراد یہاں اُس پسند سے ہے کہ ایک چیز کو پسند کر کے انسان زندگی بھر پسند کرتا رہے۔ ہر حالت میں، ایسی صورت میں بھی جب کہ وہ چیز آٹھ پہر اس کے سامنے ہو اور بہت دفعہ ایسا موقع آئے کہ اس کی پسند اور چاہت کا امتحان ہو...

سمجھتی ہو نا بیٹی، انسان میں یہ فطری کم زوری ہے کہ جو چیز اس کے پاس ہو

Marfat.com

اس کی وقعت اس کی نظر میں گر جاتی ہے۔ تمھیں معلوم ہے ایک زمانے میں مجھے پرانی چیزیں جمع کرنے کا شوق تھا، شوق نہیں جنون تھا۔ کئی چیزیں ایسی تھیں جن کو دیکھنے کے بعد میں کئی راتیں نہیں سویا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بغیر میری زندگی بے کار ہے۔ تمھیں معلوم ہے، تمھارے دادا کی مالی حالت بہت اچھی نہیں تھی مگر میں ہر طرح روپیہ بچا کر وہ چیز حاصل کرتا تھا اور اس وقت مجھے یہ محسوس ہوتا جیسے میں نے ایک دفعہ جنت کی سیر کر لی۔ مگر وقت گزر گیا... اور بہت سی باتیں زیادہ اہمیت اختیار کر گئیں۔ نادر چیزیں جمع کرنے کا وہ جنون صرف شوق بن کر رہ گیا اور رفتہ رفتہ شوق بھی مدھم ہوتا گیا۔ اب بھی میں اُس بے اختیار جذبے کا خیال کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ کم عمری میں تمام جذبے گہرے، ٹھوس اور کبھی نہ ختم ہونے والے معلوم ہوتے ہیں۔ اب وہ لگن اور عشق کسی صورت پیدا نہیں ہوسکتا۔ خیر، یہ تو عمر اور حالات کا تقاضا ہے لیکن حیرت یہ ہے کہ ان راتوں کی نیند حرام کر دینے والی اور پائی پائی جمع کر کے خریدی گئی چیز میں بھی اب کوئی کشش نہیں۔'' بابا دھیرے سے ہنسے۔ ان کی آنکھیں جیسے دور ماضی کی دھند کے پار کوئی چیز تلاش کر رہی تھیں... ''تمھیں ایک دفعہ کا قصہ سناتا ہوں۔ ایک دفعہ رات کو کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آیا ہی تھا کہ دفعتاً دروازے اور کھڑکیاں بجنے لگیں، چھت کی کڑیاں چیخنے لگیں۔ اسی وقت امی کی گھبرائی ہوئی آواز آئی... ظہیر باہر نکلو جلدی سے... اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ یہ زلزلے کا جھٹکا ہے اور ایک سیکنڈ میں دروازہ کھول کر میں نے جتنی چیزیں ہوسکیں، جھولی میں بھریں اور باہر لپکا... یہ واقعہ کئی سال تک خاندان میں مذاق بنا رہا کہ ایسے وقت جب مائیں اپنے بچوں کو بھول جاتی ہیں، ظہیر کو اپنی چیزیں نکالنی یاد رہیں۔ اب خود بھی اس واقعے کو یاد کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے لیکن ایک وقت ایسا ہی ہوتا ہے جب دل یہ نہیں مانتا کہ کبھی ایسا ہوگا جب ہم ان باتوں یا ان چیزوں کو بھول جائیں گے، اُس زمانے میں اگر کوئی مجھ سے کہتا کہ ایک وقت آئے گا جب تمھاری چیزیں کسی اسٹور میں پڑی سڑیں گی اور تم دس سال تک ان کو کھول کر بھی نہ دیکھو گے تو شاید میں غصے میں اس کا سر توڑ ڈالتا... مگر اب ایسا ہی ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ کسی دن ان چیزوں کو نکال کر دیکھوں گا۔ پھر یہ بھی بھول جاتا ہوں... مگر ان میں بھی چند چیزیں ایسی تھیں جو مجھے اب بھی اسی طرح عزیز ہیں جیسے پہلے تھیں۔ انھیں میں نے بڑی احتیاط سے

Marfat.com

اپنی لائبریری میں رکھ چھوڑا ہے۔ وہ چند نایاب کتابیں تھیں۔تم میرا مطلب سمجھ رہی ہونا۔'' بابا نے پوچھا... میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور وہ بولے،''میرا مقصد اس قسم کی پسند سے ہے جو عمر، حالات اور بدلتے وقت کا ساتھ دے سکے...تم کہو گی کہ شروع میں انسان یہ کیسے بتا سکتا ہے کہ یہ چاہت ساری عمر رہے گی جس طرح میں نہیں بتا سکتا تھا۔ ہاں، لیکن پھر بھی ایک قسم کی intuition انسان میں ہوتی ہے جو بتا سکتی ہے کہ کس چیز سے اس کی محبت ہمیشہ قائم رہے گی، ایسی چیز جو اس کی شخصیت سے اس حد تک مناسبت رکھتی ہو کہ وقت کے بدلتے دھارے اس کی پسند کا رخ نہیں موڑ سکتے، تاوقتیکہ اس کی شخصیت ہی بدل جائے اور شخصیت ایک ایسی چیز ہے جس میں کچھ ردّ و بدل ہو سکتے ہیں لیکن وہ سراسر بدل نہیں سکتی...!'' بابا نے پہلو بدلا اور پھر بولے،''میں اسی لیے تم سے ابھی جواب نہیں مانگتا۔تم اچھی طرح سوچ بچار کرلو۔ میں صرف تمھیں اپنی طرف سے اطمینان دلانا چاہتا ہوں تاکہ تم یہ سوچ کر پریشان نہ ہو کہ جانے بابا اسد کو پسند کریں گے یا نہیں۔ کراچی میں میرے ایک گہرے دوست اسد کے والدین کو اچھی طرح جانتے ہیں، وہاں ان کے اور بھی رشتے دار ہیں۔ اسد کی درخواست کے بعد میں معلومات حاصل کرنے ہی کراچی گیا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر سے پوچھ گچھ کرلی ہے، اچھا شریف گھرانا ہے۔ خاندان کی شرافت اور لڑکے کی سیرت ہی ہمیں دیکھنی چاہیے...روپے پیسے کو میں اہمیت نہیں دیتا اور مجھے معلوم ہے کہ تم بھی اس سے بے نیاز ہو...اس کے علاوہ میرا جو کچھ ہے، تمھارا ہی ہے... بہرحال میں مطمئن ہوں، اگر تمھارا ایسا کوئی خیال ہے...مگر اسے میری طرف سے کوئی اشارہ نہیں سمجھنا۔ میری طرف سے قطعی غیر جانب دار ہو کر سوچنا۔ ایک دن، دو دن، دس دن جب بھی تم فیصلہ کرلو، مجھے اطلاع دینا... میرے لکھنے کی میز کی دراز میں تمھیں ایک کاغذ اس مضمون کا ملے گا،''مجھے اسد سے شادی کرنا منظور ہے/ مجھے اسد سے شادی کرنا منظور نہیں ہے۔'' تم ان میں سے کوئی ایک کاٹ سکتی ہو...اچھا، شب بہ خیر۔'' بابا اٹھ کر چلے گئے۔ ان کی باتیں آہستہ آہستہ میرے ذہن پر دوبارہ ابھرنے لگیں۔ کسی چیز کو چاہنے کا مطلب ہے، اسے ہر حالت میں، ہر قیمت پر چاہنا۔ کیا واقعی دنیا میں اس قسم کی چاہت کا وجود ہے؟ اگر ہے تو کیا اسد سے میری چاہت اس حد تک دائمی ہو سکتی ہے۔ اسد میرے بچپن کا ساتھی نہیں ہے، ہم نے کئی سال اکٹھے نہیں گزارے ہیں۔ میں اسے بہت اچھی طرح

جاننے پہچاننے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ اس کے باوجود اس کی آمد پر میرا دل دھڑکتا ہے۔ اس کو دیکھ کر میرا دل پھول کی طرح کھل جاتا ہے۔ وہ نہیں ہوتا تو اس کے متعلق سوچتے رہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس کی گہری کالی آنکھوں کے پیغام پر لبیک کہنے پر مجبور ہوں، اسی وجہ سے میں نے اس کے ماضی کو معاف کردیا ہے۔ بوبی کے پیار کو کلیجے سے لگایا ہے۔ کیا یہ سچی چاہت نہیں ہے؟... شاید سچی چاہت اور دائمی محبت کا فیصلہ وقت ہی کرسکتا ہے، ہم نہیں کرسکتے۔ یہ سوچتے سوچتے جانے میں کب سوگئی۔

دوسرے دن اسد کے سامنے جانے سے مجھے شرم آرہی تھی۔ صبح میں بالکنی میں نہیں گئی۔ دوپہر کا کھانا بارہ بجے کھا کر میں پھر اوپر دبک گئی۔ شام کو میں روزمرہ سے دیر میں تیار ہونے لگی۔ ابھی میں غسل خانے میں تھی کہ روبینہ نے آکر دروازہ دھڑ دھڑایا۔

''ابھی آتی ہوں، تم بیٹھو...'' میں نے کہا۔ میں خوش تھی کہ روبینہ کے ساتھ گپیں مارتے یہ شام گزر جائے گی۔

''بھئی میں نیچے جاتی ہوں، تم وہیں آجانا۔''

میں نے تیار ہونے کے بعد ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ روبینہ اور اسد کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ روبینہ کا ایک ہاتھ کمر پر رکھا تھا، وہ اِٹھلا اِٹھلا کر بالکل اسی انداز میں باتیں کر رہی تھی جیسے میں نے اسے پارٹیوں میں باتیں کرتے دیکھا تھا۔ ہر جملہ ختم کرنے کے بعد وہ ایک ہلکا سا بناوٹی قہقہہ لگاتی، چاہے وہ بات کتنی ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو۔ مگر تعجب یہ ہے کہ گھر میں ہم لوگوں سے باتیں کرتے وقت اس کا لہجہ بالکل دوسرا ہوتا۔ یہ ہلکے ہلکے قہقہے اور بار بار اللہ اللہ کہنا وہ قطعی بھول جاتی...

میرے دیکھتے دیکھتے اسد کی نظریں تین چار بار اوپر اٹھیں۔ شاید روبینہ تو نہیں، البتہ اسد میرا انتظار کررہا تھا۔ میں نیچے جانا چاہتی تھی مگر میرے قدم جمے جا رہے تھے۔ اسد اکیلا ہوتا تو شاید میں اس کا سامنا کرلیتی مگر روبینہ کے ساتھ ہوتے ہوئے اس کے سامنے جانا بڑا مشکل کام تھا۔ گو روبینہ کو اب تک کچھ معلوم نہیں تھا لیکن اسد کے سامنے میری حالت دیکھ کر ہی وہ سب کچھ بھانپ جائے گی اور مستقل مجھے چھیڑے گی۔ ایک فتنہ ہے وہ لڑکی۔ آہستہ آہستہ چلتے وہ لان میں جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہاں سے بھی اسد نے ایک نظر اوپر ڈالی۔ میں ہمت باندھنے کی کوشش کرتی رہی۔ یہاں تک روبینہ کے

قہقہوں کی آواز تو نہیں آ رہی تھی مگر اس کے ہاتھ چلانے اور سر کو دائیں بائیں جھٹکے دینے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ باتوں میں مگن ہے۔ ذرا فاصلے پر بیٹھی ہوئی بیگم گراموفون اور میڈم ڈبل روٹی بار بار مڑ کر انھیں دیکھ رہی تھیں... بالآخر میں ایک کتاب لا کر خود کو اس میں غرق کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ذرا دیر بعد کسی کی سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آئی اور پھر روبینہ اندر داخل ہونے سے پہلے چلائی، ''تمھارا سنگھار ہی نہیں ہو چکا ابھی تک۔''

''سنگھار تو کب کا ہو چکا۔'' میں نے کہا۔

''تو یہاں بیٹھی کیا کھیاں مار رہی ہو... چلو نا باہر... توبہ، باہر سے آ کر کتنی گھٹن محسوس ہوتی ہے یہاں۔''

میں نے کھڑکی سے جھانک کر اطمینان کر لیا کہ اب اسد وہاں نہیں ہے اور روبینہ کے ساتھ نیچے چلی آئی۔

''ارے اللہ! وہ تمھارے اسد کہاں چلے گئے، ابھی تو یہاں تھے۔'' روبینہ نے قہقہہ لگا کر چاروں طرف نظر دوڑائی شاید وہ یہیں کہیں کھڑا ہو مگر اسد وہاں نہیں تھا۔ ''تمھارے اسد...'' میرا دل دھڑکنے لگا۔ تو کیا روبینہ کو معلوم ہو گیا۔ کیا اسد نے اسے کچھ بتایا ہے۔ اور پھر مجھے اپنی حماقت پر ہنسی آنے لگی۔ روبینہ کو تو ہر کسی کے نام کے ساتھ تمھارے لگا دینے کی عادت تھی۔

''ارے بھئی تم بھی خوب چیز ہو۔'' وہ مجھ سے مخاطب ہوئی، ''اُس دن تم نے کہہ دیا کہ بوبی اسد کا بیٹا ہے۔''

''تو؟'' میں نے منھ پھاڑ دیا۔

''تو تمھیں ابھی تک نہیں معلوم؟''

''کیا بھئی؟'' میں پریشان ہونے لگی۔

''یہی کہ بوبی ان کا بیٹا نہیں ہے، انھوں نے اسے گود لے رکھا ہے۔''

''اچھا! مجھے تو پتا نہیں تھا... تمھیں کیسے معلوم ہوا؟''

''ابھی اسد نے بتایا... وہ امریکا میں تھے، ایک دن کسی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ یہ اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ ماں تو غریب ان کے دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئی۔ باپ اسپتال میں جا کر مر گیا، بوبی بچ گیا۔ انھوں نے اس سلسلے میں بہت بھاگ دوڑ کی... اور آخر میں

Marfat.com

بوبی کو گود لے لیا۔ کیا یہاں سب بوبی کو اسد کا بیٹا سمجھتے ہیں؟''

''معلوم نہیں، میں نے تو کسی سے پوچھا نہیں۔'' میں نے کہا۔

''عجیب ہو تم بھی... اپنے برابر رہنے والے لوگوں سے بھی تمہیں دلچسپی نہیں۔ مجھے تو پہلے ہی دن شک ہوا تھا کہ بوبی اسد کا بیٹا نہیں ہوسکتا۔ میں نے تو صاف پوچھ لیا۔ اس میں بات ہی کون سی ہے۔'' وہ جانے کیا کیا کہتی رہی... میں اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ یہ سن کر بوبی اسد کا بیٹا نہیں، یعنی کوئی تیسری ہستی میرے اور اسد کے درمیان نہیں آئی اور یہ جان کر کہ کن حالات میں اسد نے بوبی کو اپنا بیٹا بنایا ہے، میرا دل بھر آیا... سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا، وہ اسد کے کیریکٹر کی گہرائی تھی۔ کوئی اور لڑکا ہوتا تو شاید سب سے پہلے یہ بتاتا کہ بوبی کو اس نے گود لے رکھا ہے لیکن اسد کے اس کے ساتھ برتاؤ نے اور اس کی خاموشی نے کسی پر نہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ اس کا سگا لڑکا نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں مجھے اپنی ہستی بے حد حقیر نظر آنے لگی۔ میں جو ایک فرضی تصور کے مارے راتوں کو کروٹیں بدلتی تھی۔ واقعی میری اُتھلی فطرت کے آگے اسد کی شخصیت کہیں عظیم تھی۔ شاید اس بارے میں اس کی خاموشی میرا امتحان ہی تھا کہ آیا میں بوبی سے محبت کرسکوں گی۔ ظاہرا طور پر اس امتحان میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن میرا دل ہی جانتا تھا کہ میں کس بری طرح ناکام ہوئی تھی۔ میرا ضمیر تنگ دلی اور تنگ نظری پر مجھے بری طرح ملامت کرتا رہا۔ مگر ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا جیسے روبینہ کی اس بات نے میرے دل پر رکھا ہوا کوئی بہت بھاری پتھر یک لخت اٹھا دیا، جس کی موجودگی کا مجھے اب تک صرف ہلکا سا احساس تھا لیکن اس کے ہٹ جانے کے بعد صحیح اندازہ ہوا کہ دراصل وہ کیا بوجھ تھا جس کے نیچے میں اب تک دبی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ خوشی سے ناچنے لگوں، ہر درخت کو گلے سے لگا لوں۔ سبزے پر لوٹوں، بچوں کی طرح کلیلیں کروں، بوبی کو گود میں لے کر دل بھر کر پیار کروں اور اسد... اسد کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اپنی کمینگی کا اقرار کروں اور کہوں۔ تم مجھ سے بہت، بہت بلند ہو۔

روبینہ اب بھی کچھ کہے جا رہی تھی۔ جانے کیا... میں اپنے خیالات سے اس وقت چونکی جب اسد کی آواز نزدیک ہی سنی۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''

Marfat.com

''ارے اللہ! ان جناب کو اب تک یہ پتا نہیں تھا کہ بوبی آپ کا بیٹا نہیں ہے۔ اب جو میں نے بتایا تو اُس وقت سے ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں۔'' روبینہ ہنسی۔

''اِنھوں نے مجھے کبھی بتایا ہی نہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ شاید میرے لہجے میں شکوہ تھا۔

''آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔'' اسد نے قطعی میرے لہجے کی نقل اتاری۔

میرا دل اتنا ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا جیسے پھول کی پنکھڑی۔ اب تک میں بابا کو قطعی جواب دیتے ہوئے ڈر رہی تھی لیکن اس واقعے نے مجھے جیسے کسی دوراہے سے منزل پر لا کھڑا کیا۔ اس واقعے میں اس کی گہری آنکھوں کا جادو نہیں تھا، دل کی گہرائی تھی۔ میں اتنا سمجھتی تھی کہ آج کے اوسط لڑکے کے لیے، دوسرے ملک کے کسی بے سہارا بچے کو گود لے کر اپنے بچے کی طرح پالنا اور اپنی محبوبہ تک سے اس کا ذکر نہ کرنا ممکن نہیں ہے... اس کے لیے ایک بے پایاں محبت کرنے والے دل اور متوازن ذہن کی ضرورت ہے۔ اگر ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے بھی میں اسد سے ہمیشہ محبت نہ کرسکوں تو اس میں میرا اپنا ہی قصور ہوسکتا ہے، اسد کا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجھ میں محبت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ بہت سے لوگ خدا سے بھی محبت نہیں کرسکتے، اس سے بھی خوش نہیں رہ سکتے، اس میں خدا کا نہیں، ان لوگوں کی اپنی فطرت کا قصور ہے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میرا دل اور بھی ہلکا ہوتا گیا۔ روح اور بھی بلند مقام معلوم ہونے لگی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ میرا آدرش اسد ہی تھا جو مجھے مل گیا ہے۔

''اللہ، بڑی دیر ہوگئی... اب میں کیسے جاؤں۔ ڈیڈی تو کلب سے چلے بھی گئے ہوں گے۔ میں ان سے کہہ کر آئی تھی، میں ذرا دیر صبیحی کے پاس بیٹھ کر واپس کلب آجاؤں۔'' روبینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''یہ سامنے تانگا اسٹینڈ ہے۔ تانگا منگوا دوں؟'' میں نے کہا۔

''ہائے اللہ! تانگے میں بیٹھنا تو زہر لگتا ہے مجھے... آپ نہ چھوڑ آئیں گے اپنی کار میں۔'' اس نے اسد سے کہا۔

''کیوں نہیں ضرور... آپ request تو کریں...'' اسد نے ہنس کر کہا۔

''آؤ صبیحی، تم بھی چلو نا ذرا...''

Marfat.com

''میں... بھئی میں بابا...''

''میں بابا سے پوچھے بغیر کسی کے ساتھ نہ جاؤں گی۔'' یہی کہہ رہی ہونا۔ روبینہ نے میرا جملہ پورا کر کے قہقہہ لگایا... ''اچھا چلیے میں اکیلی ہی چلتی ہوں۔ at my own risk and cost''۔ ہنستی ہوئی وہ دروازہ کھول کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

اسد نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ یک لخت اس کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا تھا۔ فراخ پیشانی پر پڑے ہوئے ہلکے سے بل سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید وہ ناراض ہوگیا ہے۔ اتنے دن میں مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ اسد کو غصہ بہت جلد اور شدید آتا ہے۔ وہ کار اسٹارٹ کر کے تیزی سے نکل گیا۔ روبینہ نے لمحے بھر کے لیے اپنی لمبی لمبی سرخ پالش سے جگمگاتی انگلیاں میری طرف دیکھ کر ہلائیں اور پھر گردن ٹیڑھی کر کے اسد سے کوئی بات کرنے لگی۔ میں تذبذب کے عالم میں سوچنے لگی۔ مجھے چلا جانا چاہیے تھا۔ اسد نے ضرور برا مانا ہوگا۔ ذرا سی دیر میں روبینہ کو چھوڑ کر ہم واپس آجاتے لیکن میں آج تک کسی کے ساتھ تنہا نہ گئی تھی۔ اس لیے میری ہمت نہ پڑی یا شاید میں بیگم گراموفون اور میڈم ڈبل روٹی کی نظروں اور پرمعنی مسکراہٹ سے ڈرتی تھی مگر روبینہ کو کسی کی پرواہ نہیں ہوئی۔ وہ کتنی مگن اور بے پرواہ ہستی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اس کی طرح نہیں ہوسکتی۔ میں جو کچھ ہوں خود کو بدل نہیں سکتی... مجھے میری آبا و اجداد سے ملی ہوئی خوبیوں اور کم زوریوں، ماحول اور حالات نے بنایا ہے۔ اگر یہ مختلف ہوتے تو ممکن ہے، میں بھی کوئی اور شخصیت ہوتی مگر اب جو کچھ بھی تھی، اس کو بدلنا تو میرے بس میں نہیں تھا... میں اسد کے ساتھ نہ گئی مگر اسی وقت اٹھ کر اندر آئی۔ بابا کی دراز کھول کر میں نے وہ پرچہ نکالا جو اس وقت میرے لیے نوشتۂ تقدیر سے کم نہ تھا۔ ''مجھے اسد سے شادی کرنا منظور نہیں ہے'' کو میں نے اس طرح کاٹا کہ اس کی سیاہ بیک گراؤنڈ میں ''مجھے اسد سے شادی کرنا منظور ہے'' بڑی خوب صورتی سے چمک اٹھا۔ بالکل اسی طرح جیسے سیاہ بالوں میں اسد کی فراخ پیشانی چمکتی ہے۔

''اور پھر ان کی شادی ہوگئی اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔''

یہ تھی وہ روئیداد جو صبا نے اپنی سہیلی عذرا کو شادی کی تفصیل مانگنے پر لکھی۔

''اور پھر ان کی شادی ہوگئی اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔'' عام طور پر کہانیوں کا

Marfat.com

اختتام یوں ہی ہوا کرتا تھا مگر یہ ان داستانوں کا اختتام ہے جن میں عام طور پر ایک بادشاہ ہوتا ہے اور اس کی ملکہ ہوتی ہے پھر یا تو اس کی سات شہزادیاں اور سات شہزادے ہوتے ہیں یا پھر کوئی بچہ نہیں ہوتا... اور جب بصد مشکل ہوتا ہے تو طرح طرح کی آفات میں گھر کر جنوں کے قبضے میں گرفتار شہزادی کو چھڑا کر لاتا ہے، سات شہزادوں والی کہانی میں ہمیشہ سب سے چھوٹا لڑکا یہ کام انجام دیتا ہے اور پھر سب ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔ مگر وہ بادشاہ زادہ اور بادشاہ زادی نہیں تھے... اور مرورِ ایام جو آج کل جنوں کی جگہ سنبھالے ہوئے ہیں، شادی کے بعد لوگوں کی طرف سے بے نیاز نہیں ہوجاتے بلکہ ان کا چیلنج کچھ اور بڑھ جاتا ہے جیسے وہ کہہ رہے ہوں:

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اور عشق کے یہ امتحان تھے جن میں سے شادی کے بعد اسد اور صبا کو گزرنا پڑا۔

OOO

Marfat.com

۷

اٹک کی گولائیوں سے گزر کر وہ ایک چھوٹے سے گاؤں سے گزرتے ہوئے ایک خوب صورت ریسٹ ہاؤس میں جا ٹھہرے۔ دریائے کابل کے کنارے بنا ہوا یہ کنڈ، ریسٹ ہاؤس تھا۔ اس کے پھاٹک پرنفاست اور خوب صورتی سے جمائے ہوئے گول گول پتھروں کے تکون تھے۔ عمدہ باغ تھا جس کی روشیں پورے درخت کی گول گول تھلیوں کو زمین میں گاڑ کر بنائی گئی تھیں۔ ان کے درمیان اُگی ہوئی گھاس اس کو اور آرٹسٹک بنا رہی تھی۔ اسد نے عمارت کے پیچھے درختوں کے پاس کار کھڑی کی اور وہاں کے چوکیدار کو مطلع کیا۔ سروے کیمپ کے ملازمین ان کا سامان لینے آئے ہوئے تھے۔ سامان لے کر چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں کابل کے اس پار نیشنل پارک ریسٹ ہاؤس کے لیے روانہ ہوگئے جسے اسد نے ایک ہفتے کے لیے مخصوص کرالیا تھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس دریائے کابل اور دریائے سندھ کے درمیان قطعۂ زمین پر تھا۔ دونوں دریاؤں کے منظر مختلف مگر قابلِ دید تھے۔ دریائے کابل کی طرف شدید ڈھلائی کے بعد بہتا ہوا تیز دریا اور پانی سے ابھری ہوئی نوکیلی چٹانیں تھیں۔ دریائے سندھ کا پانی نسبتاً صاف شفاف اور پرسکون تھا۔ دور تک ریت ہی ریت تھی۔ ریت میں کہیں کہیں بڑے بڑے پتھر یا چٹانیں نکلی ہوئی تھیں۔ ریسٹ ہاؤس سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ان دونوں دریاؤں کی موجیں ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر ایک دوسرے میں مدغم ہوجاتی تھیں۔ نوکر چلے گئے، اسد اور صبا چائے اور اس کنارے کا لطف اٹھانے کے لیے یہیں رہ گئے۔ باہر سبز چھتری تلے انھوں نے چائے پی جہاں سے دریا ابھری ہوئی چٹانیں اور اس کے پار وہ قطعۂ زمین بھی نظر آتا تھا جہاں انھیں

Marfat.com

جانا تھا۔ چائے پی کر اسد نے کہا۔

''یہیں سے سیدھے اس جگہ تک نکل جاتے ہیں جہاں فیری (Ferry) کھڑی ہے۔ سڑک کا راستہ لمبا رہے گا۔'' صبا بھی اپنے بھاری کپڑوں میں سڑک پار جاتے ہوئے شرما رہی تھی۔ جب وہ ریسٹ ہاؤس کی حدود سے نکل کر پتلی سی پگڈنڈی پر روانہ ہوئے جس کے دائیں طرف پہاڑ تھا اور بائیں طرف دریا تک زبردست ڈھلان اور کھڈ، اس وقت دریا کے پار درختوں میں بڑا سا چاند جھانک رہا تھا۔ اس پگڈنڈی پر دو آدمی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔ اس لیے اسد نے صبا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اسے آگے چلنے کا اشارہ کیا اور تب اسے احساس ہوا کہ اس نے نئی نویلی دلہن کو اس راستے لا کر سخت غلطی کی ہے۔ ایک ہاتھ سے سرخ غرارہ سمیٹے وہ دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ اس سنسان شام، ابھرتے چاند کی روشنی میں سرخ کپڑوں میں لپٹی پہلی رات کی دلہن پیدل چلی جا رہی تھی جیسے کوئی منزل سے ناآشنا مسافر اپنے نامعلوم سفر پر رواں دواں ہو۔ اسد کی برات دلہن کی رخصتی کے بعد راولپنڈی سے واپس لاہور لوٹ گئی تھی اور اسد نے سب کی ضد کے باوجود ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے چپکے چپکے پہلے سے سارا انتظام کر لیا تھا اور اسی دن سے وہ دونوں ہنی مون کے لیے نکل گئے تھے۔ اوپر نیچے چکر کاٹ کر وہ فیری تک پہنچے فیری کا وقت ختم ہو چکا تھا اور ملاح اپنے گھر چلے گئے تھے۔ وہ دونوں دریا کے کنارے کھڑے رہے۔ ڈرائیور اور نوکر ملاح کی تلاش میں نزدیک کے گاؤں میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس آ گئے۔ ملاح دوسرے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ڈرائیور اور پٹھان نوکر میں صلاح ہوئی اور انھوں نے پیش کش کی کہ وہ خود اس فیری کو پار لے جائیں گے۔ یہاں دریا کا بہاؤ بہت تیز ہے، اس لیے پی ڈبلیو ڈی کی طرف سے اس فیری کا انتظام ہے۔ دریا کے اس سرے پر اور اس سرے پر لوہے کے کھمبوں سے بندھا ہوا تاروں کا بنا ہوا ایک موٹا رسّا ہے۔ فیری ایک اور نسبتاً پتلے تار کے ذریعے اس تار سے بندھی رہتی ہے۔ لوہے کا ایک پہیہ تاروں کے رستے پر پھسلتا ہے جس سے یہ فیری خود بہ خود آگے بڑھتی ہے۔ ملاح صرف لمبے لمبے بانسوں سے اس کا رخ درست رکھتے ہیں۔

''تم فیری کو اچھی طرح قابو میں رکھ بھی سکتے ہو؟'' اسد نے پوچھا۔

''بیل کُل... اَم بہت دفعے اس کو اُدر لے جاتا ہے۔'' پٹھان نوکر نے کہا۔

Marfat.com

''اچھا تو چلو...'' اسد نے صبا کا ہاتھ تھاما اور لکڑی کے تختوں پر چڑھ کر دونوں فیری تک جا پہنچے۔ دو جہازی قسم کی بھاری بھاری کشتیاں آپس میں ایک چوڑے سے تختے کے ذریعے جڑی ہوئی تھیں جو ان دونوں کے درمیان میں تھا۔ اس طرح دونوں کشتیاں چار چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گئی تھیں۔ تختے کے دونوں طرف لمبائی میں لکڑی کا معمولی سا جنگلا بنا ہوا تھا اور تختے پر سوکھی گھاس پڑی ہوئی تھی۔ یہاں پر کھڑے ہو کر کسانوں اور مزدوروں کے گدھے اور دوسرے جانور پار اترتے تھے۔ کشتیوں کے آخری نصف حصوں پر چھت پڑی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک پر ہتوں والی ایک چھوٹی سی بینچ تھی جس پر بہ مشکل دو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ وہ دونوں اس بینچ پر بیٹھ گئے۔ اسد نے صبا کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں جلد جلد اوپر آتے ہوئے چاند کو دیکھنے لگے۔ دونوں آدمیوں نے بانس سنبھال لیے اور دیکھتے ہی دیکھتے فیری کنارے سے دور ہو گئی۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ وہ دریا کے سینے پر خود کو بہتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ دوسرے کنارے کے درخت اور لمبی لمبی گھاس، اودے اور سرخ بادلوں کو پیچھے چھوڑ کر بلند درختوں پر سے آنکھ مچولی کرتا ہوا چاند تھا۔ جذبات کے بہتے ہوئے دھارے تھے اور ایک نظر خوب صورت منظر کو دیکھنے کے بعد ایک دوسرے کی آنکھوں میں گم ہو جانے کی کوشش میں مصروف وہ دونوں تھے۔

کئی منٹ اسی طرح گزر گئے۔ آخر اسد بولا ''سب لوگ میرے یہاں آنے کے خلاف تھے۔ کہتے تھے شادی کی رات دلہن کو غیر جگہ لے جانے کی کیا ضرورت ہے مگر میں نے کسی کی پروا نہیں کی۔ میں ان پرانے ڈھکوسلوں پر یقین نہیں رکھتا۔'' وہ ہنسا، صبا خاموش تھی۔ ''میں چاہتا تھا کہ شور، ہنگامے اور ہلچل سے دور ہم کسی سکون کی جگہ ہوں جہاں تمہارا دل پسند چاند ہو، میں ہوں اور تم ہو اور کوئی نہ ہو۔ کیوں اچھا کیا نہ میں نے؟''

صبا نے صرف گردن کو ہلکی سی جنبش دی جس سے اس کے کانوں کے بڑے بڑے مگر بہت دیر تک ہلتے رہے۔ مگر اس کے چہرے سے یہ اندازہ لگانا کہ واقعی اس نے اس بات کو پسند کیا ہے، مشکل تھا۔

اب تم وہ ریسٹ ہاؤس دیکھنا، بڑا خوب صورت ہے۔ یہ بڑے بڑے گلاب اور گلِ داؤدی ہیں۔ چوکیدار اور مالی نے مل کر اسے ضرور سجایا ہوگا۔ کھانا اور کافی تیار ہوگی۔'' اور اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا صرف شرارت سے مسکرا دیا... دفعتاً سکون سے بہتی ہوئی

Marfat.com

فیری کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' اسد نے گھبرا کر ملازموں سے پوچھا۔ ایک لمحے خاموشی رہی۔ پھر پٹھان نوکر مجرمانہ لہجے میں بولا، ''کوئی بات نئیں اے صاحب۔'' پھر وہ دونوں سٹر پٹر کرتے اِدھر اُدھر بھاگتے رہے اور جلد ہی اسد اور صبا کو معلوم ہوگیا کہ فیری بیچ دریا میں کھڑی ہے۔

''کیا ہوا بتاتے کیوں نہیں۔'' اسد نے قدرے بگڑ کر پوچھا۔

''پتا نہیں جی۔ فیری آگے نہیں چل رہی۔ ڈرائیور نے کہا۔

''پھنسا دی ہوگی تم لوگوں نے۔''

''نہیں جی، پھنسا تو نہیں اے شاید کوئی چیز ٹوٹ گیا۔'' پٹھان نوکر نے کہا۔

''ٹوٹ گیا!... تم اناڑی لوگ، میں پہلے ہی کہہ رہا تھا، یہ تمھارے بس کا نہیں۔''

وہ لپک کر گیا اور دیر تک ان پر برستا رہا۔

جوں جوں اس کو واقعے کی سنجیدگی اور سنگینی کا احساس ہوتا اس کا غصہ بڑھتا جاتا... جلد ہی وہ آپے سے باہر ہوگیا۔ صبا دور بیٹھی کانپ رہی تھی۔ وہ اسد کو دیکھ نہیں سکتی تھی مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس وقت وہ کس حالت میں ہوگا۔ ڈرائیور خاموش بت بنا کھڑا تھا لیکن پٹھان نوکر بغیر کوئی اثر لیے بڑے مطمئن لہجے میں کہہ رہا تھا، ''امارا کوئی کصور (قصور) نہیں اے۔ اے تو ٹوٹتا رہتا اے۔ پرانا چیز اے، گس (گھس) جاتا ہے، کوئی دیکھ بال ویک بال کرتا نئیں اے۔''

''خاموش، بکواس بند کرو...'' وہ گرجا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر وہ بولا، ''ذرا زور لگا کر دیکھو شاید آگے چلے۔''

تینوں مرد مل کر بہت دیر تک فیری کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے مگر وہ مٹھس بیل کی طرح اپنی جگہ جمی رہی۔ تیز دھارے کے عین درمیان پہاڑ اور ہوا کے زور سے اتنی بھاری ہونے کے باوجود وہ ہل رہی تھی۔ چاند اوپر آ کر دریا میں اپنا عکس دیکھنے کو بے تاب نظر آتا تھا۔ اسد غصے اور بے چارگی میں کھول رہا تھا اور دونوں ملازم خود کو بے قصور ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

ایسے میں خاموش بیٹھی صبا کے سامنے پہلے اپنی ماں کا چہرہ ابھرا۔ پھر یکے بعد

Marfat.com

دیگرے چھوٹے بھائی بہن نظر آنے لگے۔ شادی کے ان پچھلے دنوں میں جانے کتنی بار بیٹھے بیٹھے یہ چہرے اس کے ذہن میں آکر جھانکنے لگتے اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوجاتیں۔ ابھی ابھی ان آنسوؤں میں بہت عرصے کی بھولی بسری ایک تصویر ابھری۔ یہ شاہدہ باجی تھی۔ ہنس مکھ اور شریر سی باجی۔ اپنے بہن بھائیوں کے بعد اس نے سب سے زیادہ انھیں کو چاہا تھا۔ بچپن سے وہ اس کا آئیڈیل بن گئی تھیں اور یہ شاہدہ باجی ہی تھیں جنھوں نے سب سے پہلے اسے موت، دائمی جدائی کا مطلب سمجھایا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے شادی کے نام پر چھیڑا کرتی تھیں اور اتنی چھوٹی ہونے پر بھی وہ بیاہ کے نام پر بل کھایا کرتی تھی۔ اس وقت وہ کیا سمجھتی تھی ان باتوں کو... مگر آج جب اس کا بیاہ ہوا تو اس کی ماں اور بہن بھائی اور شاہدہ باجی سب منزلوں دور جا چکے تھے اور وہ اپنے دولھا کے ساتھ پانی کے سینے پر تنہا سرخ کپڑوں کی گٹھڑی بنی خاموش بیٹھی اس چاند کی طرف دیکھ رہی تھی جو اس کے بچپن میں بھی اتنا ہی بڑا تھا اور اتنا ہی چمکتا تھا۔

دفعتاً کسی کے زور سے پکارنے کی آواز سن کر وہ اچھل پڑی۔ دونوں ملازم باری باری کسی کو پکار رہے تھے۔ ان کی پکار پہاڑیوں سے ٹکرا کر واپس لوٹ آتی۔ خاصی دیر بعد کنارے پر سے کسی کا جواب آیا۔ یہاں سے چیخ چیخ کر سارا ماجرہ انھیں سنایا گیا۔ انھوں نے کہا کہ اچھا ہم آتے ہیں۔ چھوٹی سی ایک کشتی دور ریسٹ ہاؤس کے پاس لے جاکر انھوں نے دریا میں ڈالی۔ پانی کا بہاؤ آج اتنا تیز تھا کہ جہاں سے فیری چلتی تھی، وہاں سے اگر وہ لوگ کشتی لے کر چلتے تو وہ میلوں آگے جاکر دوسرے کنارے پر لگتی۔ کچھ ہی دور آکر وہ واپس لوٹ گئے۔ اور انھوں نے مطلع کیا کہ اس وقت دریا کا دھارا بہت تیز ہے۔ ورسک ڈیم والوں نے پانی چھوڑ رکھا ہے، اس صورت میں چھوٹی کشتیاں کسی صورت فیری تک نہیں پہنچ سکتیں، نہ فیری کو کھینچ کر پار لگایا جاسکتا ہے، نہ اس وقت وہ ٹھیک ہوسکتی ہے۔ انھیں صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔ اس خبر نے اسد کے ہوش وحواس پر بجلی گرا دی۔ اسی پر بس نہیں، ملاح نے اطلاع دی کہ ایک طرف سے فیری کا تلا تھوڑا سا ٹوٹا ہوا ہے جہاں سے پانی اندر آتا ہے۔ اس پانی کو خارج کرتے رہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک ٹین فیری میں پڑا ہوا ہے مگر جب اُس ٹین کی تلاش کی گئی تو وہ کہیں بھی نہ تھا۔ شاید کوئی ضرورت مند اسے بھی اٹھا لے گیا تھا۔ پانی خارج کرنے کے لیے صرف ان کے چلو ہی تھے۔ ملازموں

Marfat.com

پر خوب برس کر بھناتا ہوا وہ صبا کے پاس آیا اور منہ بنا کر کھڑا ہوگیا۔

''کیا ہوا؟'' آخر صبا نے پوچھا۔ وہ صورتِ حال سے بہت حد تک لاعلم تھی۔

''کہتے ہیں رات کو یہیں رہنا ہوگا... میری سمجھ میں نہیں آتا۔ رات کو یہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔ نہ گرم کپڑے ہیں، نہ کھانا، نہ پانی۔''

''مجھے تو بھوک نہیں ہے۔'' اسد کو غم وغصے سے نڈھال دیکھ کر ڈھارس دینے کے لیے وہ بولی۔ اسد نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بینچ پر بیٹھ گیا، دونوں ملازم جنگلے کے ابھرے ہوئے ڈنڈے پکڑے خاموش صورت تصویر کھڑے تھے۔ چاند کچھ اور اوپر آگیا تھا اور ان کی فیری اس خوب صورت پس منظر میں کسی آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویر سی نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنا سرخ ملائم اسٹول اچھی طرح لپیٹا اور اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ''شاید اس چھت کے نیچے بیٹھنے کی جگہ ہو۔'' اس نے کہا۔ اسد بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نیچے جھانکنے لگے۔ یہاں ایک ایک فٹ کے فاصلے پر موٹے موٹے شہتیر لگے ہوئے تھے جن کے درمیان گھاس پھونس اور بارش کا میلا پانی بھرا ہوا تھا۔ یہ غالباً سامان رکھنے کی جگہ تھی۔ چھت کے نیچے بھی یہ شہتیر تھے مگر کشتی کی اٹھی ہوئی اور نوک دار شکل کی وجہ سے یہاں بیٹھنا ممکن تو تھا، آرام دہ کسی طرح نہیں تھا۔

''یہاں بیٹھنے کی جگہ کہاں ہے۔ دل چاہتا ہے پانی میں چھلانگ لگا دوں۔''

''مجھے یہاں چھوڑ کر؟'' صبا نے اتنی نرمی اور شیرینی سے کہا کہ وہ شرمندہ ہوگیا اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا، ''میں بتا نہیں سکتا، مجھے کتنا افسوس ہے۔ کاش میں تمھیں یہاں نہ لاتا۔ بتاؤ اب کیا ہوگا۔ رات بھر بھوکے پیاسے سردی میں یہاں کیسے رہیں گے؟''

''مگر جب اور کچھ نہیں ہوسکتا تو رہنا ہی ہوگا۔ یہ بنچ تو نیچے ڈالنی ممکن نہیں۔ پھر شہتیروں پر ہی بیٹھ جائیں گے۔'' صبا نے دھیرے سے کہا۔

''یہی کرنا ہوگا...'' اسد نے ٹھنڈا سانس بھرا، ''میں ذرا نوکروں کو دیکھوں۔''

اس نے جا کر دیکھا، فیری کے دوسری طرف کے ایک حصے میں ٹخنوں تک پانی بھر چکا تھا۔ دونوں ملازم اپنی اپنی عقل کے مطابق پانی کو روکنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اسد نے گھوم پھر کر فیری کے چاروں حصوں کو بہ غور دیکھا۔ ایک جگہ پرانا سا ایک گھڑا پڑا تھا۔ اسد نے ڈرائیور کو آواز دی۔

Marfat.com

''اسے توڑ ڈالو اور اس سے پانی نکالو۔ دیکھو چوکس رہنا، ایسا نہ ہو کہ تم لوگ سو جاؤ اور سب دریا کی تہ میں پہنچ جائیں۔''

''اے کیسے ہوسکتا اے۔'' پٹھان نوکر دور سے بولا، ''ام رات بھر اکیلا بیٹھے گا اور پانی نکالے گا۔''

دوسرے کنارے پر ان کے اب تک نہ پہنچنے پر پریشان ہوکر مالی اور چوکیدار لالٹین لے کر آگئے تھے۔ انھیں صورتِ حالات بتائی گئی اور صبح سویرے آنے کا کہہ کر دوبارہ بھیج دیا۔ اب اسد واپس آگیا۔ پہلے خو اندر کودا پھر صبا کو بھی اندر اتار لیا اور دونوں نیچے چھت کے ٹیڑھے شہتیروں پر یوں چپ چاپ بیٹھ گئے، جیسے کسی کو قتل کرکے فرار ہورہے ہوں۔ شریر چاند اب جھانک کر ان دونوں کو دیکھنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا تھا۔ دریا ان کے نیچے شائیں شائیں کر رہا تھا۔ جوں جوں رات بڑھ رہی تھی، اس کے زور اور شور میں اضافہ ہو رہا تھا اور فیری کے جھٹکے تیز ہوتے جارہے تھے۔

''مجھے بہت... بے حد افسوس ہے۔'' ایک مرتبہ پھر اسد نے کہا۔

''اس میں تمھارا کیا قصور ہے...اور پھر زندگی میں ایسے حادثات ہوتے ہی رہتے ہیں۔'' صبا نے کہا۔

''اچھا... آؤ... یہاں لیٹ جاؤ۔'' اس نے صبا کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور وہ اپنے جسم کو بیلنس کرتی شہتیر پر لمبی لمبی لیٹ گئی۔ اسد نے اپنی جیب تھپتھپائی... سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر پاکر وہ اتنا خوش ہوا جیسے کسی کو مفلسی کی آخری حد پر پہنچ کر کوئی ہیرا مل جائے۔ سگریٹ سلگا کر وہ آہستہ آہستہ کش لگانے لگا... پھر وہ صبا کے اوپر پیار سے جھک گیا اور بولا، ''صبی، تم تھوڑی دیر سو جاؤ، اس طرح نیند آجائے گی؟''

''اُونہہ ہوں۔ میں اس آواز میں سو نہیں سکتی۔ دیکھو تو کتنا شور ہے، دل دہلا جارہا ہے اور یہ جھٹکے۔ معلوم ہوتا ہے بس اب فیری تار سے الگ ہونے ہی والی ہے۔''

''نہیں... ایسا کچھ نہیں ہوگا... صبح ہوگی اور لوگ آجائیں گے اور فیری کو رسے سے باندھ کر کنارے تک کھینچ لیں گے۔ پھر ہم ہوں گے اور ہمارا ریسٹ ہاؤس۔ گرم گرم بستر اور گرم گرم چائے۔''

صبا ہنسی... ''گرم بستر اور گرم چائے کا تصور کتنا پیارا لگ رہا ہے اس وقت۔

Marfat.com

معلوم ہوتا ہے جیسے ساری عمر کبھی یہ دونوں چیزیں ہمیں نصیب ہی نہ ہوئی ہوں۔"

"واقعی بالکل یوں ہی لگ رہا ہے۔" اسد بولا...

"مجھے ان غریبوں کا خیال آتا ہے جنھیں واقعی اس قسم کی آسائشیں کبھی میسر نہیں آتیں۔ انھیں کیسا لگتا ہوگا۔"

"آرام اور آسائشوں کی کمی وہی محسوس کرسکتے ہیں جنھوں نے ایک مرتبہ اس کا مزہ چکھا ہے۔ دوسرے صحیح طور پر اس کا تصور نہیں کرسکتے۔"

صبا خاموش ہوگئی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

"یہ سگریٹ جو میری جیب میں چلے آئے۔ انھوں نے مجھے بڑی ڈھارس دی۔ اس کا جلتا ہوا کنارہ گرمی کا احساس دے رہا ہے اور اس کا کش آسودگی کا۔ تم پیو گی؟"

"اونھ ہوں... جب میں آنکھیں بند کرتی ہوں اور تم کش لیتے ہو تو بند آنکھوں میں اس کا عکس شعلے کی طرح کوند جاتا ہے، جیسے بجلی چمکی ہو۔"

"شکر ہے صبی کہ اس وقت بجلی نہیں چمک رہی، مطلع صاف ہے۔ اگر بارش ہو رہی ہوتی تو کیا ہوتا۔"

"سارا پانی اندر آتا اور ہم بھیگ جاتے۔" صبا نے کہا۔

"اور ساری رات بھیگنے کا کوئی نہ کوئی اثر بھی ضرور ہوتا۔ خدانا خواستہ اگر تمھیں کچھ ہو جاتا تو میں خود کو ساری عمر معاف نہ کرتا..."

"ایسی باتیں نہ کرو اسد۔ بارش ہوتی تو بھی ہم جھیل لیتے۔ انسان کٹھن سے کٹھن مشکلات سہہ سکتا ہے۔"

"صبی میں سمجھتا تھا، تم بہت جذباتی اور کم زور دل کی ہو مگر تم تو بہت بہادر ہو۔"

"جب وقت پڑتا ہے تو میں بہادر بن جاتی ہوں۔" صبا نے اداسی سے کہا۔

"سنا ہے تم نے زندگی میں بہت بڑے بڑے حادثے دیکھے ہیں؟"

"بہت بڑے۔" صبا نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا... مجھے اپنی پچھلی زندگی کے واقعات سناؤ۔ اسی طرح کچھ وقت کٹے۔"

"کیا سناؤں؟"

''پورے حالات... اپنی پیدائش سے لے کر آج تک کے۔''

''مگر مجھے تو اپنی پیدائش یاد نہیں۔''

اسد ہنس پڑا۔ میرا مطلب ہے جب سے تمھیں یاد ہیں تب سے۔ تمھاری یادداشت میں تمھاری زندگی کا سب سے پہلا واقعہ کون سا ہے۔''

''ٹھہرو، سوچ لوں۔'' صبا آنکھیں بند کر کے سوچنے لگی۔

○○○

Marfat.com

۸

جب صبا زندگی کا سب سے پہلا واقعہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی تو کئی یادیں اس طرح گڈمڈ ہوگئیں کہ پہلے اور بعد کا پتا نہ چلتا تھا۔ ذہن میں یادیں تو رہ جاتی ہیں مگر ان کے ساتھ کیلنڈر چپکا نہیں رہ جاتا ہے۔ بچپن کی بعض باتیں ذہن کے گودے میں یوں دھنس جاتی ہیں کہ نکالے نہیں نکلتیں، وہ پرانی باتیں یوں معلوم ہوتی ہیں جیسے کل بیتی ہوں اور یوں سیکڑوں، ہزاروں واقعات حافظے پر سے لڑھک کر فراموشی کی نہ جانے کون سی بھول بھلیوں میں جا گرتے ہیں۔ جب وہ اپنی زندگی کی سب سے پہلی یاد پکڑنے کی کوشش کرتی تو اسے شہرۂ آفاق فلم ''پکار'' کی نئی کاپی کا وہ سین یاد آجاتا جس میں شیلا جھولے پر بیٹھی گا رہی ہے، ''گیت سنو وہ گیت سیاں۔'' لمبے منہ اور چپکے بالوں والی واہیات سی شیلا اسے اتنی خوب صورت لگی تھی کہ حد نہیں۔ یہ اس کا پہلا پکچر تھا۔ پکچر کیا تھا مداری کا تماشا تھا کہ ایک سے ایک نئی اور دلچسپ چیز نکلتی ہی چلی آتی تھی۔ یہ یاد اتنی اہم کیوں تھی، شاید اس لیے کہ جو دوسری یاد اس پہلی یاد کے ساتھ گڈمڈ ہوئی تھی، وہ بھی پکچر سے متعلق کردی گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو آدھی رات کو گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی اور وہ اپنی اماں ابا کے کمرے کے بجائے جس میں یہ لانبی قطار پلنگوں کی تھی، اوپر کوٹھے پر خالہ جانوں کے کمرے میں تھی۔ یہ اس کے نانا کا بڑا سا دومنزلہ مکان تھا... جب اس نے امی کے پاس جانے کی ضد کی تو ایک خالہ بولیں، ''ہش ہش، یہاں تو ابھی پکچر دکھایا جائے گا، اس لیے تو ہم لائے ہیں تمھیں۔''

دروازہ کھلتا رہا، بند ہوتا رہا، کوئی آتا رہا کوئی جاتا رہا۔ وہ پکچر کے انتظار میں

Marfat.com

جاگتی رہی۔ جب انتظار کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تو وہ پوچھ بیٹھتی۔

''خالہ جان، کب ہوگا۔''

''لو بس ابھی...'' اور وہ سب مع باجی کے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے لگتیں تو وہ سمجھ جاتی کہ پکچر وکچر کچھ نہیں ہے، ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ یہ خالہ جانیں اور باجی اس درجے کی مکار تھیں کہ حد نہیں کھانے پینے میں، اٹھنے بیٹھنے میں اور آنے جانے میں ہر وقت یہ بچوں کو جُل دیتی رہتی تھیں۔ جب پچھلی دفعہ یہ سب پکچر گئیں تو ہم سب بچوں کو ددھیال بھیج دیا۔ جب نینی تال کا پروگرام بنا تو ہم بچوں کو پکچر کا لالچ دیا۔ واپس جو آئے تو سب کی سب غائب۔

اب لے کے تینوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور تکیے کے نیچے سے نیلے رنگ کے کاغذ کے ڈھیر سارے پرزے نکالے گئے اور انھیں جوڑ جوڑ کر پڑھنے کی کوشش کی جانے لگی۔ جب نانی، بڑی ممانی یا پھوپھی میں سے کوئی آواز دیتا تو جھٹ یہ پرزے پھر تکیے کے نیچے چلے جاتے اور ان کے جانے کے بعد دروازہ بند کر کے پھر از سرِ نو جوڑے جانے لگتے۔ اس کھیل کو دیکھتے دیکھتے وہ نہ جانے کب سو گئی۔ صبح جب اٹھی تو کمرہ خالی تھا، چڑیاں اڑ گئی تھیں۔ وہ کوٹھے پر سے اتر کر نیچے سیدھی اپنے کمرے میں پہنچی۔ امی سینے تک چادر ڈھانپے سیدھی سپاٹ سو رہی تھیں، ان کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور ان کے پاس ہی دائیں پہلو ایک سیاہ فام بندر کا کھانکڑا ایسا بچہ مٹھیاں بھینچے سو رہا تھا۔ خالہ جان کھڑی الماری میں کھٹر پٹر کر رہی تھیں۔

''یہ کون ہے، خالہ جان؟'' اس نے پوچھا۔

''وہی، رات کی پکچر والا۔'' وہ باجی کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ باجی بھی ہنسنے لگیں یعنی کہ بالکل ہی احمق بنا کر رکھ دیا تھا ان لوگوں نے، کوئی بات ڈھنگ کی بتاتی ہی نہیں تھیں۔ وہ غصے میں بستر پر اوندھ گئی۔

''چلو اٹھو، منھ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرو۔'' باجی نے مزے سے اس کے بڑے بڑے جھونٹے پکڑ کر اٹھا دیا۔ اس کے لمبے لمبے بال زیادہ تر اسی کام آتے تھے۔

دو چار دفعہ منجن لگی انگلیاں دانتوں پر پھیر، دو تین چھپاکے مار، سارا میل تولیے سے صاف کر وہ باورچی خانے میں پیڑھی پر جا بیٹھی۔ منجھلی ممانی کا بیٹا چھکو یہ لمبے لمبے آنسو

بہا رہا تھا۔ اُوں، اُوں، اُوں... ایک ہی سُر میں نکلنے والی یہ آواز باورچی خانے میں یوں رَس بس گئی تھی جیسے پاس کی اُپلوں کی کوٹھڑی سے آنے والی جھینگروں کی آواز ہو۔

''ارے تو میں کہاں سے لاؤں تیرا قدح، نہیں ملتا تو۔'' ممانی کو غصہ آچلا تھا۔ دفعتاً وہ لہجہ بدل کر بولیں۔ ''لے اس چینی کے پیالے میں پی لے، دیکھ کیسا اچھا میرا منا...''

''اُوں، اُوں... میرا قدح۔''

''اچھا، ٹھہر تو جا، ابھی جلتی لکڑی سے تیری ٹانگ توڑتی ہوں۔ ڈھینگ کا ڈھینگ ہوگیا اور ضد کرتا ہے ننھے بچے کی طرح، اس کو دیکھ تجھ سے چھوٹی ہے، کیسی خود تیار ہو کے آتی ہے روز، چپ چاپ ناشتا کر کے چلی جاتی ہے۔ نہ اسے بھرا قدح چائے چاہیے نہ کچھ... بول پیتا ہے پیالے میں کہ نہیں؟''

''نہیں... اُوں، اُوں۔''

اب کے ممانی واقعی جلتی لکڑی لے کر اٹھی ہی تھیں کہ خالہ جان تانبے کا یہ بڑا سا کٹورا لے کر آگئیں۔ ''یہ مل گیا اس کا قدح آپا کے کمرے میں رات کو کسی کام سے چلا گیا۔'' ممانی نے انگاروں پر لوٹتی پتیلی میں سے دوپٹے کی چٹکی پکڑ کر چائے اونڈھائی اور بھرا قدح دوسری پیڑھی کے آگے سرکا کر اس کی خالی پلیٹ میں پراٹھا ڈال کر اس کے پاس رکھ دیا۔ چھکو ایک دم پیڑھی پر بیٹھ کر یوں بڑے بڑے لقمے مارنے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''ممانی جان، یہ اتنا کھاتے ہیں چھکو، پھر اتنے دبلے کیوں ہیں۔'' وہ بول اٹھی۔

''نہ بیٹی کسی کے کھانے کو یوں نہیں ٹوکتے... رو رو کر جو کھاتا ہے، اس لیے ان کو نہیں لگتا... تو اور لے گی پراٹھا؟''

''نہیں۔'' وہ سلیپر سمیٹ وہاں سے بھاگی اور گھر کے بیس بائیس آدمیوں میں کہیں گم ہوگئی۔ اب جو اس زمانے کی باتیں سوچتی ہے تو اس بھرے پُرے گھر میں اس کو اپنا وجود کہیں یاد نہیں آتا۔ اسے بہت سی باتیں یاد آتی ہیں۔ امی کا پلنگ سامنے انگور چڑھی بیل کے سائے میں ڈال دیا جاتا۔ دوپہر کو وہ گرم پانی منگا کر اس سیاہ فام بندر کے کھانکڑ کا منہ دھلاتیں۔ بند مٹھیاں زبردستی کھول کھول کر ہاتھ دھلاتیں، تپلی تپلی لال اور کالی ٹانگیں دھلاتیں، کپڑے پہناتیں، پوتڑہ لپیٹتیں، سرمہ لگاتیں، سرمے کا ٹیکہ لگاتیں اور اپنے پاس لٹا لیتیں۔ پھر وہیں بیٹھے بیٹھے منجن مانجھ کر کیاریوں میں تھوکتیں۔ وہیں پلنگ کی ادوائن بھگو بھگو

Marfat.com

کر صابن سے ہاتھ منہ دھوتیں۔ وہیں کسی سے تولیہ منگا کر منہ پونچھتیں۔ وہیں ان کے کھانے کے لیے عجیب وغریب خوش بوؤں اور بدبوؤں سے بسے ہوئے کھانے آتے۔ غرضے کہ سارا دن وہ لیٹی رہتیں اور ان کے تمام کام بستر پر ہی ہوتے۔ باجی، خالہ جانوں، ننن آپا اور پڑوس کی رشتے دار عورتوں میں گھری ہنسا کرتیں۔ چھوٹے بھائی بہن کبھی صحن میں، کبھی چھت پر بڑوں کی ڈانٹ پھٹکاریں کھاتے پھرتے۔ لیکن اس کو یاد نہیں کہ اس سارے عرصے میں وہ کیا کرتی رہتی۔ پتا نہیں اس زمانے میں وہ وہاں تھی یا نہیں۔ ہوگی تو ضرور ورنہ یہ یادوں کے خزانے کہاں سے جمع ہوجاتے۔ اسے کچھ دھندلا سا یاد ہے کہ جب امی یہ سب کچھ کر رہی ہوتی تھی تو شاید وہ آس پاس ہی کہیں منڈلا رہی ہوتی تھیں اور باجی جب لڑکیوں میں گھری ہنس رہی ہوتی تھیں اور ساتھ ہی ایک لڑکی کے بالوں میں بڑی بے خیالی میں کنگھی کر رہی ہوتی تھیں تو شاید یہ لڑکی وہ خود ہی تھی...اس کو جھونٹے کھسٹوانے کی اتنی عادت پڑ گئی تھی ہر جھونکے کے ساتھ جب اس کا سر شمال سے جنوب میں جھونک کھا جاتا تو اسے کچھ محسوس نہ ہوتا۔ ہاں خالہ جانوں میں سے کوئی پکار اٹھتا، ”اری کیسے بال کھسوٹ رہی ہے غریب کے، منہ لال ہوگیا، لا مجھے دے۔“ تو باجی کنگھی انھیں دے پھر آنکھوں کے ڈیلے جلدی جلدی گھما کر باتوں میں لگ جاتیں...تو اسے یہ شبہ تھا کہ وہ اس بڑے سے گھر میں پورے وقت کہیں نہ کہیں رہتی ضرور تھی۔ یہ اور بات ہے کہ نانی اماں سے لے کر اس بندر کے کھانکڑ کے درمیان اس کا نوٹس صرف اتنا لیا جاتا جتنا پنجرے میں بند مٹھو میاں کا۔ وہ تو پھر بھی ٹیں ٹیں کر کے، مٹھو میاں کو روٹی دو۔ ہر آئے گئے کو سلام کر کے اور کبھی کبھی غصے میں پنجرے کی تیلیاں کھسوٹ کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف کر لیتے۔ مگر یہاں اتنی بھی توفیق نہ ہوتی۔ بس چپ چاپ زمین پر رینگنے والی چیونٹی کی طرح وہ سب کو دیکھتی تھی۔ اس کو شاید کوئی بھی نہ دیکھتا تھا۔

اس کی دوسری اہم یاد چھوٹے ماموں کی شادی تھی۔ یہ یاد نہیں کہ پہلے واقعے کے کتنے دن بعد کا ذکر ہے لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ اس گھر میں اس بلا کے آدمیوں کا طوفان ٹوٹا تھا کہ پہلے کے بیس بائیس آدمی اس میں یوں گم ہوگئے تھے جیسے بعد میں پیدا ہونے والے بہن بھائیوں میں بے چارے پہلے پیدا ہونے والوں کا وجود...چھوٹے ماموں کی چار بہنیں مع اپنے بچوں کے آ پہنچی تھی، ہر ایک کے بچوں کی تعداد آٹھ سے بارہ کے درمیان

Marfat.com

تھی، بڑے ماموں مع اپنے پانچ شان دار سپوتوں اور ان کی ایک کومل سی بہن کے جوان پانچ پلے ہوئے بھائیوں میں اور بھی کومل اور زرد نظر آتیں مگر حقیر نہیں کیوں کہ ماں باپ اور سب بھائی اپنی آنکھوں پر بٹھائے بٹھائے پھرتے۔

منجھلے ماموں تو خیر ہمیشہ سے اسی گھر میں رہتے تھے، منجھلی ممانی ہمیشہ سے باورچی خانے کی انچارج تھیں۔ فنن آپا ہمیشہ سے ان کمروں، دالانوں میں نانی اماں کے حسبِ ہدایت سج سج اور صفائی سے برش پھیرتی آئی تھیں۔ لمبی پتلی ٹانگوں والے ننجو اور چھکو ہمیشہ سے اس مکان میں ضد کرتے اور پٹتے آئے تھے۔ یہ تو وہ تھے جنھیں وہ بھی خوب اچھی طرح جانتی تھی لیکن بہت سی تعداد میں وہ خاندان بھی آئے تھے جن کو وہ نہ جانتی تھی۔ نانا کی بہنیں اور ان کی اولاد۔ یہ لوگ کسی بڑے شہر میں رہتے تھے اور اس قدر لچھے دار باتیں کرتے تھے کہ سارے خاندان کو انگلیوں پر نچاتے تھے۔ پیچھے سب نام دھرتے تھے مگر ان کے سامنے کسی کی دال نہ گلتی تھی۔ مجال کیا کہ جو یہ کہہ دیں وہ نہ ہو پائے... اس کنبے کی عورتوں کے چنے ہوئے دوپٹے اور جناب ان کے فرش پر جھاڑو دیتے غرارے، ان کی قمیصوں کی تراش ان کا رکھ رکھاؤ، ان کا ٹھسا، ان کے نخرے ایک ایک ایک چیز معرضِ بحث میں آتی اور وہ تھیں کہ اس بھرے پُرے گھر کے آسمان پر بادلوں کی طرح چھائی جاتی تھیں، جب چاہتی تھی برستی تھیں، جب چاہتی تھیں کھل جاتی تھیں... کبھی ذرا سی بات ناگوار گزرتی تو سارا خاندان ایسا دھواں دار ہو جاتا کہ پورے گھر پر گھٹاٹوپ ہو جاتی۔ جب شکوے شکایات ختم ہوتے تو مطلع صاف ہو کر نیلا آسمان چمک اٹھتا اور وہ شادی کی باتوں میں یوں دلچسپی لیتیں جیسے سب کچھ وہی ہوں۔ اللہ اللہ کیا سماں تھا۔ اوپر سے نیچے تک مکان اٹا اٹ بھرا تھا، لمبے سے ایک کمرے میں جہاں ساری بڑی لڑکیاں سوتی تھیں، اُس جیسی فالتو لڑکیوں کو بھی پھینک دیا گیا تھا جو نہ کسی کام دھندے کی تھیں، نہ ماؤں کے کلیجوں سے لگ کر سونے کے قابل تھیں اور نہ عشق لڑانے کے قابل، ظاہر ہے کہ فی الحال وہ قطعی بے مصرف اور نوٹس لینے کے ناقابل تھیں۔ یوں اس کی عمر کی اتنے کنبے میں کوئی لڑکی نہ تھی جو دو چار سال بڑی تھیں، وہ اسے منہ نہ لگاتی تھیں۔ ہم عمر لڑکے تھے جو اسے چڑانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے، وہ سب کو چپ چاپ دیکھا کرتی تھی۔ خالہ جان اور ان کی ساری سہیلیاں بھر بھر تشتریاں کھیر اور پھل اندر کی کوٹھریا میں اڑاتیں۔ کوٹھے پر پانچوں

ماموں زاد بھائی رسیوں سے دونے باندھ باندھ کر ربڑی اور کباب منگواتے اور اکیلے اکیلے کھاتے... شادی کے دن کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سب تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ شاہدہ باجی گھبرائی گھبرائی پھر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنی ساری اور بلاؤز نکال کر رکھا اور جھٹ کوئی بلاؤز لے اڑا... ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ عاجز آ گئیں۔ ایک ایک سے پوچھتی پھرتی تھیں۔ سارے گھر میں بات پھیل گئی... وہ نہ جانے کس کی کیا چیز لینے جو چھوٹے کوٹھے پر گئی تو دیکھا فرشو بھیا دھم دھم گینڈے ایسے چنو میاں کو پیٹ رہے ہیں۔ گریبان پکڑ کر وہ انھیں زینے تک لائے، ''پھینک دوں نیچے...'' وہ غرائے... ''نئی، نئی، واسطہ خدا کا۔'' چنو میاں نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر جھنڈی ہلائی۔ دیکھا تو شاہدہ باجی کا بلاؤز۔ فرشو بھیا نے بلاؤز لے کر چنو میاں کو دیوار پر ایسا دھکا دیا کہ ان کا سر تربوز کی طرح دھب سے بول گیا۔ بلاؤز لیے وہ اندر کمرے میں گئے اور بڑے رعب سے بولے، ''فن اس پر استری کر کے شاہدہ کو دے آؤ'' اور پھر کندھے اُچکاتے، ناک پھلاتے یوں غسل خانے میں گھس گئے جیسے کوئی بڑا بھاری میچ جیت کر آئے ہوں۔ فن باجی جو پہلے پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن کے پجامے میں کمر بند ڈال رہی تھیں، اسے جوں کا توں چھوڑ استری گرم کرنے چلی گئیں۔ مار پنکھا جھل جھل کے انھوں نے استری دہکائی اور بڑا پتا مار کے بلاؤز پر استری کی۔ تھوڑی دیر میں شاہدہ باجی، اپنا استری شدہ بلاؤز اور جھلملاتی ساری پہنے خوب مٹکتی پھر رہی تھیں... اور جب وہ فراک پہننے لگی تو وہ بھی غائب۔ اس کا ارادہ ہوا کہ جا کر فرشو بھیا سے کہے کہ دیکھا چھکو اس پر چڑھا بیٹھا مزے سے اپنے جوتے کے تسمے باندھ رہا تھا۔ ''ہٹو، ارے ہٹو۔'' وہ فراک پکڑ کر گھسیٹنے لگی۔ بڑی مشکل سے فراک نکلی تو مانو گھڑے میں سے نکالی ہو۔ ایک طرف سے جوتا صاف کیا ہوا بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ منھ بسورنے لگی۔

''لاؤ، لاؤ دیر ہو رہی ہے۔ بچوں کے کپڑے کون دیکھتا ہے۔'' باجی نے بغیر بٹن کھولے فراک اس کے سر پر سے کھینچ کھینچ کر گلے میں اتار دی... آخر کو اس کی مدد بھی فرشو بھیا ہی کریں گے۔ وہ پھر چھوٹے کوٹھے تک جا پہنچی۔ فرشو بھیا نفیس سا سوٹ پہنے، آئینہ دروازے میں کہیں پھنسائے، ٹانگیں چوڑی کیے ٹائی باندھ رہے تھے۔

''فرشو بھیا!'' وہ پاس جا کر منمنائی۔

''کہو۔'' وہ لمبا سراپا لے کر اس پر جھک گئے، جیسے انھیں پہلے سے معلوم ہو کہ

Marfat.com

کوئی بہت اہم بات کہنے وہ آئی ہے۔ اس نے اپنی پوری داستان رقت سے انھیں سنا دی۔ اسے یقین تھا کہ جب گینڈے ایسے چنو میاں کو فرشو بھیا نے ہلا کر رکھ دیا تو چھکو کی ریڑھ کی ہڈی تو توڑ کر اس کے ہاتھ میں دے دیں گے مگر وہ بڑے زور سے ہنس پڑے اور بولے، ''نہیں، یہ فراک تو بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔ کہیں سے بھی خراب نہیں ہوئی، کیوں ملّو۔''

''بالکل۔'' دوسرے بھائی نے بغیر دیکھے کہا۔

''بالکل گڑیا ہے...'' فرشو بھیا نے لے کر اس کے بالوں میں تیل کی مالش سی کی اور لمحہ بھر میں باجی کی محنت اور اس کے صبر پر پانی پھیر دیا، نیچے آئی تو باجی نے ڈانٹا، ''پھر بال خراب کر لیے چڑیل، اِدھر آ...''

یوں ہی ہاتھ سے دو ایک بال اِدھر اُدھر کر کے پھر اسے بھگا دیا اور وہ سیکڑوں آدمیوں کے مجمعے میں پھر کھو گئی۔ وہ اس قدر بھیڑ میں کس طرح گئی اور ممانی کو بیاہ کر لائی اسے حیرت ہوتی ہے۔ بس وہ تو ایسے گئی اور آئی جیسے موٹر یا ٹانگے کے کسی حصے سے چمٹی ہوئی چیونٹی برات میں جا کر واپس آ گئی ہو۔'' تو اور کیا... بچوں کے ساتھ بیاہ شادی میں یہی ہوتا ہے، کون انھیں دیکھے بھالے۔ اس کی امی نے کسی موقعے پر کہا تھا۔ اصل میں سارے بڑوں کو یقین ہوتا ہے کہ وہ خود ہی بھیڑ بھڑکے میں لوٹ آئیں گے، کون فکر کرتا پھرے۔

اب کے گھر لوٹے تو امی تہیہ کر چکی تھیں کہ اسے اسکول میں داخل کروا دیں گی۔ اسکول کے نام سے ہی اس کے دل میں گدگدیاں ہونے لگتیں۔ دادا میاں سے پڑھنا تو اسے قطعی پسند نہ تھا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ایک صبح سے جو کھرے پلنگوں پر بیٹھے پڑھ رہے ہیں تو کیا مجال کہ دوپہر کے کھانے سے پہلے چھٹی مل جائے۔ اور ابھی شام کو کھیلنے کا وقت ہوا کہ ''چل پڑھنے بیٹھ۔'' کے جاں کاہ الفاظ سنائی دے گئے... اس سارے وقت میں پڑھنا ہی ہوتا تو بھی صبر تھا مگر وہ تو بہ مشکل ایک سطر دیتے اور کہہ دیتے، ''سارا پچھلا یاد کر اور سبق یاد کر پچاس دفعہ۔ ابھی آ کر سنوں گا۔'' اور وہ بلاوجہ ہزارویں دفعہ انگلیاں پتھر کی سل پر یوں رگڑ کر جیسے چھری تیز کر رہے ہوں، ہاتھ دھونے بیٹھ جاتے۔ ہاتھ دھونے، کلی کرنے، پان کھانے اور پھر منھ صاف کرنے میں ان کو گھنٹا بھر سے زیادہ لگتا۔ اور یہاں بڑے بھائی سے لے کر، وہ اور چھوٹی بہنیں سب شرارت کر رہی ہیں۔ قاعدے الٹے

Marfat.com

سیدھے پڑی ہیں اور مرغیوں کو دانہ ڈالا جا رہا ہے۔ دادا میاں کہیں آس پاس سے گزرے تو للکارے، ''کسی ایک کی آواز نہیں آ رہی، کھال ادھیڑ دوں گا آ کر۔'' سب جلدی جلدی قاعدے اور سپارے کھولتے اور ایک ساتھ زور زور سے پڑھنا شروع کر دیتے۔ دادا میاں جوں جوں دور ہوتے جاتے آواز بھی بہ تدریج آہستہ ہو کر بالکل ڈوب جاتی اور پھر وہی باتیں اور کھیل... یوں بہ مشکل یہ پڑھائی کا وقت کٹتا... پچاس دفعہ چھوڑ شاید ہی کوئی سبق دس پندرہ دفعہ سے زیادہ دہراتا ہو۔ اکثر شام کو دادا میاں پچھلا صبح کو سننے کے لیے اٹھا رکھتے اور سبق سننے کے بعد چھٹی دے دیتے لیکن اس وقت تک سورج ڈوب چکا ہوتا۔ دیکھتے دیکھتے رات ہو جاتی۔ ان دنوں رات بھی شاید اسی لیے آتی تھی کہ صبح ہو سکے اور وہ منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کرنے کے بعد پڑھنے کے لیے ہنکا دیے جائیں۔

اور انھیں دنوں سے اس کے دل میں ایک خانہ خالی خالی سا تھا۔ وہ کس چیز سے پُر ہوگا، اسے معلوم نہ تھا۔ وہ خوب دل لگا کر پڑھتی اور دادا میاں اسے شاباش دیتے۔ کبھی کبھی وہ اون اور سلائیاں لے کر بڑے قاعدے سے بننے بیٹھ جاتی۔ سلائی پر پچاس خانے، خانے کیسے آپ ہی آپ کم ہو کر پچیس رہ جاتے۔ وہ اس الجھن کو بھی پوری طرح سلجھانے کی کوشش کرتی۔ امی کو چھوٹے بہن بھائیوں سے اگر لمحہ بھر فرصت ملتی تو وہ ''ٹھہر جاؤ ابھی دیکھوں گی'' کہہ کر ٹال جاتیں۔ لیکن جس طرح سلائی پر کم ہو جانے والے خانے کسی طرح پورے نہ ہو سکتے، اسی طرح اس کے دل کا خانہ کسی طرح پر نہ ہوتا۔ چلچلاتی دوپہریا میں وہ بہن بھائیوں کے ساتھ اودھم مچاتی۔ بڑ کے بڑے سے درخت پر غلام لکڑی بھی کھیلتی۔ بھائی جان کے برابر اونچی جگہوں سے چھلانگیں لگاتی۔ پڑوس کی لڑکیوں کے ساتھ کچی امبیوں کی چٹنی بنا کر کھاتی۔ اپنے باغ کے کونے کھدروں میں ناچنے والے موروں کو پکڑنے کے لیے گھنٹوں داؤں لگاتی اور پھر صرف ان کے بکھرے ہوئے پروں کو سمیٹنے پر اکتفا کر لیتی لیکن دل کا وہ خالی خانہ نہ بھرتا۔ شاید اس خالی خانے میں اسکول کی ہی لگن ہو، کون جانے!

○○○

Marfat.com

۹

چند دن بعد جب وہ مشن اسکول کے پست ترین درجے میں داخل ہوگئی تو واقعی اس کے دل کے خالی خانے میں ہوا سی بھرنے لگی، منے منے ڈیسک، پلائی وڈ کی درمیان میں پھول پڑی چھوٹی چھوٹی پیڑھیاں۔ اسکول میں اسے گھر سے کہیں زیادہ لطف ملنے لگی۔ کرسچین استانیاں اسے خاص طور پر پسند کرتی تھیں۔ بس میں لڑکیاں اسے گود میں بٹھانے کے لیے آپس میں لڑا کرتی تھیں۔ اسکول سے گھر تک اور گھر سے اسکول تک وہ بس میں گودیوں ہی گودیوں میں جاتی۔ اس کے سرخ گالوں پر یوں چٹا چٹ پیار کیے جاتے کہ وہ سرخ انگارہ بن جاتے اور وہ جھنجلا جاتی...

راجا صاحب اپنی ریاست کے اس اسکول کو دیکھنے آئے تو اسے ایک نہایت خوب صورت بڑے بڑے پھولوں والی ریشمی فراک پہنا کر راجا کے گلے میں ہار ڈالنے کو کہا گیا... راجا صاحب نے اسے پیار کیا تو ان کی مونچھیں اس کی ناک میں گھس گئیں اور اسے چھینک آگئی۔ انھیں بتایا گیا کہ یہ اسکول کی سب سے کم عمر، سب سے خوب صورت اور بے حد ذہین بچی ہے۔ قریب تھا کہ راجا صاحب ایک دفعہ پھر اپنی مونچھیں، اس کی ناک پر آزمائیں کہ وہ دو قدم پیچھے سرک گئی۔ کاغذ کے تاج پہن کر رنگین چھڑیوں کے ساتھ ڈرل کرنے میں شامل تھی۔ بچوں کے ڈرامے میں بھی جب ایک بچی کی ضرورت آن پڑی تو اسے ہی لیا گیا۔ بڑی لڑکیوں کے میک اَپ روم میں وہ خود کو کتنا بڑا، کتنا اہم محسوس کرتی۔ باتیں کرتے کرتے لڑکیاں مسکرا کر اس کی طرف دیکھتیں اور کہتیں۔ ”خوب ایکٹنگ کرتی ہے یہ لڑکی۔“ پھر کوئی لڑکی جھک کر اسے پیار کرلیتی۔ ”اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک

Marfat.com

تو دیکھو، یہ بہت شریر ہوگی، کیوں ہے نا۔'' وہ اس سے پوچھتیں... وہ نفی میں گردن ہلا دیتی۔ اس نے تو کبھی ایسی کوئی خاص شرارت نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھ کی چمک جھوٹی ہوگی۔ وہ تو ہمیشہ سے اچھی بچی بننا چاہتی تھی کہ ماں باپ دادا دادی پاس پڑوسی اسے پیار کریں لیکن باوجود اس تمام کوشش کہ شاید کبھی کسی نے یہ دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی کہ کس طرح وہ اپنی آنکھوں کی فطری چمک کے خلاف نیک بچی بننے کا مجاہدہ کر رہی ہے۔ کسی کو اتنی فرصت ہی نہ تھی اور اس کے دل کا خالی خانہ جس میں اسکول میں تھوڑی دیر کو ہوا بھر جاتی، گھر جا کر کوڑے میں پڑے ہوئے، اس خالی ڈبے کی طرح کھنکنے لگتا جس میں دو چار کنکر پڑے ہوں...

اس دن گھر آئی تو بہت کچھ سنانے کو اس کی طبیعت مچل رہی تھی۔ مگر اس سے کپڑے بدلنے اور کھانا کھانے کو کہا گیا۔ اس کام سے فارغ ہوکر اس نے دیکھا کہ امی دوپہر میں کمرا بند کر کے اور بچوں کو شور نہ کرنے کی تلقین کر کے سوچکی ہیں اور سب بہن بھائی بڑ کے پیڑ پر لنگوروں کی طرح لٹک رہے ہیں۔ اس نے بڑے بھائی کو سارا قصہ سنانا چاہا مگر وہ الٹا چڑانے لگے، ''اچھا تو آپ نے راجا صاحب کو ہار پہنایا اور انھوں نے لے کر ایک چانٹا آپ کے گال پر مارا، جبھی تو اتنے لال ہو رہے ہیں گال۔ آپ نے رونا شروع کیا تو اُنھوں نے ایک اور...''

''کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں۔'' وہ روہانسی ہوکر چلائی۔

ہاں... ہاں... ہاں۔

تو یوں بات ختم ہوگئی۔ لیکن اس دن سے اسکول میں اس کی ایک خاص پوزیشن بن گئی جس کو اسکول میں آنے والا کوئی اجنبی بھی محسوس کرسکتا تھا۔

ایک دن مس پولک اور مس سنہا نے اس سے کہا کہ آج شام کو اس کے گھر آئیں گی۔ وہ شرما کر ہنس دی۔ بس میں بہت سی لڑکیاں روز اس سے یہی کہا کرتی تھیں کہ ''ہم تمھارے گھر آئیں گی، بتاؤ کیا کھلاؤ گی؟'' گھر آکر اس نے امی سے کچھ نہ کہا۔ شام کو جب وہ مٹی میں ہاتھ سانے، جانے کیا الم غلم بنا رہی تھی کہ مس پولک اور مس سنہا رنگین چھتریاں تھامے ان کے احاطے میں داخل ہو رہی تھیں... وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگی اور پھولی سانسوں کے درمیان امی کو صورتِ حالات سے مطلع کیا۔ امی اس سے بھی زیادہ

گھبرائیں۔ ''ہاں نہیں تو، نگوڑ ماریاں بچوں کے گھر میں بغیر اطلاع چلی آئیں۔ جانے کمرے کیسے کیسے پڑے ہوں گے۔'' خیر جوں توں کرکے ان کو بٹھایا گیا۔ وہ بھی ہاتھ دھو، چپل میں انگلیاں ڈال، دروازے کے پیچھے کھڑے ہو کر انگلیاں چٹخانے لگی۔ مس پولک اور مس سنہا امی سے اس کی تعریفیں کرتی رہیں۔ بڑی پیاری بچی ہے اور بہت ذہین... سب سے زیادہ نظمیں یاد ہیں، آپ نے نہیں سنیں۔''

''نہیں تو...'' امی نے ننھے کو تھپکتے ہوئے کہا۔

مس سنہا نے اسے دیکھا اور کھینچ نکالا۔ ''چلو امی کو پوئم سناؤ۔'' اس نے فرفر گاڑی چھوڑ دی۔

''ایسے نہیں، ٹھیک سے اشارے کر کر کے۔''

تب اس نے بہت سی نظمیں اردو اور انگریزی میں سنائیں۔ جن کو سن کر امی کی باچھیں کھلیں۔ بولیں۔

''ویسے سنا تو میں نے بھی کئی دفعہ تھا، اسے یہ نظمیں پڑھتے ہوئے مگر میں نے سوچا، جانے کیا بکواس کرتی رہتی ہے بلکہ میں نے تو کئی دفعہ ڈانٹا بھی کہ یہ ہر وقت کیا بکا کرتی ہے تو؟...''

مس سنہا اور مس پولک امی کی سادگی پر ہنس پڑیں۔ چائے کے بعد رخصت ہوگئیں تو امی نے سارا حال اس کے بابا کو سنایا۔ بابا نے باہر جاتے جاتے لمحے بھر کو رک کر کہا، ''ہاں ہمیں بھی تو سناؤ کچھ۔'' وہ خوشی سے پھول کر سنانے لگی۔

ہم ہیں چھوٹے بچے کھیلنے آئے ہیں
ہم اپنے ساتھ ایک سارنگی لائے ہیں

(ہاتھ سے سارنگی بنا کر)

روں، روں، روں
ہم ہیں چھوٹے بچے کھیلنے آئے ہیں
ہم اپنے ساتھ ایک ڈھولک لائے ہیں

(پیٹ تھپتھپا کر) ڈھب، ڈھب، ڈھب

''خوب بھئی خوب۔'' بابا ہنس پڑے، ''اچھا، میں چلتا ہوں۔'' وہ چلے گئے۔

''ہم اپنے ساتھ ایک ڈھولک لائے ہیں''

ایک موٹی سی آواز مسخرے پن سے چلائی اور اس نے دیکھا کہ بھائی اپنا پھولا ہوا پیٹ کھول کر دھپا دھپ بجا رہے ہیں۔

ڈھب، ڈھب، ڈھب

''چل ہٹ، یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' امی چلائیں۔

''امی یہ جو ابھی کر رہی تھی صبیی۔''

اس دن سے اکیلے میں ہر وقت اسے پھولے ہوئے پیٹوں کی تمسخرانہ ڈھب ڈھب سنی پڑتی، یہاں تک کہ اسے اپنی ساری نظموں سے نفرت ہوجاتی اور اس کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے...اور جب تمام بہن بھائی بڑے بھائی کے سکھانے پر پریڈ کی شکل میں ڈھب ڈھب کرتے چلتے تو اس کے دل کا خالی خانہ ان پیٹوں کی طرح ڈھب ڈھب کر اٹھتا...مگر یہ اسکول بھی اس کی قسمت میں نہ تھا۔ وہاں سے ایک چھوٹی سی جگہ اس کے بابا کا تبادلہ ہوگیا۔ باجی جنھیں کسی رشتے کی بہن کے بے حد اصرار پر علی گڑھ بھیج دیا گیا تھا، چند مہینے بعد علی گڑھ سے فیل فال ہو، نت نئے فیشن، بولنے کا ایک خاص اسٹائل اور ہلکے ہلکے عطر لگانا سیکھ کر واپس آگئیں۔ اسکول کے بعد یہ خانگی زندگی اسے بے حد کھٹکنے لگی۔ باجی بے چاری بھی ہمہ وقت اپنے علی گڑھ کا رونا روئے جاتیں۔

اب اس نے بڑے بھائی کی نقل کرنے کی ٹھانی۔ شاید اسی طرح سے ان کے برابر لفٹ ملنے لگے۔ درختوں کی آخری پھنگوں تک وہ ان کے پیچھے پیچھے چڑھی۔ ایک ایک میل بھاگنا اور لوٹ کر ٹوٹی ہوئی پتنگ کی طرح پڑ رہنا اور ایک دن تو وہ دل تھام کر اتنی اونچی ریلوے کی بلیا سے کود پڑی کہ راستے ہی میں اسے دم نکلتا ہوا محسوس ہوا، اور اس کے ساتھی دیکھنے والوں میں سے کئی ایک چیخ پڑے۔ نرم بالو پر جب اس کا جسم چھپکلی کی طرح جا کر پٹاخ سے گرا تو بہت دیر تک اسے ہوش ہی نہ آیا۔ پھر وہ کپڑے جھاڑتی، کھسیانی ہنسی ہنستی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس دن تو بڑے بھائی بھی اس کے کمالات کے قائل ہوگئے۔ گھر آکر انھوں نے یہ بات امی کو بتائی تو انھوں نے گھور کر دیکھا۔ ''مرے گی کسی دن۔''

اور وہ باہر جا کر پھر بلبلوں اور موروں کو پکڑنے کی کوشش میں مصروف ہوگئی۔ اسے ایک عدد بلبل یا مور پکڑنے کا جنون سا ہوگیا تھا۔ وہ ایک درخت سے دوسرے درخت

Marfat.com

اور ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی تک چھپ چھپ کر جاتی مگر اس کی آہٹ پاتے ہی مور اور بلبل نو دو گیارہ ہوجاتے۔ مغرب کے وقت جب دھندلکا چھا جاتا تو مور اپنی لمبی لمبی دُمیں لٹکائے درختوں پر آبیٹھتے اور ان کی کوہو کوہو سے ساری بستی گونج اٹھتی تو وہ تہیہ کرتی کہ کل ضرور ایک مور پکڑ لے گی۔

یہ دیکھ کر کہ بچے دادا میاں سے سوائے اردو اور حساب کے کچھ اور نہیں کر پاتے، انھیں وہاں کے واحد اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ یہ اسکول گھر سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ کسی زمانے میں دھرم شالہ تھی۔ نزدیک ہی ایک بہت بڑا 'کنڈ' تھا جس کے چاروں طرف سیڑھیاں تھیں جو پتلی ہوتی چلی گئی تھیں۔ تلا ابھی خشک تھا، جب پانی ہوگا تب بھی تارا بن کر چمکتا ہوگا۔ ایک طرف قدِ آدم چار دیواری میں بہت سے درخت تھے۔ اس اسکول میں صرف یہ ہی بہن بھائی تھے جو اجلے کپڑوں، فراکوں اور نکروں جیسے جدید ترین ملبوسات میں پائے جاتے تھے۔ شاید اسی لیے اسکول ماسٹر ان سے اتنے ہی مرعوب تھے جتنے کسی اسکول انسپکٹر سے۔

صبح کو جب دعا ہوتی تو سارے بچے قطاروں میں کھڑے ہوکر، پورے منھ کھول کھول کر، سارا زور لگا کر چلاتے، یوں ایشور کی پراتھنا کرتے گویا ایشور خدانخواستہ بہرہ ہو۔ پہلے دن تو صبا کو محسوس ہوا جیسے پراتھنا اس کے کان کے پردے پھاڑ دے گی مگر جلد ہی وہ اس کی عادی ہوگئی۔

یہ وہی روایتی اسکول تھا جہاں ماسٹر صاحب دھوتی لپیٹے کھرے پلنگ پر نیم کے درخت کے نیچے لیٹے رہتے، دو بچے ان کے پیر دابتے، چند لڑکے مصالحہ پیسنے، برتن دھونے، ہانڈی چڑھانے اور کنویں سے پانی لانے کا کام انجام دیتے اور باقی لکڑیاں چننے کے بہانے جاکر نزدیک کے باغ میں کھیلتے، ان سب بہن بھائیوں کو کام کرنے کی سختی سے ممانعت تھی، اس لیے یہ ہمیشہ آخری گروپ میں پائے جاتے۔ جب اسکول کا وقت ہوتا تو سب لڑکے لڑکیاں، بستے گلے میں ڈال، سوئے ہوئے، لاٹ صاحب کو سلام کرکے اپنے گھر کی راہ لیتے۔ اس بستی میں یہ واحد ماسٹر تھے اور باجی کا پڑھنا بھی ضروری تھا۔ پردے کی وجہ سے وہ اسکول نہ جاسکتی تھیں یا اس وجہ سے کہ وہاں اتنی اونچی کوئی کلاس نہ تھی، اس لیے انھیں ماسٹر صاحب کو باجی کے پڑھانے پر مقرر کیا گیا... شام کو جب وہ آتے تو اسے

Marfat.com

اور بڑے بھائی کو کتابیں تھما کر وہاں بھیج دیا جاتا۔ ماسٹر صاحب باجی کو تو بڑے چاؤ سے پڑھاتے اور انھیں یوں ہی ایک آدھ لفظ پڑھا کر رٹا دیتے جس کو یاد کرنے کی بھی فرصت نہ ملتی۔ دونوں ایک دوسرے کو اشارے کر کے اتنا ہنساتے کہ منھ سرخ ہو جاتا اور سانس پیٹ میں نہ سماتا۔ (بڑے بھائی کے ساتھ دوستی کا ایک یہی لمحہ اسے میسر آتا جب نہ وہ اس کا مذاق اڑاتے نہ چلتے پھرتے سر پر دھول جماتے) باجی ڈانٹتیں تو اور بھی ہنسی آتی، ماسٹر صاحب ڈانٹتے تو اور بھی زیادہ۔ جب ہنسی قابو سے باہر ہو جاتی تو انھیں ڈانٹ کر بھگا دیا جاتا اور اُدھر امی دیکھ پاتیں تو فوراً کتابیں بغل میں دابے پھر بلٹی واپس آجاتی۔ غرض کہ اُسے یاد نہیں کہ اس تمام عرصے اسکول یا گھر میں ایک لفظ بھی انھوں نے پڑھ کر دیا ہو۔

نامعلوم اس صورتِ حالات کی اطلاع کیسے تایا ابا کو ہوئی۔ بھائی کے نام ان کا مخصوص طرزِ تحریر میں لکھا ہوا کارڈ آیا جسے صرف بابا ہی پڑھ سکتے تھے۔ اس میں انھوں نے تمام قابلِ تعلیم بچوں کو ان کے گھر بھیج دینے کی پیش کش کی تھی۔ کارڈ کے پیچھے شاہدہ باجی نے صبا کے لیے خصوصی سفارش کی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا، ''اتنی ذہین بچی کا وقت یوں برباد ہوتا دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔'' اس پیش کش اور ان کی روانگی کے درمیان کیا بحثیں ہوئیں، کیا نتائج نکالے گئے، کیا ہوا اسے کچھ نہیں معلوم۔ اسے تو اتنا یاد تھا کہ ایک دن باجی، بڑے بھیا اور وہ ریل میں سوار چھکا چھک ایک بڑے شہر کی سمت جا رہے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے، ایک نہایت ہی بلند مقصد سے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے وہ شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ سعدی اور واشنگٹن کے زمرے میں جا داخل ہوئے ہیں جو حصولِ تعلیم کے لیے اسی طرح دریا و پہاڑ عبور کرتے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ کچھ اسی قسم کی پاکیزہ سی مسرت تھی جو نئی جگہ کے خوف اور اس چھوٹی عمر میں والدین کو چھوڑ دینے کے رنج کے ساتھ اس پر طاری تھی۔

○○○

Marfat.com

۱۰

تایا ابا کے گھر کا کارخانہ بہ قول امی دنیا بھر سے نرالا تھا۔ یہاں حکومت عورتوں کی تھی۔ تایا ابا ہیڈ آف دی اسٹیٹ کی طرح الگ تھلگ رہتے تھے۔ یوں ان کے اپنے اصول تھے۔ جن پر تمام دور و نزدیک کے بچوں کو چلنے کی ہدایت کی جاتی تھی مگر ان کی نصیحتوں پر گھر ہی میں کم کان دھرا جاتا تھا۔ تایا ابا نے بڑے بیٹے کو کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ہر بات میں رائے منجھلی صاحب زادی یعنی شاہدہ باجی سے لی جاتی تھی جو خیر سے ایف اے کا امتحان دے رہی تھیں اور خاندان بھر میں علم و ہنر میں چیدہ تصور کی جاتی تھیں۔ ان شاہدہ باجی کی پرائیویٹ سیکریٹری تھیں اس کی باجی اور ان پر نظر تھی تایا ابا کے ولی عہد محترم کی۔ تائی اماں گھر کے سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔ تایا ابا صرف اس وقت بولتے تھے جب ان کے خود ساختہ اصولوں میں سے کسی پر زد پڑتی ہو۔ اس طرح یہاں سے وہاں تک کیبنٹ میں عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ یہ دیکھ کر اس نے چھٹ بھیّوں میں سرداری کے لیے ہاتھ پاؤں پھیلائے مگر اتنی سی بچی کی بساط ہی کیا۔ اس کی دال کچھ گلتی نظر نہ آئی۔ حکومت تو رہی ایک طرف، الظاہر طرح نان کوآپریشن۔ بھائی صاحب جو شاہدہ باجی سے تیسرے نمبر پر تھے، اس سے بہ طورِ خاص جلتے تھے اور ان کی ضد کے آگے ساری کی ساری ہوم گورنمنٹ عاجز تھی۔ یوں اس کے بڑے بھائی اور یہ بھائی صاحب مل کر ایک اور ایک گیارہ ہو گئے۔ اب اس کا اور اس سے دو سال بڑی تایا زاد بہن کا یوں مذاق بنایا جاتا کہ وہ روہنکھی ہو ہو جاتیں۔ ابھی تک تو سوئی بھی نہ پکڑی تھی کبھی اس نے اسماعیل گرلز اسکول میں آ کر کرنی پڑی جو سلائی تو وہ یوں بخیے بھرتی جیسے کپڑے پر بھرت چپکاتی جا رہی ہو اور یہ ارمانوں سے

سلا ہوا کپڑا جو ہاتھ لگتا بھائی صاحب کے تو سارے محلے میں یوں نچایا جاتا کہ دو چار جگہ بے جگہ لگے ہوئے ٹانکے بھی ٹوٹ کر جھڑ جاتے اور اس کی ساری محنت خاک میں مل جاتی۔ اس کی تایا زاد بہن عمو کا بھی یہی فضیحتہ رہتا۔ اس کی پروگریس رپورٹ جب تک سات محلوں میں نہ گھوم جاتی، تایا ابا کے سامنے نہ رکھی جاتی۔ وہ بھی چڑ کر بھائی صاحب کے بجائے گھنٹوں بھینسا، بھینسا کہتی۔ یہ نام ان پر اسمِ بامسمّٰی کی طرح چسپاں تھا، اس لیے وہ دھبا دھب عمو کی پیٹھ پر مکے برساتے۔ اس طرح جب کہ چھٹ بھیّوں میں جوتیوں میں دال بٹ رہی تھی اوپری طبقے میں سب کی خوب گاڑھی چھن رہی تھی۔ مل مل کر جناب پکوان تلے جا رہے ہیں۔ پر وہ کلب میں جھولوں پر گانے اور چاندنی رات میں بیت بازی اور جمعے کے جمعے ایک اور ہلڑ بازی کہ مار بھر بھر کے بالٹیاں ایک دوسرے پر پانی ڈال رہی ہیں۔ یہاں سے وہاں تک سارا صحن اور سارے کمرے بھگو دیے ہیں اور سب کی سب گیلی چوہیاں بنی پھر رہی ہیں۔ دیکھتے دیکھتے سب بچے اور کبھی کبھی تائی اماں بھی اس بے رنگ کی ہولی میں شریک ہو جاتیں، ولی عہد بھائی کے دوستوں پر جو اِدھر اُدھر سے چھٹیاں گزارنے آئے ہوتے، بڑے طریقے سے نہ جانے کس کس کے دھوکے میں گھڑوں پانی انڈیل دیا جاتا اور جب وہ تولیہ سمیٹ، نئے براق کپڑے لے، غسل خانے میں چلے جاتے تو دروازوں کے پیچھے چھپ کر خوب کھسر پھسر ہوتی کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ غرضے کہ ان لوگوں کی ہر بات میں ایک رکھ رکھاؤ، ایک پراسراریت ایک رومانس تھا اور یہاں لے دے کے وہی چوٹی پکڑ کے کھینچ دی تو گیلی زمین پر تڑ سے جا گرے۔

اس کے علاوہ ان باتوں میں جو اسے بڑی رومانٹک نظر آتیں، تایا ابا کے گھر میں ہونے والی پڑھائی تھی۔

اب پڑھائی کا یہ سلسلہ تھا کہ رات کو دیر تک بتیاں جل رہی ہیں اور یہاں سے وہاں تک لوگ باگ ہیں کہ کتابوں پر جھکے ہوئے ہیں۔ بالکل اُس ہاسٹل کا سا سماں لگتا، جہاں امتحان سر پر سوار ہو۔ وہ سرِ شام ہی سو جاتی مگر جب آنکھ کھلتی تو بڑوں کو یوں پڑھائی میں مشغول دیکھ کر اسے بڑا اچھا لگتا گویا تعلیم کی اہمیت اور عظمت کا نقش اس کے دل پر بیٹھا جا رہا ہے۔ پردے کے پیچھے سے پڑھنا بھی اسے بے حد رومانی نظر آتا۔ اپنے بامن ماسٹر صاحب چاہے لاکھ سیدھے سبھاؤ کے ہوں مگر ذرا آنکھ جھپکی کہ ''دیکھ رہا ہوں بی بی'' کا ورد

Marfat.com

شروع ہو جاتا، اور پردے کے پیچھے، سبحان اللہ! ترکی ٹوپی والے ماسٹر صاحب پردے کے ایک طرف، باقی ساری لڑکیاں دوسری طرف۔ ''اچھا تو جمیلہ بی ہیں؟'' جمیلہ بی جو تخت پر دُور بیٹھی اپنا دوپٹہ چن رہی ہیں، ہنکارہ بھرتیں۔ پھر پڑھائی شروع ہو جاتی جس کے درمیان جمیلہ بی کی کئی مرتبہ اپنے کمرے اور باورچی خانے کا چکر لگالیتیں اور اگر کہیں ماسٹر صاحب کہتے ''سن رہی ہیں نا جمیلہ بی؟'' تو شاہدہ باجی یا کوئی اور ہنکارہ بھر دیتا۔ کبھی کبھی چوری پکڑی جاتی تو ماسٹر صاحب ذرا کی ذرا خفا ہو جاتے مگر اتنی بہت سی جوان کھلکھلاہٹوں اور شرمائی شرمائی معافیوں کے آگے سپر ڈال راضی بہ رضا ہو جاتے۔ جمیلہ بی کے بعد سنجید یا یعنی سنجیدہ آپا کی پکار ہوتی۔ وہ باورچی خانے میں سے ہمیشہ بڑبڑاتی ہوئی نکلتیں۔ ان کا بگڑنا صحیح بھی تھا، اب کہ ان سے چھوٹی ساری بہنیں میٹرک، ایف اے اور مڈل کی پڑھائیوں میں مشغول تھیں۔ انھیں آر اے ٹی ریٹ اور سی اے ٹی کیٹ کا سبق دیا جاتا تھا، وہ بھی ان کے زنگ لگے ذہن سے ذرا سی دیر میں صاف ہو جاتا۔ آج تک ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انھیں اس وقت انگریزی کیوں نہ پڑھائی گئی جب کہ ان کے پڑھنے کی عمر تھی اور جب وہ عمر نکل گئی تو اب آخر یہ مصیبت ان کے سر کیوں لادی جا رہی ہے۔ ان کا نکاح ہو چکا تھا۔ چند دن میں جا کر دوسرے گھر میں ہانڈی چولھا جھونکنا ہے۔ وہ سوچتیں، یہ آر اے ٹی ریٹ اور سی اے ٹی کیٹ کیا، وہاں مصالحے میں بھونوں گی۔ مگر تایا ابا کا حکم اس معاملے میں اٹل تھا۔ بچوں کی پڑھائی اور صحت کا خیال ان کے ایسے اصول تھے جن کو بجا طور پر ان کی کم زوری کہا جا سکتا ہے۔ لڑکے تو لڑکے لڑکیوں تک کی باقاعدہ ورزش کا اہتمام تھا۔ گھر میں بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس کا سارا سامان موجود تھا۔ بڑے سے صحن میں ایک طرف بیڈمنٹن کورٹ تھا، سہہ درے میں ایک طرف ٹیبل ٹینس کھیلی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے گھر میں قدم رکھنے والے ہر پیر و جوان پر بڑے صحن کے چالیس چکر، ایک چمچہ مچھلی کا تیل اور دن میں دو مرتبہ لمبے گہرے سانس فرض ہو جاتے تھے۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا پڑھائی کا۔ پردے کے پیچھے ہونے والی پڑھائی میں صرف شاہدہ باجی سنجیدہ تھیں، وہ بڑی باقاعدگی سے پردے کے پاس کرسی ڈال کر پڑھتیں۔ ان کی چوڑیوں کی وہ مانوس کھنک برابر ماسٹر صاحب کے ذہن کو بھٹکاتی رہتی۔ کتاب لینے اور دینے کے علاوہ وہ اپنا کوندا سا ہاتھ نکال کر پیرا گراف یا جملے پر انگلی رکھ کر بھی بتایا کرتیں اور

Marfat.com

کبھی کبھی ایسے سوالات پوچھ لیتیں کہ ماسٹر صاحب جو بے چارے خود کالج کے طالب علم تھے، گھبرا کر پھر کسی دن بتانے کے وعدے پر ٹالتے۔ یہ شاہدہ باجی چوڑیوں اور پھولوں کی بہت شوقین تھیں۔ ان کے ہاتھ بھی میدے کی طرح سفید اور مکھن کی طرح ملائم تھے۔ ایک دن آنگن میں سے چنبیلی کے پھول توڑ گجرا بنا ہاتھوں پر لپیٹ لیا۔ اس ہاتھ سے ماسٹر صاحب کو کتاب جو بڑھائی، کتاب بھول بھال انھوں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اندر جمیلہ بی، سنجید پا اور باجی بیٹھی ہوئی تھیں آہستہ سے پھولے سانسوں کے درمیان بولیں، ''چھوڑیے نا۔'' اب بھی نہ چھوڑا تو زبردستی کی۔ آخر ماسٹر صاحب نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ یہ دل تھامے، سرخ انگارہ گال لیے وہاں سے بھاگیں تو سیدھے اپنے کمرے میں پہنچ کر دم لیا۔ باجی نے تاڑ لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ چلیں تو صبا بھی ان کے پیچھے ہو لی۔ آنکھوں میں آنسو لیے تمتمائے چہرے سے انھوں نے باجی کو سارا قصہ سنایا۔ اب باجی ہنسیں تو ہنسیں۔ ''اور پہنو پھول بی بنو، اور لگاؤ مہندی، وہ بے چارے کیا کریں، انھوں نے تو صرف ہاتھ ہی پکڑا، کوئی اور ہوتا تو قدموں میں گر کر جاں بحق ہو جاتا۔''

''چلو ہٹو... اترا رہی ہیں۔ یاں جان پر بن رہی ہے۔ اللہ اب کیا ہوگا۔ میں تو اب نہیں پڑھوں گی خدا قسم۔''

''نہ پڑھنا... تایا ابا کو ساری بات بتا دینا۔''

''ہائے اللہ! ابا سے کبھی نہ کہنا، سنا!''

''تو پھر؟''

تو پھر؟... وہ بستر پر دل تھامے اوندھ گئیں۔ آنسو آنکھوں سے نکل نکل کر تکیہ بھگونے لگے۔

''اللہ تم کیوں رو رہی ہو...'' اچھا سمجھی، خوشی کے آنسو ہیں کہ ایک ترکی ٹوپی کو اتنی توفیق ہوئی...''

اللہ قسم ماروں گی... وہ اٹھ کر بھاگیں تو جمیلہ بی اور سنجید پا سے ٹکر ہوئی۔ معلوم ہوا ماسٹر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں، وہ آج نہیں پڑھائیں گے۔

دوسرے دن سے انھوں نے اپنی ماں کی بیماری کا بہانہ کر کے پڑھانا بند کر دیا۔

Marfat.com

اب تایا ابا کے دوست کے ایک لڑکے زاہد بھائی جن سے گھر میں پردہ نہیں تھا، شاہدہ باجی کو پڑھانے آنے لگے۔ ان کا پڑھایا جانا تو قطعی ضروری تھا۔ باقی کے پھٹیچر طالب علم بامن ماٹ صاحب، کے سرتھوپ دیے گئے۔ ان کا یہ قصہ تھا کہ کبھی تایا ابا کے شاگرد رہے تھے مگر اب تو استاد کے بچے بھی ان کے استاد نظر آتے تھے، گو کہنے کو وہ سب ان کے شاگرد تھے۔ ایک کھیپ تھی شاگردوں کی جس میں ایک سے ایک چلتا پرزہ۔ اس پر میاں صاحب کا احترام تھا کہ ہر دم ان کے پاؤں کی زنجیر تھا۔ کوئی چیلا اپنے گرو کی یا کوئی مرید اپنے پیر کی اتنی عزت کاہے کو کرتا ہوگا، جتنی یہ اپنے استاد کی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے بچوں اور بھتیجوں کا دل ہاتھوں میں رکھتے تھے۔ ''آج تو ماٹ صاب بچے دیوالی دیکھنے کی ضد کر رہے ہیں...'' شاہدہ باجی دروازے کی اوٹ سے کہتیں۔

''اچھا شاہدہ بی، دکھا لاتا ہوں۔'' ماسٹر صاحب اپنی دھوتی پھٹکار کر ایک کونا تھام بچوں کی پلٹن کو لیے دیوالی دکھانے چل پڑتے۔ پڑھائی کے دوران ہر بیس منٹ کے بعد پانچ منٹ کی چھٹی میاں صاحب کے حکم سے ہوتی۔ اس چھٹی کے بعد بلا ناغہ آدھے طالب علم ان تک پہنچتے۔ باقی چھوٹے فتنے بن بن کر بستر پر پڑ جاتے گویا نیند میں بے ہوش ہیں مگر نہ کبھی ماٹ صاب نے، نہ کبھی ان کے استاد نے اس بات کی سچائی کو پرکھنے کی کوشش کی۔

پڑھائی ضروری تھی مگر صحت بھی ضروری تھی اور بچوں کا جلد سو جانا صحت کے لیے مفید تھا۔ ماٹ صاب کو چلانے کی روز ایک نئی ترکیب سوچی جاتی۔ یہ ترکیبیں کبھی انفرادی ہوتیں کبھی اجتماعی...علاحدہ کی جانے والی ترکیبوں میں پھنسنے کا پلہ سب سے بھاری ہوتا... ان ماٹ صاحب کے عجیب وغریب قصے کنبے میں تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ تائی اماں کے بھائی کی بیماری کا تار آیا۔ تائی اماں جیسی بیٹھی تھیں، اسی طرح سب بچوں کو سمیٹ سماٹ ریل میں سوار ہوگئیں۔ کہیں ان کے کپڑے غسل خانے میں بھیگے پڑے تھے۔ بامن ماٹ صاب نے چھپا چھپ وہ کپڑے دھو الگنی پر پھیلا دیے۔ (ان دنوں وہ فارسی میں ایم اے کر رہے تھے۔ استاد کے گھر ایک علاحدہ کمرے میں رہا کرتے تھے) جب تایا ابا نے ٹوکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے تو انھوں نے سر جھکا کر کہا۔ ''اماں جی میری اماں کے برابر ہیں۔ میں کبھی کبھی ان کی دھوتیاں بھی دھو کر ڈال دیتا ہوں۔ مجھے اس میں سکھ محسوس ہوتا ہے۔'' نہ جانے وہ کیسے

برہمن تھے جو ان کے گلاسوں میں پانی پی لیتے۔ یہ آج تک کسی کو پتا نہیں چلا کہ اس پوری پلٹن کو پڑھانے کا وہ تایا ابا سے کچھ لیتے تھے یا نہیں۔

جب زاہد بھائی شاہدہ باجی کو پڑھا کر چلے جاتے تو اس کی باجی بڑی تیکھی مسکراہٹ لیے ان کے پاس جاتیں اور پڑھائی کے درمیان ہونے والی باتوں پر کانا پھوسی شروع ہو جاتی۔ باجی انھیں چھیڑتیں۔ ''توبہ واقعی، تم کتنی کٹھور ہو، کبھی جو حامی بھر لو۔''

''اللہ بھئی میں کیا کروں۔ یہ نہ جانے سبھی کے سب کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔''

''اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے۔'' ایسے موقعوں پر باجی ضرور گاتیں، ''بھاڑ میں جائے اچھی صورت۔'' شاہدہ باجی خوش دلی سے مسکراتیں۔ ''کوئی دن جا رہا ہے کہ یہ سب پروانے تمھارے اوپر لپکیں گے۔''

''اونھ ہوں... باجی ایسی خوش آئندہ پیشین گوئی پر دل ہی دل میں کھل اٹھتیں۔

پھر ایک دن جب زاہد بھائی شاہدہ باجی کو پڑھا رہے تھے، فرشو بھیا فیلٹ لگائے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھامے اچانک در آئے۔ وہ کہیں اور جاتے ہوئے چند دن یہاں قیام کرنے کے ارادے سے اتر گئے تھے۔ زاہد بھائی کو پڑھاتا دیکھ کر ان کی بلند پیشانی پر بل پڑ گئے اور ناک کے نتھنے پھڑکنے لگے... (یہ اسٹائل انھوں نے بڑی ریاضت کے بعد سیکھا تھا کہ جب ناراض ہوں تو ان کے کڑے تیور دیکھ کر دنیا سہم جائے) مگر شاہدہ باجی ان کے اس واضح غصے کو صاف نظر انداز کر کے ان کا تعارف کروانے لگیں۔ وہیں بعد تعارف فرشو بھیا نے زاہد بھائی کو نتھنے پھلائے پھلائے چند جلی کٹی ذو معنی فقروں میں خاص مسلم سوشل پکچر کے انداز میں سنائیں۔ زاہد بھائی نے نہایت خندہ پیشانی سے صرف اتنا کہا، ''اب آپ کے مہمان آ گئے ہیں، آپ ان کی خاطر تواضع کریں۔'' اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد فرشو بھیا نے اپنی یک طرفہ آفیشل منگیتر کو بھی چند ذو معنی فقروں میں جلی کٹی سنانے کی ٹھانی۔ (یک طرفہ یوں کہ اُدھر سے پیغام آ گیا تھا، اِدھر سے جواب نہیں گیا تھا) شاہدہ باجی نے ان کے جلے کٹے جملوں کے جواب کچھ اس انداز سے دیے کہ انھیں خاموش ہوتے ہی بن پڑی۔ وہ اپنی ناک کے نتھنے پھڑپھڑاتے یہی تیور لیے اندر چلے گئے۔ دوسرے دن زاہد بھائی نہیں آئے اور تائی اماں نے مصلحتاً انھیں

Marfat.com

نہیں بلوایا مگر جب پڑھائی کا وقت ہوا تو شاہدہ باجی نے نوکر بھیج کر انھیں بلوا بھیجا اور ہمیشہ کی طرح کتابیں اٹھا، ان سے پڑھنے جا بیٹھیں۔ ابھی ان کی پڑھائی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ جمیلہ بی نے آکر اطلاع دی۔

''فرشو بھیا جا رہے ہیں، آکر سلام تو کر جاؤ۔''

''ابھی سے... مگر وہ تو کئی دن ٹھہرنے کو کہہ رہے تھے۔''

''پتا نہیں، تیار ہوئے کھڑے ہیں اور کہتے ہیں، اس گاڑی سے جا رہا ہوں۔''

شاہدہ باجی گئیں اور بولیں، ''ارے آپ ابھی سے جا رہے ہیں، آج تو بڑی مشکل سے ابا نے ہمیں آپ کے ساتھ پکچر دیکھنے کی اجازت دی ہے۔''

''اچھا تو نہ جاؤں؟'' وہ بڑے انداز سے گردن موڑ کر بولے۔

''آپ کی مرضی۔'' شاہدہ باجی نے ہنستے ہوئے کہا، ''مگر آپ کو معلوم ہے کہ ہم لوگوں کو پکچر دیکھنے کی اجازت عید بقر عید کو ملتی ہے۔''

''اچھا نہیں جاتے۔'' انھوں نے اپنا فیلٹ اتار کر پھینک دیا اور سوٹ کیس کسی بچے کو تھما دیا اور شاہدہ باجی پھر اپنی پڑھائی کا وقت پورا کرنے زاہد بھائی کے پاس جا بیٹھیں...

انھیں دنوں جب ان کے چچا زاد بھائی علی گڑھ جاتے ہوئے ایک دن کے لیے یہاں ٹھہرے اور انھیں معلوم ہوا کہ فرشو بھیا بھی یہاں آئے ہوئے تھے تو وہ کرید کرید کر بچوں سے پوچھتے رہے کہ ان کے سامنے کیا پروگرام رہے، خصوصاً شاہدہ باجی کیا کرتی رہیں۔ جب انھوں نے تاش کھیلنے کے لیے شاہدہ باجی کو بلایا تو انھوں نے لے کے سارے کنبے کو اکٹھا کر لیا بلکہ زاہد بھائی کو بھی بلوا بھیجا۔ پھر وہ دھما چوکڑی مچی کہ علیگی بھائی آنکھوں آنکھوں میں اپنا التجا آمیز پیغام دینا بھی بھول گئے اور ایک دن رہ کر پھر آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئے۔ تو جب پروانے ان شمعوں پر یوں مر گر رہے تھے، وہ سوچتی تھی کہ کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی تو نہیں دیکھتا کہ وہ ہے بھی یا نہیں۔ جب مہمان چلے جاتے اور بھیڑ چھٹ جاتی تو پھر اس کو تھوڑی سی جگہ لوگوں کی نظروں میں مل جاتی لیکن اب وہ سمجھنے لگی تھی کہ یہ بھی دوسروں کی جوتیوں کا طفیل تھا۔ ولی عہد بھیا صرف باجی کی خاطر اس کی بات مانتے تھے۔ صرف شاہدہ باجی تھیں جو اس کو سچ مچ پیار کرتی تھیں۔ کبھی اس کو بیاہ

Marfat.com

کے نام پر چھیڑتی تھیں، کبھی اس کی ہنسی کی نقل اتارتی تھیں، اس کو نئی فراکیں سی کر دیتی تھیں اور طرح طرح سے اس کے بال بنایا کرتی تھیں مگر انھیں فرصت ہی کم ملتی تھی اور پھر وہ تو کم و بیش سب کو ہی پیار کرتی تھیں۔

اب جوں جوں امتحان نزدیک آ رہے تھے، پڑھائی کا زور بندھ رہا تھا، سب سے زیادہ شاہدہ باجی ہی پڑھتی تھیں۔ ان کا کمرہ الگ تھلگ تھا، اور بعض اوقات رات رات بھر اس کمرے کی بتی جلتی تھی۔ دن میں بھی وہ اکثر کمرے میں بند رہتیں لیکن جب نکلتیں تو ان کا چہرہ ہمیشہ پھول کی طرح کھلا ہوتا۔ جتنی دیر وہ باہر رہتیں اپنی پڑھائی یا امتحان کے بارے میں ایک بات بھی نہ کرتیں بلکہ دوسروں کو چھیڑ چھیڑ کر کھلکھلاتی رہتیں۔ اور سب بھی اپنی اپنی جماعت اور حیثیت کے مطابق پڑھائی میں مشغول تھے، پڑھائی کی یہ گرما گرمی تھی کہ اچانک تائی اماں کے والد کے انتقال کا تار ملا۔ اب جتنا تائی اماں کے والد کے انتقال پر جانا ضروری تھا، اتنا ہی امتحان نزدیک ہونے کے سبب بچوں کا نہ جانا ضروری تھا۔ چناں چہ تایا ابا نے چھٹی لی اور تائی اماں برقع اوڑھ کر ساتھ ہولیں۔ گھر کے اور کسی کام میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ جاتے جاتے تائی اماں نے اور ماؤں کی طرح ہدایتوں اور نصیحتوں کے پلندے نہیں دیئے اور تایا ابا نے صرف روز چالیس چکر صحن کے لگانے، مچھلی کا تیل پینے اور گہرے سانس لینے کی ہدایت کی اور کام اسی ڈھرے پر ہوتا رہا۔ وہی ان سب کا تیار ہوکر، جلدی جلدی ناشتا کر اپنی اپنی درس گاہوں کو جانا۔ وہی سنجید پا کا ماما کا ہاتھ بٹانا۔ وہی مغلانی کا آکر ستر گھروں کے قصے سر پر برقع ڈالے ڈالے سنانا اور کام بتانے پر کل ضرور، ضرور آنے کا وعدہ کر کے دوسرا گھر جھانکنا۔ وہی ساری لڑکیوں کا ایک چھپکلی دیکھ کر تری بری ہونا اور ہائے واویلا مچانا۔ اور ولی عہد بھائی کا چپل سے چٹاخ سے مار کر اس کی بل کھاتی دم کو کاغذ کے پرزے پر اٹھا کر لڑکیوں کے پیچھے بھاگنا، لڑکیوں کا غراروں میں الجھ الجھ کر گرنا، بگڑنا۔ قسما قسمی اور آخر کار چھپکلی کو انار کی کیاریوں مین گاڑ کر دیپنے کو چولھے میں رکھ دینا۔ وہی زاہد بھائی اور ماٹ صاحب سے پڑھنا۔ وہی بلیک آوٹ اور وہی کرفیو آرڈر... البتہ اتنے دنوں میں نہ کسی نے صحن کا ایک چکر لگایا نہ مچھلی کے تیل کا چمچہ چکھا اور نہ گہرے لمبے سانس لینے کی تکلیف گوارا کی، بہت ہوا تو شام کو ذرا کی ذرا بیڈمنٹن کے الٹے سیدھے ہاتھ مار لیے۔ جب سنجید پا سے کھیلنے کو کہا جاتا تو وہ بڑبڑاتی ہوئی

Marfat.com

سیدھی ماما کے پاس جاکر پیڑھی پر بیٹھ جاتیں اور ہاتھ تاپنا شروع کر دیتیں اور پھر یاد کر کے کہ ابھی تو گرمیاں ہیں، ہاتھ کھینچ لیتیں اور کوئلے سے زمین پر لکیریں بنانے لگتیں گویا اپنی تقدیر کی ٹیڑھی میڑھی لکیروں کی اصلاح کر رہی ہوں۔

ایک صبح شاہدہ باجی ہمیشہ کی طرح مسکراتی ہوئی نہ آئیں۔ باجی نے جاکر دیکھا کہ ان کے سر میں سخت درد ہے۔ اسپرو گرم چائے کے ساتھ دی گئی اور سونے کی تلقین کی گئی مگر جب وہ سو کر اٹھیں تو درد پہلے سے زیادہ تھا۔ فیملی ڈاکٹر گوپال سنگھ جو تایا ابا کے دوست تھے، آئے اور دوائیں دی گئیں، سر میں تیل کی مالش کی جاتی رہی مگر درد بڑھتا ہی رہا۔ تایا ابا کو ان کی بیماری کا تار دے دیا گیا۔ جس وقت تایا ابا اور تائی اماں پہنچیں، اس وقت یہ حالت تھی کہ وہ بے چین ہو ہو کر اپنی ٹانگیں اور ہاتھ پٹیوں پر مارتی تھیں۔ بال تیل لگا لگا کر جٹا دھاری فقیروں کی طرح الجھ گئے تھے، ان کو دیکھ کر انھوں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر دوسرے ہی لمحے مسکراہٹ کی جگہ کرب نے لے لی اور وہ ہائے ہائے میں سب کچھ بھول گئیں۔ کئی دن ہو گئے، کئی ڈاکٹر آئے مگر نہ ان کے علاج سے افاقہ ہوا نہ ہی مرض ان کی سمجھ میں آیا۔ ریڑھ کی ہڈی سے پانی نکالا گیا جس کی تکلیف سے وہ بیمار بھینس کی طرح ڈکراتی رہیں۔ تکلیف بڑھتی رہی مرض سمجھ میں نہ آتا تھا۔ صرف تجربے ہو رہے تھے اور مرض کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ باجی تھیں جو چوبیس گھنٹے ان کے کمرے میں رہتی اور تیمارداری کرتی تھیں۔ تائی اماں اور دوسری بہنوں کو رونے اور دعا مانگنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا، بچے سہمے سہمے پھرتے رہتے تھے... ایک دن جو وہ سو کر اٹھے تو دیکھا گھر میں ایک خاموش سراسیمگی کا عالم ہے۔ بڑی بہنیں دور کونے میں کھڑی شاہدہ باجی کے کمرے کی طرف دیکھ رہی ہیں، سنجیدہ آپا اور تائی اماں آنچل پھیلائے دعا مانگ رہی ہیں اور آنسوؤں کی دھار گنگا جمنا کی طرح بہہ رہی ہے... انھیں بتایا گیا کہ شاہدہ باجی کو آکسیجن دی جا رہی ہے اور اب وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔

ذرا دیر بعد تایا ابا کمرے سے نکلے۔ ان کا چہرہ دھلے لٹھے کی طرح سفید تھا۔ انھوں نے بڑے صبر سے دانت بھینچے بھینچے کہا۔

"جاؤ بھئی جاؤ شاہدہ تمھیں بلا رہی ہے۔" لڑکیاں تیزی سے اُدھر لپکیں۔ بچے ٹھٹک گئے تھے۔ تایا ابا نے انھیں بھی اندر جانے کا اشارہ کیا اور پھر تائی اماں کو سہارا دے کر

Marfat.com

لائے۔ پیچھے پیچھے لڑکھڑاتے ہوئے سارے بھائی بھی تھے۔ اب پورا گھر شاہدہ باجی کے پلنگ کے چاروں طرف کھڑا تھا۔ مغلانی ان کے سرہانے بیٹھی یٰسین پڑھ رہی تھی۔ شاہدہ باجی نے اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے ایک نظر سب کو دیکھا... مسکرانے کی کوشش کی اور آنکھیں موند لیں۔ مغلانی نے انا للہ پڑھی اور چادر اوپر تک کھینچ دی۔ سب دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ لڑکیاں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ لڑکے ستونوں سے لگ کر کھڑے ہوگئے، بچے بے تحاشا بلک بلک کر رونے لگے اور تائی اماں سینہ کوٹنے لگیں۔ وہ ابھی تک شاہدہ باجی کے کمرے میں کھڑی سب کو حیرت سے دیکھ رہی تھی، آنسو اس کے گالوں پر بھی بہ رہے تھے، اس نے دیکھا کہ تایا ابا دعا کے انداز میں ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں، ''مولیٰ تو تنکے میں جان ڈال دیتا ہے، میری بچی کو زندہ کردے۔'' ان کی آنکھیں خشک تھیں اور معلوم ہوتا تھا، انھیں اپنی دعا کے قبول ہوجانے کا یقین نہیں تو گمان ضرور ہے۔ بی مغلانی نے دوپٹہ آگے کھینچ کر کہا، ''بس بھائی صاحب اب کچھ نہیں رہا، دعا کا وقت بھی گزر چکا، اب مغفرت کی دعا کیجیے۔'' دفعتاً تایا ابا چونکے، جیسے وہ ابھی سوتے سے اٹھے ہوں۔ آنکھیں پھاڑ کر سفید چادر کی طرف دیکھا۔ آنسو ان کی سفید داڑھی کو بھگونے لگے اور وہ سیدھے اپنی بیٹھک میں نکلے چلے گئے۔

مرنے والے مرتے ہیں اور دوسروں کو پوری طرح اپنے غم کے حوالے بھی نہیں کرجاتے۔ ان کو فوراً ہی عزیزوں کو اطلاع دینے اور مرنے والے کو کفنانے دفنانے کی فکر لگ جاتی ہے۔ چناں چہ یہاں بھی ڈھیر سے تار دیے گئے، کچھ خطوط لکھے گئے اور پھر ایک یوپی لاری کا انتظام کیا گیا جس میں شاہدہ باجی کی نعش اپنے وطن پہنچا کر خاندانی قبرستان میں دفن کی جائے۔ سب کی پڑھائیاں دھری کی دھری رہ گئیں اور لمبی سی بس میں اپنی عزیز نعش کو سفید کفن میں لپیٹے سب وطنِ عزیز کی طرف روانہ ہوگئے۔ درمیان میں چارپائی پر نعش دھری تھی اور دونوں طرف سیٹوں پر سب بیٹھے تھے۔ جھٹکا لگنے سے جب کبھی نعش کا سر یا ہاتھ ہلتا تو صبا کو یوں لگتا جیسے ابھی شاہدہ باجی مسکراتی ہوئی اٹھ بیٹھیں گی، اپنا مخصوص زوردار قہقہہ لگا کر، کفن پھاڑ کر سب کو گلے لگائیں گی۔ ''یہ بھی اچھا مذاق رہا، ہے نا۔'' وہ اسی امید میں کئی کئی منٹ تک ہلتی ہوئی سرد نعش پر نظریں جمائے رکھتی لیکن شاہدہ باجی جو ہر وقت مسکراتی، ہنستی اور کھلکھلاتی رہتی تھیں، اسی طرح لمبی لمبی لیٹی رہیں، یہاں تک کہ پتلی

Marfat.com

پتلی سڑکوں اور گڑھوں سے بنی ہوئی گلیوں میں سے گزرتی ہوئی بس ان کے محلے میں پہنچ کر ان کے گھر کے سامنے رک گئی۔ ایک مرتبہ پھر ٹھہرا ہوا رونے کا طوفان اٹھا۔ نعش اتار کر اپنے آبائی مکان کے صحن میں رکھ دی گئی۔ اور دور و نزدیک کے عزیز اس جوان موت کی خبر سن کر بے تحاشا لپکے چلے آئے تھے، سب شاہدہ باجی کی نیک دلی اور ذہانت کی تعریف کر رہے تھے۔ شام تک آس پاس کے شہروں کے عزیز بھی آپہنچے۔ رات کی گاڑی سے فرشو بھیا اور علیگی بھائی بھی آگئے۔ اس وقت اسے شاہدہ باجی کے وہ ترکی ٹوپی والے ماسٹر صاحب یاد آئے جو اپنی اسی بیٹھک میں جہاں شاہدہ باجی کو پڑھایا کرتے تھے، اکیلے بیٹھے زار و قطار رو رہے تھے۔ تو سب شاہدہ باجی سے اتنی محبت کرتے تھے... انھوں نے اپنے پیار میں کس طرح پرانے دقیانوسی خیالات کے عزیزوں، مغلانی اور ماما، ترکی ٹوپی والے اور بامن ماٹ صاحب کو اور نئے جگمگاتے سوٹ پہننے اور انگریزی بولنے والے رشتے کے بھائیوں کو لپیٹ رکھا تھا، اسے حیرت تھی۔

شاہدہ باجی کی اس باغ و بہار شخصیت کو دیکھ کر اس نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ وہ بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرے گی مگر وہ اسے کسی منزل کا پتا دیے بغیر خود چپ چاپ آگے بڑھ گئی تھیں۔

○○○

Marfat.com

۱۱

اس کی اور شاہدہ باجی کی شخصیت میں ایک بنیادی فرق تھا۔ شاہدہ باجی خود سے ہر کسی سے اور حالات سے بے حد مطمئن نظر آتی تھیں لیکن وہ اس شہزادی کی طرح جس کے محل میں سب کچھ ہو صرف ایک ناچنے والی سنہری چڑیا اور گانے والے درخت کی کسر ہو، افسردہ اور مضمحل رہتی تھی۔ اور اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کون سی سنہری چڑیا اور گانے والے درخت کی کمی محسوس کرتی ہے اور وہ کہاں سے اور کیوں کر ملے گا لیکن ایک کمی ایک خلا کا احساس اس وقت بھی اسے تھا جو دوسروں کی باتوں میں دلچسپی لینے کے بجائے اسے بادلوں کے رنگ برنگے ٹکڑوں کے رنگ محل بنانے پر اکساتا تھا۔ اور ایسی اَن جانی اور ان ہونی باتوں کے بیج دل میں ڈالتا تھا جو کوئی سن لے تو ہنستا ہنستا دہرا ہو جائے۔ اس کے خواب بھی اسی طرح ادھورے ادھورے بے معنی سے ہوتے تھے جو دل میں ایک کسک سی چھوڑ جاتے تھے اور شاہدہ باجی کے مرنے کے بعد یہ خلا کچھ اور زیادہ ہو گیا۔ بادلوں کے بے معنی قلعوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا کہ شاہدہ باجی آسمان پر سے پردہ اٹھا کر جھانکیں گی اور ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہیں گی، ''مجھے ذرا ہنس کر تو دکھا'' اور پھر اسے گدگدانا شروع کر دیں گی۔

شاہدہ باجی کو دفن کر آئے تو گھر کی فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ اتنا بڑا گھر ایک آدمی کے نہ ہونے سے بھائیں بھائیں کرتا نظر آتا تھا۔ جس دن واپسی ہوئی، ایف اے کے امتحان کا پہلا پرچہ تھا۔ سب یہ سوچ سوچ کر روتے رہے کہ آج شاہدہ باجی زندہ ہوتیں تو کس طرح نفاست سے کپڑے پہن کر چنا ہوا دوپٹہ اوڑھ کر اپنی قمیص کے گریبان میں

نازک سا قلم لگا کر ہنستی کھلکھلاتی امتحان دینے جاتیں۔

سب نے جوں توں امتحان دے ڈالا۔ امتحان ختم ہوتے ہی باجی بالکل کھاٹ سے لگ گئیں۔ پہلے بھی ان کو ہلکا ہلکا بخار تھا مگر امتحان کی وجہ سے وہ آرام نہ کرسکیں۔ محبوب دوست کی جدائی، تیمارداری کی تھکاوٹ اور شب بیداریاں رنگ لائے بغیر نہ رہیں۔ تمتمائے ہوئے چہرے کو چادر میں ڈھانپے وہ شاہدہ باجی کو یاد کر کے روتی رہتیں۔ ان کی تیمار داری مختلف اوقات میں مختلف لوگ کرتے، ولی عہد بھائی کو جب وقت ملتا، آ کر بیٹھ جاتے، کبھی سر دبانے کی فرمائش، کبھی کچھ پڑھ کر سنانے کی، باجی پہلے تو آہستہ سے منع کرتیں لیکن جب وہ اکیلی مکھی کی طرح چمٹے چلے جاتے اور پیچھا نہ چھوڑتے تو وہ جھنجلا کر سر سے پیر تک چادر تان کے کروٹ بدل لیتیں۔ گھر کی وحشت دیکھ دیکھ کر اس کا دل بھی گھبرا اٹھا تھا اور شاید اس کی باجی کا بھی کہ انھوں نے امی کو لکھ دیا، ''میں بیمار ہوں اور اپنے گھر آنا چاہتی ہوں۔'' چناں چہ بابا لینے آپہنچے اور یہ تینوں چھکا چھک پھر اسی سمت رواں دواں ہوگئے جہاں سے حصولِ تعلیم جیسے مقصد کے لیے لائے گئے تھے۔

رزلٹ نکل آیا۔ وہ اپنی کلاس میں فرسٹ آئی تھی۔ باجی اور بڑے بھائی بھی پاس ہوگئے تھے۔ چھٹیاں ختم ہوگئی تھیں اور اب انھیں قاعدے سے واپس جانا چاہیے تھا۔ لیکن باجی نے چاق چوبند ہوجانے کے باوجود وہاں جانے سے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ تائی اماں خود ان کے سفید دوپٹوں، خالی ڈنڈا سے ہاتھوں (کہ اس زمانے کی فیشن یہی تھی) ہلکی ہلکی خوش بوؤں اور سب سے زیادہ اپنے بیٹے کے دل کا پلڑا اس طرف بے تحاشا جھکتے دیکھ کر ان کو بلانے کے حق میں نہیں تھیں۔ ولی عہد بھائی تھرڈ ایئر میں نہایت شان دار طریقے سے فیل ہوگئے تھے۔ تائی اماں نے اس کا کچھ الزام باجی پر اور باقی تایا ابا پر ڈال دیا۔ نگوڑ مارا تھرڈ ایئر کا امتحان بھی کوئی امتحان ہے۔ گھر کی کھیتی تھی، سارے پروفیسروں نے اس خیال سے کہ بہن کی بیماری میں پڑھا نہیں، اسے پاس کردیا اور ان پتھر دل باپ نے بیٹے کو اپنے ہی مضمون میں فیل کردیا۔

تایا ابا کی اس حرکت پر اور بھی بہت سے لوگوں نے احتجاج کیا لیکن ان کے اصولوں پر کسی کا بس نہ چلتا تھا، لہٰذا سب خاموش ہوگئے اور اب ان تینوں کی تعلیم کی گاڑی چند قدم گھسٹ کر پھر کھڑی ہوگئی۔ اس دفعہ بابا نے چھٹی لے کر منجھلے بھائی کے گھر جانے کا

Marfat.com

پروگرام بنایا۔ ان کے پہنچنے کے چند ہی دن بعد ان کے دونوں بیٹے علی گڑھ سے خاص علی گڑھ اسٹائل کی پتلی پتلی کمریں لیے، سوٹ ڈاٹے بڑی ہی Scholarly Air لیے وہاں آ پہنچے۔ جب یہ علی گڑھ سے آتے تو منجھلی تائی گھر کی صفائی اور سفیدی اس اہتمام سے کراتیں گویا کوئی برات اترنے والی ہے۔ بڑے بیٹے کی پیدائش سے قبل خریدے گئے بڑے سے کلاک کو صاف کر کے تیل دیا جاتا، الماریوں میں اخبار کے کاغذوں کی جھالر بنا کر لٹکائی جاتی۔ برآمدے میں بچھے ہوئے سبز تخت پر روغن کروایا جاتا۔ مونڈھوں پر ازسرِ نو پھول دار غلاف چڑھائے جاتے۔ اور تو اور چھت سے چار فٹ نیچی مچان پر جو کتابوں اور رسالوں کا انبار تھا، اسے بھی جھاڑ پونچھ کر درست کیا جاتا۔ پلنگوں پر بیٹھ کر کھانے کا سسٹم چند روز کے لیے ختم کر دیا جاتا اور لکھنے کی ایک ہاتھی جیسی وزنی میز برآمدے میں رکھ کر اس پر سفید چادر ڈال دی جاتی اور اردگرد کرسیاں رکھ دی جاتیں۔ جس وقت یہ دونوں صاحب زادگان جاتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے بیٹی کا جہیز تیار ہو رہا ہے۔ مارا مار سویٹر تیار ہو رہے ہیں، لحاف گدے اور تکیے نئے بن رہے ہیں۔ دالان میں پھیلا پھیلا کر لحاف میں لہریا دھاگے ڈالے جا رہے ہیں۔ بازار کے چکر پہ چکر لگ رہے ہیں۔ شیروانی درزی کو سینے دی گئی ہے۔ نئی ٹائیاں، رومال اور موزے آ رہے ہیں۔ چادروں کے لیے لٹھا پھاڑ کر کنارے سیے جا رہے ہیں اور دھڑا دھڑ سفید پجاموں کی سلائی ہو رہی ہے گویا نیلام کے لیے مال تیار ہو رہا ہے۔

یہ سب اس دفعہ بھی ہوا اور یہ منظر دیکھ دیکھ کر اس کے دل میں پھر تعلیم کی عظمت کئی گنا بڑھ گئی۔ لیکن اب ان کی تعلیم کی کشتی بیچ منجدھار میں ڈول رہی تھی اور ڈوبا ہی چاہتی تھی کہ ایک بار پھر اسے سہارا ملا۔ شاید منجھلی تائی کو ان کی تعلیم کی لہلہاتی کھیتی یوں جھلستی دیکھ کر رحم آ گیا تھا۔ بہر حال یہ طے پایا کہ یہ تینوں اب منجھلے تایا کے ہاں رہ کر تعلیم پائیں گے۔ بابا تو سدا چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر گھومتے تھے۔ یوں تو گاؤں کی سرسبز لہلہاتی راجدھانی کچھ اور ہی چیز تھی۔ چناں چہ تعلیم کی کشتی پر سے خطرے کا جھنڈا اتار کر ایک دفعہ پھر پتوار سنبھال لیے گئے اور یہ کشتی پھر رواں دواں ہوگئی۔

اب جتنا فرق اسماعیل گرلز ہائی اسکول اور دربار گرلز ہائی اسکول میں تھا، اتنا ہی فرق بڑے اور منجھلے تایا کے گھر کے ماحول میں تھا، بڑے تایا عملاً نہیں تو اصولاً گھر میں

Marfat.com

دلچسپی لیتے تھے مگر منجھلے تایا کو گھر کی کسی بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ گھر کی ملکہ سیاہ کرے یا سفید، ان کے اپنے کسی کام میں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے، ورنہ وہ اس زور سے دھاڑتے کہ گھر کے در و دیوار تک لرز اٹھتے۔ علی گڑھ میں پڑھنے والے "اسکولرز" تک ان سے اتنا خوف کھاتے تھے کہ ایسے ویسے وقت ان کے سامنے نہ پڑتے تھے اور جو وہ کبھی بلا بھیجتے تو ان سپوتوں کے منہ فق ہو جاتے تھے۔ منجھلے تایا کی تنخواہ خاصی تھی، گزیٹیڈ پوسٹ تھی مگر رہن سہن پرانے اسٹائل کا تھا۔ کچھ تائی کے کھلے اخراجات، علی گڑھ کے خرچ، کچھ مسجدوں اور یتیم خانوں کی سرپرستی کے سبب ان کا ہاتھ ہمیشہ تنگ ہی رہتا تھا جس کا انتظام منجھلے تایا کو بتائے بغیر وہ بالا ہی بالا کرتی تھیں... یہاں لڑکیوں پر پابندیاں زیادہ تھیں۔ اس تک کو بغیر اجازت پڑوس کی سہیلیوں کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی۔ باجی کو برقعے کی نقاب ڈالنے، گرل گائیڈ نہ بننے اور لڑکیوں کو گھر پر بلانے کی دعوت منظور نہ کرنے کی ہدایت تھی۔

اب جہاں اسماعیل گرلز اسکول سیدھا سادا چھوٹے چھوٹے کمروں والا معمولی سا اسکول تھا، وہاں دربار گرلز اسکول کی تاریخی اہمیت تھی۔ یہ کسی زمانے میں راج محل تھا اور نیا محل بن جانے کے بعد اسے لڑکیوں کا اسکول بنایا گیا تھا، گزوں اونچی فصیل کے اندر بکھری ہوئی بہت سی عمارتیں تھیں جن میں کہیں کلاسیں تھی اور چند عمارتیں استادوں کو رہنے کے لیے دے دی گئی تھیں۔ اس اسکول میں داخل ہونے کا صرف ایک دروازہ تھا جو مضبوط لوہے کا پانچ گز اونچا پھاٹک تھا۔ اس میں ہر وقت ایک بڑا سا تالا لگا رہتا تھا جو صرف بسوں کو اندر لانے اور نکالنے کے وقت کھلتا تھا۔ ضروری آمد و رفت کے لیے چھوٹی سی ایک کھڑکی کھلی رہتی تھی۔ اسکول کی کلاسیں بڑی بڑی، ٹھنڈی اور تاریک تھیں۔ چھت پر رنگین تصویروں کا حاشیہ تھا جس میں چمکیلے گھگرے اور چولی میں تیکھے نقوش والی راجپوت عورتیں بنی تھیں۔ سفید دیواروں پر سنگین تھامے ہاتھی سواروں کے ابھرے ہوئے نقوش تھے۔ صبا نے سن رکھا تھا کہ راج محل سے کئی سرنگیں پہاڑ پر بنے ہوئے قلعے تک جاتی تھیں۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ آپا جی کے سلائی کے کمرے میں پڑے ہوئے تختے اٹھا کر سرنگ میں جا داخل ہو۔ لمبی تاریک سرنگ میں چلنے کا تصور ہی اسے بڑا دل فریب لگتا۔ بڑے سے اندھیارے ہال کے آگے جالی لگا ہوا ایک کمرہ تھا جس کی محراب دار کھڑکیاں باہر سے بڑی رومانٹک نظر آتی تھیں۔ باہر سے یہ کمرہ ہوا میں معلق نظر آتا تھا جو گلاب ساگر کے عین اوپر

Marfat.com

واقع تھا۔ یہاں سے گھاگرے ہلاتی پیتل کے چمچماتے برتن لیے ہنستی بولتی عورتیں سیڑھیاں اتر کر پانی بھرتی نظر آتی تھیں۔ قلعے کے اوپر نیلے آسمان پر چیلیں اڑتی تھیں اور فرصت کے اوقات میں لڑکیاں سبز پانی کے اوپر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا لطف اٹھانے یہاں آ بیٹھتی تھیں اور پکے راگ یا فلمی گانے گاتی تھیں۔ ان کی آوازیں گلاب ساگر کے پار پہاڑیوں سے ٹکرانے لگتیں اور پانی بھرنے والی عورتیں مورنی کی طرح گردن اٹھا اٹھا کر اوپر دیکھنے کی کوشش کرتیں۔

جس دن بارش ہوتی جانے کہاں کہاں کا پانی سیڑھیوں پر آبشار کی طرح گرتا ہوا، گلاب ساگر میں آ کر ملنے لگتا۔ بارش کی جھڑی میں اتنا بڑا قلعہ دھندلا جاتا تھا، پھر مینڈکوں کی طرح لڑکے بالے آ کر گلاب ساگر میں تیرنے لگتے اور ان کا تماشا دیکھنے کے لیے آدھا اسکول یہاں ٹوٹ پڑتا...

اسماعیل اسکول میں ڈھیلے اور تنگ پجاموں اور چنے دوپٹوں کا زور تھا تو یہاں اس سرے سے اس سرے تک ساریوں، نت نئے جوڑوں اور نئی نئی بندیوں کی حکومت تھی... وہاں میلاد شریف، مشاعروں اور پردہ باغ کی پارٹیوں کے ہنگامے تھے تو یہاں کماری سبھا، کوی سمیلن اور ناچ گانے کی محفلیں تھیں۔ مگر یہاں کچھ ایسا بٹوارا تھا کہ تمام مسلمان لڑکیاں اردو اور تمام ہندو لڑکیاں ہندی پڑھتی تھیں۔ ہندو لڑکیوں کے پاس میوزک تھی تو مسلمان لڑکیاں اس کے بجائے ڈرائنگ لینی ضروری سمجھتی تھیں۔ چناں چہ انھوں نے بھی ان کی تقلید کی۔

یہ اسکول اس ریاست میں لڑکیوں کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا مگر زیادہ سے زیادہ رعایتیں اور اچھے سے اچھا اسٹاف ہونے کے باوجود مقامی لڑکیاں گنتی کی تھیں۔ ان میں سے کئی ایک کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ دو ایک بچوں کی مائیں بھی تھیں، اپنے رنگ برنگے گھاگروں، اوڑھنیوں، ہاتھی دانت کے چوڑوں، ناک میں لونگوں اور احساسِ کم تری کے ہاتھوں شرمائے لجائے چہرے لیے یہ لڑکیاں الگ نظر آتی تھیں۔ باقی ہندوستان کا کون سا صوبہ تھا جس کی لڑکیاں یہاں نہ ہوں۔ پنجابی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، یوپی ہر جگہ کا دانہ موجود تھا اور خاصی وافر تعداد میں... استانیاں بھی اسی طرح مختلف صوبوں کی تھیں۔

Marfat.com

مسز بھٹناگر جنھوں نے آئی ٹی کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی تھی اور ایم اے کرنے کے بعد انگلینڈ بھی ہو آئی تھیں، یہاں کی سب سے مشہور شخصیت تھیں۔ ان کو دیکھ کر اب کوئی کاہے کو یقین کرتا کہ وہ کبھی فیشن ایبل ہوں گی اور سائیکل اڑائے کالج جاتی ہوں گی۔ اب تو یہ عالم تھا کہ گیروے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی سلوٹیں پڑی ساری ان کے جسم پر چڑھی رہتی۔ چھپکلی کی دم ایسی مڑی ہوئی پتلی سی چٹیا، ایک ہاتھ میں ڈھیر ساری کاپیاں سینے سے ٹکائے، دوسرے ہاتھ میں اپنی بچیوں کا منا سا ناشتے دان تھامے تھل تھل کرتی سیڑھیاں اترتیں۔ آگے پیچھے ان کی بچیاں نیچی نیچی فراکیں پہنے ماں کے انداز کی چوٹیاں باندھے بس میں چڑھنے آتیں۔ یہ مسز بھٹناگر اردو ایسی فصاحت و بلاغت سے بولتیں کہ بڑے بڑے اردو داں شرما جائیں۔ مگر جب لڑکیوں کی ہندی کی کاپیاں درست کرتیں تو گول گول دائرے کھینچ صفحے سرخ کر دیتیں اور تیر کھینچ کر لکھ دیتیں، ”یہ اردو شبد ہیں۔“ اردو اور ہندی کے ساتھ ساتھ ان کی انگریزی بھی غضب کی تھی۔

کملا دیوی جو ہسٹری میں ایم اے تھیں، ہو بہ ہو ان کا نمونہ تھیں۔ فرق تھا تو یہ کہ کملا دیوی سوکھی اچھور تھیں اور سفید دھوتی باندھتی تھیں۔ ان دونوں کی بچیوں میں یہ پہچاننا دشوار تھا کہ کون سی مسز بھٹناگر کی ہیں اور کون سی کملا دیوی کی۔

اب رہیں لکھنؤ کی کائستھ مس سکینہ۔ یہ بھی ایم اے تھیں اور پڑھائی سے زیادہ لڑکیوں کے ٹیسٹ سنوارنے کی فکر میں رہتی تھیں۔ اچھے کپڑے پہننے والی لڑکیاں ان کی کمزوری تھیں اور کپڑوں کی طرف سے لاپرواہ لڑکیاں ذہنی طور پر ان کی دشمن تھیں۔ اس طرح اس کی باجی ان کی فیورٹ تھیں اور وہ اگر ان کی نظر میں قابلِ التفات ہوتی تو وہ اس کی لاپروائی سے ضرور چڑتیں مگر کم عمر اور نیچی کلاس کی لڑکیوں کی طرف دیکھنا بھی وہ مشکل سے گوارا کرتی تھیں۔ خود ہمیشہ صاف ستھری نکھری نکھری رہتی تھیں۔ مس دوبے برہمن تھیں۔ خوش شکل و خوش لباس، مس سکینہ اور مس دوبے دونوں اسکول ہی میں رہتی تھیں، آپس میں دوستی بھی تھی مگر دوستی کی حد تک کھانے پینے کے معاملات میں مس دوبے ان سے بھی چھوت چھات برتنے کی قائل تھیں... مس کوٹھا والا جو انگلینڈ سے ڈومیسٹک سائنس میں کچھ تیر مار آئی تھیں، پارسی تھیں۔ کھلتا ہوا رنگ، ہمیشہ بھڑک دار، پھول دار ساریاں باندھتیں، باتوں کی شوقین تھیں جس میں اپنے منگیتر فیروز سے ان کے معاشقے کا ذکر سنہری

Marfat.com

الفاظ میں ہوتا۔ کبھی اسٹاف روم کے سامنے سے گزر جاؤ تو ممکن نہ تھا کہ مس کوٹھا والا کی تیز تیکھی آواز کانوں کے پار نہ ہو لیکن لڑکیوں میں بے حد خاموشی چاہتی تھیں، چنچل اتنی کہ پانچ منٹ سے زیادہ کسی کلاس میں نہ ٹھہرتیں۔ خود لڑکیوں کو کپڑے دھونے کی اجازت دے کر چلی جاتیں اور لڑکیاں دھوبی کے گھر کے دھلے ہوئے کپڑے ڈھیر ڈھیر سے صابن میں چار پانچ دفعہ نکال کر ان پر بیس بیس مرتبہ استری پھیر کر رکھ دیتیں۔ اس کے باوجود نمبر دینے میں ہمیشہ کنجوسی سے کام لیتیں۔ پکانے کی کلاس میں بھی یہی ابتری رہتی۔ وہ میدہ، بیسن، گھی اور شکر بانٹ الماریاں کھلی چھوڑ کر چلی جاتیں، یہاں لڑکیاں خشک میوے نکال کر کھاتیں۔ کسی گروپ کا کھانا خراب ہوجاتا تو چیز کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دی جاتی اور ٹین میں سے از سرِنو میدہ اور گھی نکال لیا جاتا۔ کھانے کی ساری چیزیں اسکول کی تھیں، اس لیے کسی کو درد نہ ہوتا۔

ہیڈ مسٹریس تین فٹ چند انچ کی مرہٹن تھیں، اپنے خاص انداز سے دھوتی باندھتی تھیں لیکن کیا رعب تھا ان کا لڑکیوں، اسٹاف اور دوسرے لوگوں پر۔ آج تک اس نے کبھی کسی کو ڈانٹتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن ان کے نام سے ہی لوگ کانپتے تھے۔ ایک قابل منتظم کی طرح اسکول کی ہر چھوٹی بڑی بات ان کی نظر میں رہتی تھی۔ وہ خود بھی اسکول کے احاطے ہی میں رہتی تھیں اور اسکول ختم ہوتے ہی وہ ننگے پاؤں اکثر اسکول کے چکر لگاتیں نظر آتیں۔ مسز پنڈھارکر دوسری مرہٹن استانی تھیں جو موسیقی کی تعلیم دیتی تھیں... میوزک روم ہمہ وقت طبلے کی تھاپ اور تان پورے کی گونج سے گونجتا رہتا تھا۔ ایک کلاس جاتی تھی، دوسری آن موجود ہوتی تھی، وہ خود ستار کی ماہر تھیں اور خالی اوقات میں خاص طور پر شوق رکھنے والی لڑکیوں کو ستار اور ناچ سکھایا کرتی تھیں۔ ان کی آواز میں اتنی پختگی، اتنا رس تھا کہ بڑی بڑی کانسرٹ میں شمالی ہندوستان سے آئے ہوئے استادوں سے ٹکر لیتیں اور واہ واہ کروائے بغیر نہ چھوڑتیں۔ میوزک روم کے برابر ہی ڈرائنگ کلاس سیکڑوں ماڈل اور چارٹ سے بھرا پڑا تھا۔ میوزک روم میں نہ جانے کتنے ساز تھے، سلائی کی کلاس میں دس بارہ مشینیں تھیں۔ کھانا پکانے کی کلاس ہمیشہ آٹے، میدے، گھی اور دودھ سے بھری رہتی تھی۔ دھلائی کی الماری میں طرح طرح کے صابن، کلپ اور رنگ کے علاوہ سیکڑوں برتن تھے، کھیلنے کا کمرہ بیسیوں بیڈمنٹن ریکٹ، چڑیاں اور طرح طرح کے اِن ڈور گیمس سے بھرا

Marfat.com

پڑا تھا۔ لمبے تاریک ہال میں ٹیبل ٹینس کی دو میزیں تھیں جہاں دن میں لائٹ جلا کر کھیلا جاتا تھا اور یہیں چاروں طرف بڑی بڑی الماریوں میں کتابوں کا بڑا اچھا مجموعہ تھا۔ کھیلوں کے مقابلوں کے دنوں میں لڑکیوں کے کپڑے اسکول کی طرف سے بنائے جاتے۔ سفید شلوار قمیص اور بسنتی دوپٹے اور ان لوگوں کے لیے اکثر کھانے اور پینے کا بندوبست بھی کیا جاتا۔ تعلیم کے علاوہ آئے دن مباحثے۔ ہر ہفتے ''کماری سبھا'' جس میں تمام کلاسیں حصہ لیتیں۔ ہر ہفتے میں ایک دن آخری پریڈ گرلز گائیڈ کے مشغلوں کے لیے وقف ہوتا۔ کبھی کبھی یہ لوگ ریاست کی تمام گرلز گائیڈ کے ساتھ دور دور سیر کرنے جاتیں۔ غرض تعلیم کے یہ رہ نوردان آسائشوں کے درمیان ایک بار پھر اپنی تعلیم کی سوکھی کھیتی کو سیراب کرنے لگے۔

○○○

Marfat.com

۱۲

صبا جب تک اسکول میں رہتی، بڑی خوش رہتی لیکن گھر پر اس کا دل نہ لگتا۔ اسے پوری طرح یہ احساس تھا کہ یہ اس کا گھر نہیں ہے۔ کبھی کسی چیز کو اس کا دل چاہے تو وہ کسی سے کہہ نہیں سکتی۔ چناں چہ جلد ہی اس نے اپنے دل کو مارنا سیکھ لیا۔ باجی کی کلاس ٹیچر مس سکینہ تھیں۔ کچھ ان کا فیور جیتنے کے لیے اور علی گڑھ کی اکتسابی عادت کہ وہ اب بھی خاصے سلیقے کے کپڑے پہن کر نکلتیں، ان کا پچھلا اثاثہ اور ان کو اچھی طرح رکھنے کے ڈھنگ کی وجہ سے ان کے پاس خاصے کپڑے تھے لیکن وہ اور بڑے بھائی پھٹیچر نظر آتے۔ ان کے بڑھتے بدن میں گویا کانٹے بھی نکلتے آرہے تھے کہ جو کپڑا پہنتے دو چار دفعہ میں گھس کر تار تار ہو جاتا۔ اُدھر جوں جوں جنگ کی وجہ سے مہنگائی بڑھ رہی تھی، ان کے بہن بھائیوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی اور بابا کی آمدنی تھی کہ اپنی جگہ اٹل۔ چناں چہ امی اکثر خط میں ان لوگوں کو کفایت سے خرچ کرنے اور اپنے اخراجات کم کرنے کی تلقین کرتیں۔ اوروں کا تو اسے پتا نہیں لیکن اس کے پاس مہینوں ایک پیسا تک نہ ہوتا اگر کبھی امی بھیج دیتیں یا کوئی عید بقرعید کے موقعے پر دے دیتا تو وہ بھی باجی یا بڑے بھائی کے ہاتھ ہی خرچ ہوتا۔ اس کو کبھی پیسے کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوا، اس کو اور بھی بہت سی چیزوں کا اندازہ نہیں تھا کیوں کہ گھر میں اپنے گرد و پیش سے بے خبر وہ صحن میں پھرنے والے چکور کے جوڑے کی طرح الگ تھلگ رہتی تھی۔ کوئی آئے یا جائے، اس کی بلا سے۔ اسکول سے آتے ہی وہ اسکول کا کام شروع کر دیتی پھر لائبریری کی کتابیں پڑھتی، اس کے بعد اپنے بہن بھائیوں کی کتابیں پڑھتی جس پر اس کا خوب مذاق اڑایا جاتا کہ ہیں تو آپ تیسری کلاس میں اور

Marfat.com

کتابیں پڑھی جاتی ہیں، آٹھویں دسویں کی... وہ اب اس طنز کو بھی نظر انداز کر دیتی، اسے
تو ایک ہی دھن تھی کہ وہ کلاس میں کسی سے پیچھے نہ رہ جائے، وہ ہر ماہ کے ٹیسٹ کے ہر
مضمون میں اوّل آتی سوائے سلائی کے۔ گھر کی شفقت و محبت کی کمی کو وہ اسکول میں نمایاں
ہو کر تعریف و توصیف سے پورا کرنا چاہتی تھی۔ چناں چہ بہت جلد سارے اسکول میں اس کا
نام گونجنے لگا۔ کھیلوں کے مقابلے میں وہ ہر ریس میں اوّل آئی اور ڈھو کی ڈھو لڑکیوں کو
چھوڑ کر یہ گز بھر لانبا کپ لے کر آئی، پھر سب کے ساتھ اس کو درمیان میں کھڑا کر کے
تصویر کھینچی گئی۔ ڈراموں میں بھی وہ نمایاں حصہ لیتی اور ہر ڈرامے کے بعد بہ طورِ خاص اس
کی تعریف کی جاتی۔ اس کو ان باتوں کی اہمیت کا احساس تو ہوتا مگر کم۔ اب اس کو عادت
پڑ گئی تھی کہ ایک مقابلہ ختم ہوتا تو وہ دوسرے کے بارے میں سوچنے لگتی۔ دنیا میں ہونے
والی اہم باتوں کے متعلق اسے صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ دوسری عالم گیر جنگ جو پہلے
ہو رہی تھی، اب بھی ہو رہی ہے۔ پہلے اس کی وجہ سے بلیک آؤٹ ہوا کرتے تھے اور
ریزگاری قطعی بند ہو گئی تھی اور بڑے بھائی کی آمد غلغلہ تھا مگر اب سر پر ہاتھ رکھ کر سب ایک
ہی چیز کا رونا روتے تھے۔ ہائے مہنگائی، ہائے مہنگائی، اس کے ساتھ ہی راشن اور راشن
شاپ کے الفاظ بھی اکثر اس کو سنائی دیتے تھے مگر اس نے کبھی ان جھمیلوں میں پڑنے کی
ضرورت نہ سمجھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک قصہ جس سے اس کی دلچسپی کچھ زیادہ تھی،
پاکستان کا ذکر تھا مگر وہ ابھی ان باتوں میں دخل دینے کے لیے چھوٹی تھی اور یہ سب باتیں
بھی اسے باجی اور ان کی دوستوں کی کھسر پھسر کی طرح ناقابلِ فہم اور پراسرار نظر آتی تھیں۔

انھیں دنوں جب ایک دن وہ اسکول پہنچی تو دیکھا کہ پہلی سی تنظیم کے بجائے
عجیب ہلڑ سا ہے۔ دعا کے بعد بڑی لڑکیوں نے کلاسوں میں جانے سے انکار کر دیا اور چھوٹی
لڑکیوں کو بھیڑ کے گلوں کی طرح ہانک کر باغ کے مختلف حصوں میں بکھر گئیں۔ پھر خوب
چیخ چیخ کر "دور ہٹو اے دنیا والو! ہندوستان ہمارا ہے" اور جن، من، گن اور جانے کون کون
سے قومی نغمے پورے جوش و خروش سے گائے جانے لگے۔ جن کے درمیان "آجاؤ ہند
فوز جندہ باذ" کے بڑے جوش آفرین نعرے بلند ہوتے۔ مسلمان لڑکیاں چوٹی سے بنی ایک
طرف کھڑی یہ ماجرہ دیکھ رہی تھیں۔ اِدھر اُدھر سے معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے اور ذہن پر
زور ڈالنے کے بعد اسے پتا چلا کہ آزاد ہند فوج کے نیتاؤں کی پھانسی کی سزا کے خلاف یہ

Marfat.com

مظاہرے ہو رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے گلاب ساگر والے حصے کو چھوڑ کر تین طرف اسکول اور کالج کے لڑکوں کا ڈھیر لگ گیا جو چلا چلا کر لڑکیوں کو باہر نکلنے اور ان کے ساتھ جلوس کی شکل میں چلنے کی دعوت دے رہے تھے۔ لڑکیاں پہلے تو کسمسائیں، پھر بارش کے پہلے قطرے کی طرح میٹرک کی ایک تیز و طرار لڑکی نے قیادت سنبھال لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک مجمع اس کے پیچھے ہو گیا، ابھی یہ مشکل وہ ہیڈ مسٹریس کے گھر کے سامنے سے نکل کر اس پیپل کے درخت تک پہنچی تھیں جس نے آدھے احاطے کو گھیر رکھا تھا کہ چوکیدار بھاگا ہوا گیا۔ تقریباً پانچ سیر کا یہ بڑا مضبوط تالا اس نے بڑے دروازے میں اور دو سیر کا ایک چھوٹی کھڑکی میں ٹھونک دیا اور لڑکیوں کو بتا دیا کہ یہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ کا حکم ہے۔ یہ دیکھ کر لڑکیاں ابلتے دودھ کی طرح بے قابو ہو گئیں۔ چھت پر چڑھ کر انھوں نے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ باہر سے لڑکوں کے جوابی نعرے بلند ہوئے اور پھر انھوں نے لڑکیوں کو باہر نہ نکلتے دیکھ کر ان کی بزدلی پر شیم شیم (Shame) کے نعرے بلند کیے۔ آخر انھیں بتایا گیا کہ وہ بے چاریاں قفس میں بند پنچھی کی طرح مجبور ہیں۔ لڑکوں کے جوش و خروش کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے اسکول کی جالی لگی کھڑکیاں توڑ دیں اور لڑکیوں کو باہر نکلنے کا چیلنج دے دیا۔ اب لڑکیوں میں کھچڑی پکنے لگی۔ بارش کا پہلا قطرہ بھی جیسے ریت میں ٹپ سے گر کر جذب ہو جائے، بھیڑ میں گم ہو گیا... لڑکوں نے جب اور شور مچایا تو ہیڈ مسٹریس اپنی کشمشی رنگ کی مرہٹی انداز کی بندھی ساری سنبھالتی ایک ٹوٹی کھڑکی تک آئیں اور لڑکوں کے سامنے ایک فصیح و بلیغ تقریر جھاڑ دی... انھوں نے کہا کہ اس اسٹرائیک کی غرض و غایت سے انھیں اور ان کی لڑکیوں کو پورا اتفاق اور پوری ہم دردی ہے مگر وہ ایسی ناعاقبت اندیشی نہیں کر سکتیں کہ ان کے اسکول کے نام پر آنچ آئے اور لڑکیوں کی تعلیم کے مخالفین کو ان کے خلاف زہر اگلنے کا موقع مل جائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ چھٹ گئی اور لڑکے منھ لٹکائے واپس چلے گئے۔ لڑکیوں نے ہر طرح کوشش کی کہ اسکول کا دروازہ وقت سے پہلے کھل جائے مگر ان کی شنوائی نہ ہوئی۔ سارا دن قومی نغمے گاتے اور نعرے لگاتے ان کے گلے پڑ گئے۔ ٹھیک اسکول کا وقت ختم ہونے پر اور یہ وعدہ لینے پر کہ لڑکیاں روز کی طرح بسوں میں گھر جائیں گی، اسکول کا دروازہ کھولا گیا۔ اسکول سے کچھ دور نکل جانے پر لڑکیوں نے بس میں کھڑے ہو ہو کر نعرے لگائے۔ سڑکوں اور گلیوں میں گزرتے ہوئے لوگوں نے روز

Marfat.com

خاموشی اور پراسراریت سے نکل جانے والی بس کے اس ہلڑ کو بڑے تعجب اور شوق سے دیکھا... اس سے پہلے ہیروشیما پر ایٹم بم گرنے کی خبر سب کے ذہنوں پر بم کی طرح گر چکی تھی اور اس اس طرح بعد از خرابیِ بسیار (اس نے سنا تھا کہ) جنگِ عظیم ختم ہوگئی...

جنگ ختم ہونے کے بعد آزادی کی جدوجہد نے وہ تیزی پکڑی کہ سانس لینے کی مہلت نہ ملی۔ نعرے، تقریریں، بحثیں، فساد عام ہوگئے۔ اسکول میں مسلمان اور ہندو لڑکیوں کے درمیان تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر طرف آزادی کی امید کے ساتھ آپس میں پھیلتے ہوئے عدم اعتماد کی وجہ سے بے چینی بڑھ رہی تھی۔ ایسے میں تائی نے بہتر سمجھا کہ تعلیم کے ان جاں باز سپاہیوں کو مورچے سے واپس کر دیا جائے۔ چناں چہ وہ تینوں پھر اکٹھ باٹھ کرتے یو پی کے ایک چھوٹے سے قصبے میں جا پہنچے جہاں ان دنوں ان کے تایا کا تقرر تھا۔ اپنے گھر سے نکلے اب کئی سال گزر چکے تھے۔ وہ اب ہوشیار ہو رہی تھی مگر اب بھی بیرونی دنیا کی بہت سی باتیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔

مگر چاروں طرف کی اس آگ اور خون کی بھاگ دوڑ میں کس کو فرصت تھی کہ اس کے الجھے ذہن کو سلجھانے کی فکر کرتا۔ ہمارے ہاں ویسے بھی اس کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ دل میں پیدا ہونے والے کسی تجسس اور خدشے کے متعلق کسی سے پوچھنے تک کا حوصلہ نہیں ہوتا کیوں کہ کبھی اس سلسلے میں ہمت افزائی نہیں ہوتی۔ مائیں ککڑی کی بیل کی طرح بڑھتی لڑکی کے لیے کسی ہونہار بر کے خواب دیکھنا کافی سمجھتی ہیں یا وقت بے وقت جہیز کے لیے کوئی چیز لے کر ڈال لینا، ان کی ممتا کی معراج ہے۔ بڑی بہنیں جوں توں، اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتی جب کسی ساحل سے جا لگتی ہیں تو چپ چاپ بیٹھی چھوٹی بہنوں کا تماشا دیکھتی رہتی ہیں۔ ان دنوں اسے شاہدہ باجی یاد آتیں۔ شاہدہ باجی اس کے خام ذہن میں ایک بھرپور شخصیت تھیں جیسے کوئی دیوتا ہو، انسانی لغزشوں اور کمزوریوں سے بلند۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ زندہ ہوتیں تو ان کے طور طریقے اس کے لیے مستقل طور پر مشعلِ راہ کا کام دیتے مگر وہ مر چکی تھیں اور وہ چوطرفہ بھیانک حالات اور خیالات کی اس جنگ میں تنہا جوکھی لڑ رہی تھی۔ امی کے لیے تو اس قیامت کے وقت میں اتنے سارے بچوں کو مرغی کی طرح پروں تلے بٹھائے رکھنا ہی دوبھر ہو رہا تھا۔ بابا کو ہر وقت یہ فکر کہ اس

Marfat.com

بھرے پُرے کنبے کو لے کر کسی طرح پاکستان نکل جاؤں۔ وہ ہر وقت نقشہ لیے بیٹھے یہی سوچتے رہتے کہ کس طرح، کس راستے سے صحیح سلامت پہنچیں۔ ایک طرف پٹیالے میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا تو دوسری طرف دہلی اور بھرت پور... ہندوؤں اور سکھوں سے بھرے ہوئے مکان کو چھوڑ، آخر وہ ایک مسلمانوں کے محلے میں چلے آئے تھے۔ قلعے نما یہ حویلی ایک حد تک محفوظ تو ضرور تھی مگر ان جانے پہچانے لوگوں میں رہنا بہ ذاتِ خود سیکڑوں دشواریوں اور دقتوں کا حامل تھا۔ پھر یہاں کی فضا بھی دن بہ دن خراب ہو رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے کان پور، الٰہ آباد کے راستے بمبئی اور وہاں سے بہ ذریعۂ جہاز کراچی جانے کی سوچی۔ اس وقت تک یہی محفوظ ترین راستہ تھا لیکن ان کی قسمت سے یہ راستہ بھی...

دفعتاً صبا کی آواز رُندھ گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا...

مشرق کی طرف کا غبار آہستہ آہستہ اجل کر سورج کی آمد کا پتا دے رہا تھا۔ دریا کی سطح پر ملگجی سی روشنی پھیل چکی تھی۔ اسد نے صبا کو رنجیدہ دیکھ کر اس داستان کو ختم کر دینے ہی میں بہتری سمجھی۔ اس نے اٹھ کر اپنی پتلون جھاڑی اور لکڑی کا ایک سرا پکڑ کر اوپر چڑھ گیا، جہاں صبا بیٹھی تھی، اس کشتی میں ایک چوکور سوراخ پر دو چار لکڑیاں رکھ کر کھڑکی سی بنا دی گئی تھی۔ صبا نے اٹھ کر اس میں سے باہر جھانکا۔ اَن جانے میں یہ شعر اس کے لبوں پر تیر گیا۔

چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی

واقعی پہاڑیوں سے گھرے ہوئے دریائے کابل کے رخ پر سحر بکھر گئی تھی۔ اور چار چھوٹی کشتیوں میں بہت سے لوگ ان کی فیری کی طرف آ رہے تھے۔ فیری کو رسیوں سے باندھ کر کنارے سے کھینچا گیا اور آخرکار وہ دوسرے کنارے سے جا لگی۔ پہلے کی طرح کے تختوں سے اتر کر ان کے قدموں نے زمین کو چھوا۔ اور وہ اس چڑھائی پر چڑھنے لگی جہاں سے ایک پتلی سی سڑک ریسٹ ہاؤس تک جاتی تھی۔ سرد ہوا جسے رات کو فیری کی چھت اور دیوار نے اور دو جوان جسموں کی یک جائی نے ایک حد تک دور رکھا تھا، اس وقت ناگوار حد تک سرد اور بری معلوم ہو رہی تھی۔ لمبی لمبی گھاس سیلی ہوئی تھی اور سڑک پر پڑے ہوئے گول اور بیضوی خوب صورت پتھر ٹھنڈے یخ ہو رہے تھے۔ ان پتھروں پر صبا

Marfat.com

کے قدم یوں لڑکھڑا رہے تھے جیسے اس نے شراب پی رکھی ہو۔ کوئی ایک فرلانگ کے بعد منزل کے نشان نظر آئے۔ واقعی موتیوں سے بھرے ہوئے سبزے کے چاروں طرف سرخ سرخ گلاب کے کٹوروں میں شبنم جھلک رہی تھی اور رنگ بہ رنگ کے گلِ داؤدی صبح کی ہوا میں جھوم جھوم کر اسے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ اندر کمرے گرم تھے۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ سونے کے کمرے میں پہنچ کر وہ دلہن کی طرح سجے ہوئے، صاف بخ بستر پر یوں نڈھال ہو کر گری جیسے کوسوں پیدل چل کر آئی ہو۔

OOO

Marfat.com

۱۳

رفتہ رفتہ صبا کو یہ جگہ بہت اچھی لگنے لگی۔ خاموش اور پرسکون۔ جب بھی اسے موقع ملتا، وہ کابل اور سندھ کے سنگم کی طرف اکیلی نکل کھڑی ہوتی۔ نرم بالو پر اپنے نقشِ قدم بناتی۔ جگہ جگہ ابھری ہوئی چٹانوں کی جانوروں سے ملتی جلتی شکلوں کو دیکھتی، اس ریت پر ایک جگہ پہاڑی چٹان آ پڑی تھی اور کچھ اس زاویے سے کہ اس کے دامن میں ایک کھوہ سی بن گئی تھی۔ اکثر وہ وہاں بیٹھ کر سامنے پرشور لہروں کا تماشا دیکھتی یا آسمان پر آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے بادلوں سے محظوظ ہوتی۔ دریائے سندھ کے شفاف پانی میں برف ایسی قازیں، چٹانوں کے قدرتی بنے ہوئے پیالوں میں بھرا ہوا صاف پانی اور گھسے ہوئے پتھروں میں کہیں کہیں بالکل انسانوں کے سے نقشِ قدم۔ ان سب کے متعلق سوچنے اور خوش ہونے کو بہت کچھ تھا۔ یہاں اس کو اپنا دل کسی قاز کے پر کی طرح شفاف اور ہلکا نظر آتا۔

یوں اس نے بارہا سورج نکلتے اور ڈوبتے دیکھا تھا مگر یہ اس سورج اس قدر خوب صورتی سے ابھرتا اور ڈوبتا تھا کہ گھنٹوں دیکھتے رہو اور دل نہ بھرے۔ وہ افق کے پار گم ہونے سے پہلے سورج کا سوسو رنگ بدلنا، لحہ بہ لحہ نیچے جانا اور بادلوں میں آگ سی لگا کر اپنے پیچھے آتشی اور سرمئی بادلوں کا غبار چھوڑ کر خود پہاڑ کے پیچھے یوں ڈوبنا جیسے کوئی بچہ شرارت سے چھپنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چاند کا طلوع ہونا، سورج کے نکلنے اور ڈوبنے دونوں کو مات کرتا۔ دریا کے عین اوپر افق پر پہلے سرمئی اور سفید بادلوں میں آگ سی لگتی پھر یہ بڑا طباق سا چاند جھانکتا اور دریا کی لہروں پر ڈولتا ہوا یہ سارا منظر دگنا دل کش ہو جاتا۔

نرم گیلی ریت پر اپنے پاؤں کے صاف واضح نقوش چھوڑتی ہوئی جب وہ تھک

Marfat.com

کر کہیں بیٹھ جاتی تو سوچتی۔ کیا ہماری دنیا کی تہذیب کا حال ان قدموں کے نشان کا سا نہیں ہے۔ انسان دھیرے دھیرے جہالت کے صحرا میں اپنے نقشِ قدم چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ بہت کچھ فتح کر لیتا ہے پھر وقت کی تیز آندھی ان نشانوں کو دھندلا کر فنا کر دیتی ہے اور بعد میں آنے والے جب ترقی کا علم لے کر اس صحرا پر چلتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے پہلے کبھی کوئی اس راہ سے گزرا ہی نہیں، صاف شفاف پتھروں پر پانی سے گھس کر بن جانے والے نقشِ قدم دیکھ کر وہ سوچتی کیا اس قسم کے پاؤں جگہ جگہ نہیں ملتے جنھیں لوگ پائے مبارک کہہ کر عطر و عنبر سے دھوتے اور آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ لوگوں کی مذہبی حس سے فائدہ اٹھانے کے لیے جمعرات کی جمعرات اس کی زیارت کروا کر سات تالوں میں بند کر دیتے ہیں، یہیں پر وہ زندگی کے اور بہت سے مسائل سوچتی جن کا بہ ظاہر کوئی حل اسے نظر نہیں آتا جنھیں وہ کسی کے سامنے زیرِ بحث نہیں لا سکتی تھی۔ اسد کے سامنے کبھی کوئی ایسی بات نکالتی تو وہ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اس کا منھ بند کر دیتا، پھر ریڈیو یا ریکارڈ چینجر کی طرف متوجہ ہوتا اور چا چا چا کی میوزک بابو لیرے قسم کے اٹالین گانوں کی دھنوں پر اس کے پاؤں رقص کرتے۔ وہ صبا کو اپنی بانہوں میں لے کر رقص کرنا چاہتا تھا، اس نے کئی دفعہ کہا تھا کہ سامنے کھلے سبز لان میں جب دونوں تتلیوں کی طرح رقص کریں گے تو کتنا مزہ آئے گا۔ لیکن صبا کو رقص سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ یہاں سیکھے ہوئے رقص کا انجام کسی بال روم کی تیز چندھیاتی روشنی اور چیختی چنگھاڑتی موسیقی میں ہوگا جن کو کئی سال سے متواتر دیکھتے دیکھتے وہ پریشان ہو اٹھی تھی۔

اب بھی جب موقع ملتا، اسد اسے اس خوب صورت اور سکون پرور ماحول سے نکال کر نوشہرہ یا پشاور کلب لے جاتا تا کہ یہاں کی اکتائی ہوئی فضا سے چھٹکارا ملے اور چند گھنٹوں کے لیے دل بہل جائے۔ ان چند گھنٹوں میں جب کہ اسد خود کو زیادہ مسرور، تازہ دم اور مہذب محسوس کرتا، صبا کو کوئی خاص خوشی نہ ہوتی۔ وہ ان جگہوں پر صرف اسد کا دل رکھنے کے لیے جاتی۔

ایک ہفتے اس پرسکون جگہ رہ کر وہ ایبٹ آباد کی بلندیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اپنی چھوٹی سی کار میں تنہا وہ یوں محسوس کرتے تھے جیسے دو آزاد پرندے ہیں جو فضا میں اڑتے پھرتے ہیں اور ہر خوب صورت نظارے سے لطف اندوز ہونے کے لیے کسی ڈال یا

Marfat.com

پات پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایبٹ آباد کے راستے میں چھوٹی بڑی پہاڑیوں پر تازہ گھاس ہلکی مخملیں چادر کی طرح پھیلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بائیں طرف کے پہاڑوں پر جگہ جگہ سرمئی دھواں منجمد ہوگیا تھا جو ان بلندیوں پر جگہ جگہ بنے ہوئے مکانوں کی نشان دہی کر رہا تھا۔ کہیں کہیں تندور کے شعلے بھی بلند ہو رہے تھے۔ آسمان پر چھائی گھٹائیں، بڑھتی شام کی سرماہٹ، ہوا کی نرماہٹ اور خنکی دونوں کے دل و روح میں مسرت کی عجیب سی لہر دوڑا رہی تھی۔ سبز اور سرمئی رنگ ایک دوسرے میں کھپے جا رہے تھے۔ سڑک کے بائیں طرف دریا بہ رہا تھا۔ اکثر جگہ پل درست ہو رہے تھے، اس لیے دریا کی خشک زمین اور پانی کو پار کر کے دوسری طرف جانا پڑتا تھا۔ دور سے ایبٹ آباد کی بتیاں یوں نظر آ رہی تھیں جیسے سبزے میں جگنو جگمگا رہے ہوں۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ان روشنیوں میں ہزاروں قمقمے ایک ساتھ جل اٹھے۔ شاید سڑک کے کنارے لگی بتیاں ایک دم جلی تھیں۔ یہ منظر اب پہلے سے بھی خوب صورت لگ رہا تھا۔ دور افق پر پہاڑ تھا جس پر چیل کے درخت برابر برابر یوں کھڑے تھے جیسے کسی بچے نے جھوٹ موٹ کا جنگل بنانے کی کوشش کی ہو۔ اس کے سائے میں یہ روشنیاں یوں معلوم ہو رہی تھیں جیسے کسی نے گڑیا کے چھوٹے چھوٹے گھروندے بنا کر ان میں ننھے منے بلب لٹکا کر جلا دیے ہوں۔

آخر گھوم پھر کر چڑھائیاں چڑھ کر ایبٹ آباد آ ہی گیا۔ پیلس ہوٹل پہنچے مگر وہاں جگہ نہیں تھی۔ منیجر نے بتایا کہ کل شام ایک صاحب جا رہے ہیں۔ اس وقت وہ کمرہ انھیں دے سکتا ہے۔ اسد نے دوسرے دن سے کمرہ ریزرو کرالیا اور کسی دوسرے ہوٹل کی تلاش میں روانہ ہوگئے۔

کسی معقول ہوٹل کا پتا پوچھ کر 'اسپرنگ ویو' پہنچے۔ سامنے سبزے پر کرسیاں پڑی تھیں، جہاں لوگ براجمان تھے۔ سرو، چیڑ اور شاہ بلوط کے درختوں میں قمقمے لٹک رہے تھے۔ باہر سے ہوٹل خاصا قابلِ قبول تھا مگر کمرے دیکھ کر انھیں بڑی الجھن ہوئی غلیظ دری، اس پر غلیظ تر قالین اور میزوں پر غلیظ ترین میز پوش پڑے تھے۔ باہر کی ساری رنگینی اندر آ کر یک لخت ختم ہوجاتی تھی جیسے کسی رومان پرست لڑکی کے خواب یکایک چکنا چور ہوجائیں۔ دیواریں میلی اور چونا جھڑی، فرنیچر پرانا اور وارنش سے بے نیاز تھا۔ غسل خانہ بدبودار اور ناقابلِ استعمال۔ وہ پیلس ہوٹل کے بعد ایبٹ آباد کا سب سے اچھا ہوٹل کہا جاتا

Marfat.com

تھا مگر نہ وہاں اسپرنگ تھا، نہ ویو تھا، نہ کچھ اور کمروں میں آ کر یوں لگتا تھا جیسے قید خانے میں آ گئے ہیں۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ رات زیادہ جا رہی تھی اور آنتیں الگ قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ کھانے کو پوچھا تو بجائے مرغ و ماہی، قورمہ اور کباب کے دو چیزیں کانوں میں پڑیں۔ آلو گوشت، چاول اور چپاتیاں منگائیں کھانا بے حد خراب تھا۔ آلو گوشت کے چند ٹکڑے پتلے سے شوربے میں غوطہ لگا رہے تھے۔ چاول موٹے اور بدبو دار تھے اور ''چپاتیاں'' تندور کے بے اندازہ بڑے نان تھے۔ بھوکے رہے تو اسپیشل چائے کی فرمائش کی اور اپنے ساتھ لائی ہوئی چیزوں پر ہاتھ صاف کیا۔

ہوٹل کے غلیظ بستر کرسیوں پر ڈالے اور اپنے بستر پلنگوں پر بچھوائے جب تک اسد سو نہیں گیا، وہ اسی ہوٹل کی ایک ایک چیز دیکھ کر جلتا اور الجھتا رہا مگر صبا اسے سفر کا ایک ضروری جزو سمجھ کر خاموش ہو رہی۔

صبح اسد بغیر ناشتہ کیے اپنے ایک دوست کے پاس کاکول جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ اس غلیظ ہوٹل میں ایک لمحہ ٹھہرنے کو تیار نہیں تھا۔ اسد کا دوست میجر تھا اور پی ایم اے میں انسٹرکٹر تھا جس وقت وہ ہوٹل سے نکلے، دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ بارش اتنی تیز تھی کہ چند قدم آگے تک کچھ نظر نہ آتا تھا مگر اس وقت سڑک قریب قریب خالی تھی کوئی اِکا دُکا راہ گیر برساتی پہنے یا چھتری لیے سڑک کے کنارے چلتا دکھائی دے جاتا تھا۔ ناک کی سیدھ میں تین میل چل کر وہ کاکول پہنچے۔ یہاں اس قدر سبزہ تھا کہ خدا کی پناہ۔

''معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سبز رنگ میرے بدن سے چمٹا جا رہا ہے اور یہ گھاس میرے دماغ میں بھی اگتی جا رہی ہے۔'' صبا نے ہنس کر کہا۔

سڑک کے دونوں طرف گھاس کے تختے چلے گئے تھے جن میں سے لکڑی کی سیاہ بیرکیں ابھر رہی تھیں۔ سڑک کی چڑھائی کے ساتھ ساتھ گھاس کے یہ تختے سیڑھیوں کی طرح بلند ہوتے جا رہے تھے مگر صبا کو کاکول دن سے زیادہ رات کو حسین لگا۔ وہ رات کو پیدل سیر کرنے کے لیے نکلے۔ سڑک پر گرے، سفید قمیص، یکساں ٹائی میں چھوٹے چھوٹے بالوں والے کیڈٹ گزر رہے تھے۔ ذرا آگے آ کے اسد اور صبا ایک جگہ کھڑے ہو گئے۔ یہاں سفیدے کے چند نوزائیدہ درخت ہوا سے لہرا رہے تھے اور اس جگہ سے ایبٹ آباد کی روشنیاں اتنی صاف نظر آ رہی تھیں جیسے چند گز کے فاصلے پر ہوں۔ پہاڑوں کے سائے میں

اونچی نیچی یہ روشنیاں دلوں میں جانے کیا جوت جگا رہی تھیں کہ اسد اور صبا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کتنی ہی دیر وہاں کھڑے رہے۔ صبا سوچ رہی تھی، اسی طرح یہ نوجوان کیڈٹ بھی یہاں سے ان روشنیوں کو دیکھتے ہوں گے۔ یہ روشنیاں ان کے دل میں محبت اور بلند حوصلگی کی شمعیں جلاتی ہوں گی۔ یہاں کھڑے کھڑے انھیں نہ جانے کتنی پیاری پیاری صورتیں یاد آتی ہوں گی جو ان روشنیوں میں کہیں یا ان پہاڑوں کے پرے ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی ہوں گی مگر جو ان کے دلوں میں اب بھی اسی طرح صاف ہوں گی جیسے ان کے اپنے نام اور نمبر... بلند حوصلہ یکساں نظر آنے والے نوجوان انھیں دیکھ کر بھی تو دل میں یوں ہی جوت سی پیدا ہوجاتی ہے۔ جیسے بہت سی روشنیوں کو دیکھ کر۔ یہ بھی اپنے ملک کے روشن تارے ہیں جو اپنی ہستی کو میٹ کر ملک کا مان رکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اس کا دل چاہا یہ سب باتیں اسد سے کہے مگر وہ ڈری کہ کہیں وہ اس کے جذباتی پن کا مذاق نہ اڑائے، اس لیے خاموش ہی رہی۔

رات ٹھنڈی ہوتی جارہی تھی۔ ان کے اور ایبٹ آباد کی روشنی کے درمیان سیاہی اور سناٹا بڑھتا چلا جا رہا تھا، اس لیے وہ واپس لوٹ آئے۔

دوسرے دن شام کو وہ دوست کے ہاں سے پیلس ہوٹل اپنے کمرے میں آبراجے۔ اب روز ناشتے کے بعد دوپہر کے لیے ہوٹل سے کھانا لے کر وہ سیر کے لیے نکل جاتے اور شام کو لوٹتے۔ ایک دن جب کہ وہ پائن ہل کی بلندیوں پر چل کے درختوں میں گھرے بیٹھے تھے، اسد نے پوچھا۔

''جگہ پسند آئی؟''

''ہاں بہت اچھی ہے۔'' صبا نے کہا۔

''بوبی ہوتا تو بہت خوش ہوتا۔'' وہ بولا۔

''ہاں... اس کو لے آتے تو اچھا ہوتا۔'' صبا نے کہا۔

''نہیں، وہ یہاں بہت شرارت کرتا پھر پورے وقت تمھاری توجہ اپنی طرف کیے رکھتا اور تم ہم سے بات بھی نہیں کرتیں۔''

''ابھی سے جلنا شروع کردیا بوبی سے۔'' صبا ہنس کر بولی۔

''بالکل...'' اسد نے کہا۔ مگر جیسے آج اسے بوبی بہت یاد آرہا تھا۔ وہ بار بار اس

کا ذکر کرتا رہا۔

''اسد... بوبی کا مذہب کیا ہوگا؟'' دفعتاً صبا سنجیدگی سے بولی۔

اسد نے حیران ہوکر اسے دیکھا اور بولا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وہ عیسائی ماں باپ کا بیٹا ہے۔ بڑا ہوکر عیسائی بنے گا یا مسلمان؟'' یہ ایسا سوال تھا جو اتنے عرصے میں ایک لمحے کے لیے بھی اسد کے ذہن میں نہ آیا تھا۔

''وہ ہمارے پاس پرورش پائے گا تو یقیناً ہمارا ہم مذہب ہوگا۔'' اسد نے کہا۔

''لیکن بڑا ہوکر وہ یہ ضرور سوچے گا کہ مجھے صرف اس وجہ سے مسلمان بنایا گیا کہ میں نے مسلمان گھرانے میں پرورش پائی۔''

نہ جانے کیوں اسد کو یہ سوال نہایت ہی احمقانہ سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے خاصی رکھائی سے کہا۔ ''اگر ایک بچہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوکر مسلمان ہوسکتا ہے تو مسلمان گھرانے میں پرورش پاکر مسلمان کیوں نہیں ہوسکتا۔''

''اس لیے کہ کسی گھر میں پیدا ہوکر ماں باپ کے مذہب کو ماننا فطری ہے اس کو کوئی بچہ اپنی حق تلفی نہ سمجھے گا مگر ایک بچہ جسے معلوم ہو کہ وہ کسی اور مذہب میں پیدا ہوا تھا، بڑے ہوکر خود کو دوسرے مذہب میں پائے تو اسے ضرور الجھن ہوگی۔''

اسد مارے جھنجھلاہٹ، غصے اور ایک عجیب وغریب کش مکش کے لمحے بھر خاموش رہا پھر الجھ کر بولا، ''تم بھول رہی ہو صبی کہ ہم نے اسے گود لے لیا ہے اور اب وہ ہمارا لڑکا ہے۔''

''تم نے ٹیگور کا ناول 'گورا' پڑھا ہے؟'' صبا بھول پن سے بولی۔

''نہیں...''

اس میں ایک بچہ برہمن گھرانے میں پلتا ہے۔ خود کو برہمن سمجھ کر زبردست چھوت چھات کا قائل ہے۔ وہ برہمو سماجی لڑکی سے شادی کر کے سخت پریشانی میں مبتلا ہے اور آخر میں یہ راز کھلتا ہے کہ وہ انگریز ہے جس کو وہ اپنی سگی ماں سمجھتا تھا وہ اسے اچھوت جان کر زندگی بھر اس سے پرہیز کرتی رہی ہے۔ اب بتاؤ اس وقت ایسے آدمی کی کیا حالت ہوگی، ایک شخص نے جن نظریات پر سختی سے ایمان رکھا، وہ پل بھر میں مٹ گئے، اس لیے

Marfat.com

کہ وہ ان نظریات پر ایمان رکھنے کا حق ہی نہیں رکھتا تھا، وہ صرف دوسری ذات کا ہی نہیں دوسرے مذہب کا تھا۔ جو خود اچھوت ہو وہ دوسرے سے کیا چھوت چھات رکھ سکتا ہے۔ اس وقت اس کی ساری شخصیت ایک دم سے مٹی کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہوگی یا نہیں...''

''مگر یہاں یہ مثال غلط ہے۔'' اسد نے کہا، ''ہندوؤں میں ایک شخص برہمن ہو ہی نہیں ہوسکتا جب تک وہ برہمنوں میں پیدا نہ ہوا ہو۔ اس شخص کی ٹریجڈی یہ تھی۔ اسلام اور عیسائیت دونوں میں یہ چیز نہیں ہے۔''

پھر بھی عقائد کا فرق تو ہے۔ تاریخی حقیقتوں کو بھی دونوں ایک نظر سے نہیں دیکھتے۔ جنگ صلیب کے متعلق ہمارے جو نظریے اور عقیدے ہیں، عیسائیوں کے نہیں ہیں۔ پھر ایک شخص جو عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا اور اسلامی عقیدہ رکھتا ہو، تین سال کی عمر میں جب مڑ کر ان چیزوں پر نظر رکھے گا تو اس کے خیالات کیا ہوں گے۔''

''وہ ان دنوں سے سمجھ دار ہوگا اور اس دوراہے پر سے جدھر چاہے گا، مڑ جائے گا۔'' اسد نے کہا۔

''تمھارا خیال ہے، اتنے سال کے عقیدوں کو وہ یوں آسانی سے پھلانگ جائے گا؟'' صبا نے کہا۔

''اگر نہیں پھاند سکے گا تو اپنی ڈگر چلتا رہے گا۔''

''کہیں اس کی شخصیت مختلف خیالات اور عقیدوں کے درمیان پس تو نہیں جائے گی۔''

''اُفوہ...تم کس قدر جھکی ہو صبی۔'' اسد عاجز آ کر چلایا۔

''تم صرف بوبی کے کھانے اور لباس کا خیال رکھنا اور یہ دیکھتی رہنا کہ وہ کہیں سے گر کر اپنی ٹانگ تو نہیں توڑ بیٹھے گا۔ یہی کافی ہے، اس کی ذہنی پرورش کے خیال سے خود کو مت گھلاؤ۔''

اسد کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ بات صبا کو اس حد تک بری لگے گی، اس کا چہرہ یکایک سفید پڑ گیا، ہونٹ کپکپائے اور وہ دھیرے سے بولی۔

''میں تو خود کو بوبی کی ماں سمجھ رہی تھی، مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں صرف اس کی آیا ہوں۔''

Marfat.com

تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد دونوں اٹھ کھڑے ہوئے، ماحول وہی تھا مگر فضا یکایک بوجھل ہوگئی تھی۔ ایبٹ آباد کے خوب صورت ماحول میں یہ پہلی رنجش تھی جو ان کے درمیان پیدا ہوئی۔ نئی چکنی سطح پر پڑنے والی پہلی لکیر کی طرح وہ زیادہ صاف، واضح اور ان مٹ نظر آ رہی تھی۔

ایبٹ آباد سے پروگرام کے مطابق وہ سوات روانہ ہوگئے۔ مردان کی چھوٹی اور گنجان بستی سے گزر کر وہ مالا کنڈ کے پہاڑوں کی بل کھاتی ہوئی سڑک پر چڑھتے رہے۔ یہ بے برگ و گیاہ پہاڑ صدیوں کی داستانیں سینے میں چھپائے اب بھی خاموش کھڑے تھے۔ مالا کنڈ ایجنسی سے گزر کر جوں ہی ریاست سوات میں داخل ہوئے سب سے واضح فرق سڑک میں محسوس ہوا۔ اب تک سڑک جہاں سیدھی تھی وہاں بھی کار کو جھٹکے محسوس ہوتے تھے مگر اب سیدھی، سپاٹ چکنی سڑک تھی، دو رویہ درخت تھے اور دونوں طرف دور دور تک چاول کے کھیت تھے جن کی زردی میں ڈوبی ہوئی بے انتہا طراوت انگیز سبزی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی اور ان میں سے پھوٹتی ہوئی خوش بو یوں معلوم ہو رہی تھی جیسے ابھی ابھی خشکہ دم پر لگایا گیا ہو۔ جگہ جگہ کچے مکانات کے گاؤں تھے جہاں مرغیوں اور ان کے بچوں کے جھرمٹ میں سواتی بچے کھیلتے نظر آ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں سڑک کے دونوں طرف دکانیں تھیں جہاں سستی قسم کا ہر وہ مال رکھا نظر آتا تھا جو بڑے شہروں میں دکھائی دیتا ہے۔ معمولی کپڑوں، پرچون اور درزی کی دکانوں سے لے کر بجلی کے سامان اور کتابوں اور اخباروں تک کی دکانیں۔ پیلے ستونوں پر سرخ کپڑے چڑھے ہوئے اور یہاں سے وہاں تک برآمدے میں مونجھ کی چارپائیوں سے سجے ہوئے ہوٹل بھی تھے۔

سڑک کبھی دریا کے ساتھ ہو جاتی تھی اور کبھی دور نکل جاتی تھی۔ صبا اب تمام نظارے کو بڑے شوق اور حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ سوات میں داخل ہوتے ہی اس نے مشہورِ زمانہ سواتی حسن کی تلاش شروع کر دی تھی۔ ہر راہ گیر کو وہ بڑے غور سے دیکھتی مگر سواتی حسن کا کوئی نادر نمونہ اس کی نظر سے نہ گزرا صرف کہیں کہیں کسی بچے میں کوئی اچھی جھلک دکھائی دے جاتی تھی۔ وہ کسی جوان عورت کو دیکھنا چاہتی تھی مگر اتفاق سے سر پر گھاس کے گٹھے رکھے گزرنے والی تمام عورتیں بڑھیاں تھیں یا بچیاں۔ اسد کار چلاتے ہوئے یہاں کے لوگوں کی غربت، رسم و رواج اور رہن سہن کے متعلق بتا رہا تھا۔ صبا کا دل

چاہتا تھا کہ وہ چند دن ان میں جا کر رہے تا کہ نزدیک سے ان کو دیکھ سکے۔ ''بھئی یہاں کے جانوروں میں تو ذرا روڈ سینس نہیں ہے۔'' اسد نے ایک مرتبہ جھلا کر کہا۔ واقعی یہاں کے جانور مشینی ٹریفک سے زیادہ پریشان نظر آتے تھے۔ ان کی بھیڑیں اور بکریاں سڑک کے کنارے چلتی چلتی کار دیکھ کر ایک دم سڑک پر آ پہنچتیں۔ گائے اور بچھڑے گھبرا کر، دم اٹھا اور نتھنے پھلا کر کار کے سامنے سے نکلے چلے جاتے۔ صبا کو یہ سب کچھ بہت دلچسپ اور بہت اچھا لگا۔ آخر یہ وہی سوات کی وادی تھی جس کے متعلق اس نے اتنا پڑھ اور سن رکھا تھا اور کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اس کے قدم اس سرزمین کو چھوئیں گے جہاں سے سکندرِ اعظم ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ وہ اس وقت ماضی کے خیالات میں یوں گم تھی کہ پہاڑ کی عین چوٹی پر برابر برابر لگے ہوئے درخت بھی یوں معلوم ہو رہے تھے گویا کوئی لمبی فوج ہے جو پہاڑ کا سلسلہ ایک قطار میں طے کر رہی ہے۔

شام کو وہ سیدو شریف پہنچے اور وہاں سے دو میل دور چناروں کے سائے میں اور دریا کے کنارے بنے ہوئے مینگورہ ریسٹ ہاؤس میں اپنا سامان ڈال کر اور چائے پی کر مرغ زار دیکھنے گئے جو سیدو شریف سے دس میل دور ہے۔ لمبے .لمبے گھاس کے قطعوں، کائی لگی پہاڑیوں، چنار کے چھتنار درختوں سے گھرا ہوا سفید محل بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ وہ بائیں طرف پڑی ہوئی سنگِ مرمر کی بنچوں پر بیٹھ گئے اوپر پہاڑیوں سے بہتا ہوا پانی نشیب میں آ رہا تھا۔ بیچ میں اُگے ہوئے درختوں کے چاروں طرف چکر کاٹتا، بڑے پتھروں سے بچتا، چھوٹے پتھروں کو پھلانگتا وہ نیچے ہی نیچے چلا جا رہا تھا۔ اسد دائیں طرف کی عمودی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا اور صبا وہیں بیٹھی سوچتی رہی کہ انسان کو اپنی فطرت پانی کی فطرت پر ڈھالنی چاہیے جو چھوٹی جگہ میں سکڑ جاتا ہے، بڑی جگہ میں پھیل جاتا ہے مگر ہر جگہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ اس کی روانی، اس کی جدوجہد اور منزل کی طرف مسلسل تگ و دو میں فرق نہیں آتا۔ وہ کبھی کسی حالت میں بھی نا امید ہو کر نہیں بیٹھتا، خاموشی سے بہے جاتا ہے اور ہر چیز کے درمیان سے راستہ بنا لیتا ہے یہاں تک کہ اس کی راہ میں سنگلاخ چٹانیں، خربوزے اور سیب جتنے گول اور بیضوی پتھروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور یہ پتھر بھی آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو کر بالو بن جاتے ہیں۔

چند روز سیدو شریف اور مینگورہ کی خوب سیر کرنے کے بعد وہ اور بلندی پر

Marfat.com

چڑھنے لگے۔ سڑک اب بھی صاف اور چکنی تھی مگر اب موڑ شروع ہو گئے تھے۔ بتیس میل کے بعد مدین اور چھ میل آگے بحرین پہنچے۔ بحرین میں انھیں کچھ دیر رکنا پڑا کیوں کہ آگے یک طرفہ راستہ تھا اور ابھی اس طرف سے اُدھر جانے کا راستہ بند تھا۔ وہ لکڑی کا ایک بے شمار سیڑھیوں والا زینہ چڑھ کر اوپر گیسٹ ہاؤس میں پہنچے۔ یہاں سے نیچے سڑک اس کے بعد دریا اور پھر دور آسمان تک چلے گئے پہاڑ خوب نظر آتے تھے۔ باہر کرسیاں ڈلوا کر وہ دونوں بیٹھ گئے۔ بائیں طرف سر پر ایک پہاڑ کھڑا تھا اور اس کے سائے میں پتھروں کے بنے ہوئے چند مکان تھے۔ انگور کی بیلیں تھیں اور مرغیاں مع بچوں کے چگتی پھر رہی تھیں۔ دور کے آسمان سے چھوٹے ہوتے پہاڑوں کے بیچوں بیچ پگڈنڈی پر ایک مرد کا سایہ بڑی بردباری سے چلا جارہا تھا۔ آس پاس نہ کوئی مکان تھا نہ کھیت۔ ان لق و دق پہاڑوں پر رینگتے ہوئے کیڑوں کی طرح آدمی میلوں تک کہاں اور کیوں پھرتے رہتے ہیں، صبا حیران تھی۔

چوکی دار نے چائے بنا کر میز پر رکھی، ابھی بہ مشکل چائے ختم ہوئی تھی کہ ایک آدمی نے آ کر خبر دی کہ کالام کا راستہ کھلنے والا ہے۔ صبا نے اپنا پرس اور اسد نے اپنا کیمرہ سنبھالا اور لکڑی کا زینہ اتر کر پھر کار تک پہنچے جہاں اس کے گرد سواتی بچوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ ایک نہایت تیز قسم کی ڈھلان کے بعد پل آیا جس کے نیچے تیز رو پانی پتھروں سے سر پٹکتا بہ رہا تھا۔ اس کے دریا کے پانی کا رنگ ایسا تھا کہ صبا اور اسد نے ایسا پانی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سفید براق جھاگوں میں نہایت ہلکے فیروزی رنگ کی آمیزش، آئینے کی طرح شفاف اور برف کی طرح ٹھنڈا... لکڑی کے بیریئر کے پاس اسد نے کار کھڑی کر لی۔ بائیں طرف ایک پتلی سی گلی اونچی ہوتی چلی گئی تھی جس کے دونوں طرف چند دکانیں تھیں، ایک آدمی کندھے پر بھاری بوجھ لادے سج سج اوپر کی طرف چڑھ رہا تھا۔ اس نے دونوں پیروں میں جوتے کی جگہ ٹاٹ باندھ کر اوپر سفید دھجیاں لپیٹ رکھی تھیں۔

"یہ جوتوں کا نعم البدل تم نے دیکھا؟" اسد نے صبا کو اس کی طرف متوجہ کیا،

"بے چارے۔" صبا صرف ترس کھا کر رہ گئی۔

یہاں کے لوگوں کو بے حد فراغت معلوم ہوتی تھی، چند ایک چار پائیوں پر دراز تھے۔ کچھ ایک طرف کھیل رہے تھے۔ ایک خوش شکل چھوٹی سی بچی ہلکی سی چھابڑی میں

Marfat.com

تیل میں تلی ہوئی روٹی بیچ رہی تھی۔ صبا نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ جھجکی اور نزدیک کھڑے ہوئے ایک مرد کی طرف دیکھنے لگی، مرد نے آگے بڑھ کر مستعدی سے کہا، ''یہ آپ کے کام کا روٹی نہیں ہے، تیل کا ہے۔''

''اس لڑکی کو میرے پاس بھیج دو۔'' صبا نے اس آدمی سے کہا۔

آدمی نے اس لڑکی سے اپنی زبان میں کچھ کہا اور وہ جھجکتی ہوئی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ بالوں کی مینڈھیاں گندھی ہوئی تھیں، گندی سی سرخ رنگ کی شلوار اور مٹیالے رنگ کی قمیص پہنے تھی جس کا گریبان کھلا ہوا تھا۔ مگر اس کا رنگ سیب کی طرح سرخ اور سفید اور تازہ تھا۔ آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک اور ہونٹوں میں گلاب کی کلیوں ایسی تازگی اور رنگ تھا۔ وہ واقعی سواتی حسن کا بہترین نمونہ تھی۔

''یہ لڑکی بڑی ہو کر جانے کیا قیامت ڈھائے گی۔'' صبا نے اسد سے کہا۔ اسد نے مسکرا کر لڑکی کو دیکھا اور خاموش ہو رہا۔ صبا نے پیچھے رکھی ہوئی ٹوکری میں سے کچھ پھل اسے دیے۔ اس نے اپنی قمیص کی جھولی میں ڈال لیے اور اپنی چمکتی آنکھوں سے مسکرائی، پھر اپنی چھابڑی کے پاس جا کر کھڑی ہوئی اور بچے کبھی رشک سے اس لڑکی کو اور کبھی کار کو تکنے لگے۔ چند ایک چھکڑے لکڑیوں سے بھرے ہوئے اور کچھ کاریں کالام سے آ رہی تھیں۔ جب وہ بیریئر سے گزر گئے تو سپاہی نے اس طرف کی ٹریفک کو اشارہ کیا۔ چند ایک ٹرک جو آگے کھڑے تھے، پہلے روانہ ہو گئے۔ اور اسد ان کے پیچھے چل دیا۔ آہستہ آہستہ سڑک پتلی ہوتی جا رہی تھی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے، دریا کی روانی میں تیزی و تندی آتی جا رہی تھی، چڑھائیاں، عمودی چڑھائیاں دیکھ کر ہی صبا کا دل ہولنے لگتا۔ لکڑی کے پتلے سے ایک جھولتے پل پر جہاں سے لوگ دریا پار کر رہے تھے، صبا کو کھڑا کر کے اسد نے تصویر لی اور وہ آگے بڑھ گئے۔

کچھ دیر بعد دریا دور ہونے لگا۔ اب راستہ اور بھی خطرناک ہو گیا تھا۔ موڑ اور خطرناک قسم کی چڑھائی ایک ساتھ آتی اور چڑھائی چڑھ کر ابھی اوسان درست بھی نہ ہوتے کہ ایک دم بالکل سیدھی ڈھلان آ جاتی۔ کہیں کہیں پہاڑ سے پتھر لڑھک کر سڑک پر آن پڑے تھے۔ مزدور لوگ انھیں اٹھانے میں مصروف تھے اور جگہ اتنی کم تھی کہ وہاں سے

Marfat.com

گزرتے ہوئے دل دہل کر رہ جاتا تھا۔ صبا کو پہلی مرتبہ ایسے خطرناک راستے سے واسطہ پڑا تھا اور وہ دم سادھے بیٹھی تھی۔ جب راستہ غنیمت ہوتا تو وہ منظر سے لطف اندوز ہوتی مگر جیسے ہی سیدھی چڑھائی سر پر آن کھڑی ہوتی تو منظروں کو اپنے حال پر چھوڑ کر سامنے دیکھنے لگتی تاوقتے کہ وہ چڑھائی سر ہو جاتی۔

بارہ میل پر پہلا پڑاؤ آیا۔ یہاں بھی ایک بیریئر لگا ہوا تھا اور اتنی جگہ تھی کہ بسیں اور کاریں ایک طرف کھڑی ہوسکیں۔ اب دریا پھر سڑک کے ساتھ آ ملا تھا۔ اس جگہ کا نام ''کولا لائے'' تھا۔ سڑک کے نیچے اور دریا سے بلندی پر ایک خوب صورت گیسٹ ہاؤس بنا ہوا تھا۔ چند منٹ ستا کر وہ پھر کالام کے لیے روانہ ہوگئے۔ کالام ریاستِ سوات کا آخری پڑاؤ تھا۔ یوں سڑک آگے ''اوشو'' تک جاتی تھی۔ چند دن وہ کالام میں ٹھہرے۔ یہاں کی چودہ ہزار فٹ بلند پہاڑی چوٹی 'فلک سیر' پر بارہ مہینوں برف پڑی نظر آتی ہے۔ اسد نے صبا کو بتایا کہ اس جگہ کے سروے کے لیے وہ پہلے بھی یہاں آیا تھا۔ اس نے وہ پہاڑی دکھائی جس پر وہ تھیوڈولائٹ، چین اور دیگر آلات لے کر اپنی پارٹی کے ساتھ جا کر صبح سات بجے سے شام کے پانچ بجے تک آس پاس کے علاقے کا سروے کیا کرتا تھا اور شام کو بھوک اور تھکن سے نڈھال تنہا گیسٹ ہاؤس میں جا کر پڑ جاتا تھا۔ اسد نے اپنی تنہائی اور محنت کا ذکر جن الفاظ میں کیا تھا، اس سے صبا کا دل درد سے بھر گیا۔

اب وہ دن کے کئی گھنٹے وہاں کی بھیڑ بکریوں کی طرح پہاڑی پہاڑی گھوم کر گزارتے۔ بھوک لگتی تو کھانا کھا لیتے اور جب دل چاہتا، سو جاتے۔ زندگی کتنی پیاری اور کتنی سلجھی ہوئی چیز ہے۔ صبا سوچتی۔ ان پہاڑوں پر آ کر اس نے زندگی کا سارا فلسفہ اور سارا دکھ پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اس کا دل اتنا ہلکا تھا جیسے سینول کی روئی کا وہ ننھا سا گالا جو ہلکی سی ہوا کے ساتھ میلوں اڑتا پھرتا ہے۔ اسے زندگی اس قوسِ قزح کی طرح حسین نظر آتی جو اس نے ایک شام کالام کے آسمان پر دیکھی تھی۔ قوسِ قزح کا ایک سرا آسمان سے شروع ہو کر ایک پہاڑ پر کمان بناتا ہوا دوسری طرف آسمان میں ڈوب گیا تھا اور پہاڑ کی زمین پر بھی قوسِ قزح کے رنگ اتنے ہی صاف تھے جتنے آسمان پر۔ قوسِ قزح کا یوں زمین پر اتر آنا اسے اپنی آئندہ زندگی کے لیے بڑا نیک شگون لگا اور یہ منظر اس کے ذہن میں زندگی

Marfat.com

کے چند نادر لمحات میں سے ایک بن کر محفوظ ہوگیا۔

"A thing of beauty is a joy for ever."

پھر اسد کے کہنے پر وہ چند روز ''کولا لائے'' ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کے لیے روانہ ہوگئے کہ اس جگہ کی خوب صورتی کچھ عجیب ہی شے تھی۔

OOO

Marfat.com

۱۴

کولا لائے ریسٹ ہاؤس کے لان میں اسد اور صبا بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے دریا تھا جو عین ریسٹ ہاؤس کے سامنے مڑ کر بائیں ہاتھ کو ہو لیا تھا۔ بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکراتا، راہ کے پتھروں کو پھلانگتا جھاگ اڑاتا وہ تیزی سے بہ رہا تھا۔ یہاں اس کا شور اس قدر زیادہ تھا کہ ایک دوسرے کو بات سمجھانے کے لیے بہت زور سے بولنا پڑتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسد اور صبا باتوں کی طرف سے بیگانے صرف اس منظر کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے، نیچے اتر کر دائیں طرف پتھروں اور لکڑی کے شہتیروں سے بنے ہوئے کئی کوارٹر تھے جن میں سے عورتوں اور بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور مرغیاں اِدھر اُدھر چگتی پھر رہی تھیں جو ایسی جگہوں پر آبادی کا واضح نشان نظر آتی تھیں۔ ان کوارٹروں میں سے ایک عورت نکلی۔ وہ سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تھی، اس کا رنگ سرخ اور سپید اور بے داغ تھا۔ ناک ستواں، آنکھیں دریا کے پانی کی طرح شفاف اور نمی لیے ہوئے۔ بال اماوس کی رات کی طرح سیاہ اور لمبے۔ وہ کوئی کپڑا دریا کے کنارے بڑے بڑے پتھروں پر ڈال کر واپس ہوئی اور انھیں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اسد نے اس کی طرف دیکھا۔ عورت کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے چمک سی پیدا ہوئی۔ ترشے ہوئے گلابی لبوں پر مسکراہٹ لہرائی اور اس نے ہاتھ اٹھا کر انھیں سلام کیا۔ اسد نے یکایک منھ دوسری طرف پھیر لیا۔ صبا نے اس کے سلام کا جواب دیا اور وہ واپس کوارٹر میں چلی گئی۔

دوپہر کو اسد سو گیا مگر صبا کو نیند نہ آئی۔ اتنے خوب صورت ماحول میں سو جانا جیسے اس کے لیے ممکن ہی نہ ہو۔ وہ اِدھر اُدھر پھر کر ہر خوب صورت نظارے کو اپنے ذہن

Marfat.com

کے کسی گوشے میں بٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ آگے کالام تک جانے والی سڑک پر دائیں اور بائیں طرف سے دو پہاڑ آکر یوں ملتے ہوئے معلوم ہوتے تھے جیسے انھوں نے سڑک ہی بند کردی ہوگی۔ پہاڑوں پر سبزہ ہی سبزہ تھا، دریا کے پار پہاڑوں پر لانبے لانبے درخت پریڈ کرنے والے سپاہیوں کی طرح قطار میں آگے پیچھے کھڑے تھے۔ دور دور چھوٹے چھوٹے مکانات تھے جن کے چاروں طرف ہرے بھرے کھیت نظر آتے تھے۔ یہ مکان پہاڑوں پر ان کے دامن میں، اوپر اور اوپر بعض اوقات چوٹی تک بنے ہوئے تھے۔ صبا حیران تھی کہ کس طرح رہنے والے اتنی اونچائی سے... چڑھتے اترتے ہوں گے یا وہ اس حد تک خودکفیل ہیں کہ انھیں کبھی نیچے آنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ دریا کے اس طرف جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا، سوائے ان چھوٹے چھوٹے جھولتے پلوں کے جو انھیں راہ میں ملے تھے۔

سب طرف چکر کاٹنے کے بعد وہ کوارٹروں کی طرف چلی گئی۔ بچوں سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ منھ پھاڑ کر ہنستے رہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کی زبان نہیں سمجھتے تھے مگر عجیب سی مخلوق سمجھ کر اس کے گرد گھیرا ڈالے دے رہے تھے۔ کوارٹر کے برآمدے میں دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک بوڑھی تھی، دوسری جوان۔ بوڑھی عورت شاید کسی زمانے میں خوش شکل ہو، اب صرف اچھے نقوش کھنڈرات کی شکل میں موجود تھے۔ صبا نے اس سے پوچھا، ''یہ تمھارا گھر ہے؟'' اس نے حیران ہوکر صبا کی طرف دیکھا اور عجیب لہجے مگر صاف اردو میں کہا، ''ہا... یہ ہمارا گھر ہے۔'' اجنبی زبان کا یہ فقرہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑی جیسے کوئی لطیفہ کہہ گزری ہو۔ بوڑھی عورت اور بچے بھی ہنسنے لگے۔

صبا نے دیکھا چولھے میں پتلی پتلی سوکھی شاخیں پتوں سمیت جل رہی تھیں اور اس پر کوئلے کی طرح سیاہ دھویں اور سوٹ میں اٹی ہوئی مٹی کی ہانڈی دھری تھی جس نے شاید زندگی میں اب تک پانی کی شکل نہ دیکھی تھی۔ جب ہانڈی ابلنے لگتی تو وہ عورت ڈھکن کھول کر ابلتے ہوئے پانی اور اس میں سے جھانکتی ہوئی سبزی میں زور زور سے پھونکیں مارتی جس سے کچھ دیر کو اس کا ابھان دب جاتا۔ صبا پتھر کی بے ترتیب سیڑھیاں چڑھ کر ان کے پاس برآمدے میں آکھڑی ہوئی۔ یہاں ایک طرف چولھا اور دیگر ساز و سامان تھا اور دوسری طرف سوکھی لکڑیاں تھیں۔ دو تین بکریاں بندھی تھیں اور ان کے آگے سبز پتے پڑے

Marfat.com

ہوئے تھے۔ جوان عورت سے اجازت لے کر وہ گھر کے اندر والے دروازے میں جھانکنے لگی۔ جتنا بڑا برآمدہ تھا، اتنا ہی بڑا ایک کمرہ تھا جس میں سوائے اس ایک دروازے کے کوئی اور دروازہ، کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔ کئی لمحے تک اس کی آنکھیں اندھیرے میں کچھ نہ دیکھ پائیں پھر رفتہ رفتہ عادی ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ اس میں چند ایک پلنگ ہیں۔ دیوار سے لگے ہوئے کچھ برتن رکھے ہیں۔ کمرے کی چوڑائی میں ایک رسّی بندھی ہوئی ہے جس پر لحاف، گدے چند ایک کپڑے اور ملیشیا کے چند کپڑوں کے ساتھ چمڑے کی ایک پیٹی لٹکی ہوئی ہے۔ صبا کے پوچھنے پر اس خوب صورت عورت نے بتایا کہ اس کا شوہر پولیس کا سپاہی ہے اور بیریئر پر ڈیوٹی دیتا ہے۔ بیریئر کے عین نیچے پتھروں کا ایک چھوٹا سا کمرہ صبا نے آتے وقت دیکھا تھا جو یہاں کا پولیس اسٹیشن تھا۔

دفعتاً صبا نے اس عورت سے پوچھا، ''کیا تم میرے صاب کو پہلے سے جانتی ہو۔''

عورت نے ظاہر کیا کہ وہ صبا کا سوال نہیں سمجھی۔ دوبارہ پوچھنے پر وہ بولی، ''نہیں۔'' اور پھر فوراً اضافہ کیا، ''ہاں... میرا خیال ہے یہ صاب شاید پہلے بھی اِدھر آیا ہے۔'' پھر اس نے اپنی زبان میں بوڑھی عورت سے کچھ کہا جو زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگی۔ صبا ان عورتوں سے ان کے رہن سہن کے متعلق چند سوالات پوچھنا چاہتی تھی مگر یہ دیکھ کر کہ وہ سوال ہی مشکل سے سمجھیں گی، جواب دینا تو بڑی بات ہے، وہ خاموش ہوگئی۔ اس عورت کا اتنا اردو سمجھ لینا ہی اس کے لیے باعثِ حیرت تھا۔ آخر وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی کہ اسے اتنی اردو کیسے آگئی۔ نہ جانے کیوں وہ عورت اس سوال پر شرما گئی اور بولی، ''بس آگئی... آپ جیسے مسافر لوگوں سے بول کر۔'' پھر اس نے بتایا کہ اس کے شوہر نے اسکول میں بھی پڑھا ہے اور کبھی کبھی مذاق میں وہ اس کے ساتھ بھی اردو بولتی ہے۔

اب اس کی موجودگی خود اس کے لیے اور عورتوں کے لیے گراں ہوتی جا رہی تھی، اس لیے وہ واپس چلی آئی۔ کچھ دیر ایک کتاب لے کر ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں بیٹھی رہی پھر اندر آکر لیٹ رہی۔ اسد کی نیند بھر گئی تو اب وہ اٹھ کر ٹہلنے کے لیے نکل گیا۔ شام کی چائے برآمدے میں بیٹھ کر پی اور پھر رات گئے تک آس پاس کی پہاڑیوں پر گھومتے رہے۔ رات کو کھانے کے بعد تھک ہار کر یوں بے ہوش سوئے جیسے سارے دن کی مشقت کے بعد کوئی مزدور سو جاتا ہو۔

Marfat.com

رات کو اچانک صبا کی آنکھ کھلی تو اسد اپنے بستر پر نہیں تھا۔ دوسرے کمروں اور غسل خانے میں بھی نہیں تھا۔ رات کے سناٹے میں دریا کی آواز اتنی تیز تھی جیسے کانوں کے پردے پھاڑ کر رکھ دے گی۔ صبا کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور برآمدے میں ستون سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ دن کا خوب صورت منظر اس وقت بے حد ہول ناک لگ رہا تھا۔ پتھر اور درخت سیاہ لبادے اور دیو کی طرح بھیانک نظر آرہے تھے۔ تاروں کی ہلکی روشنی اس اندھیرے اور دہشت کو دور کرنے سے قاصر تھی۔ اس ظاہری خوف کے علاوہ کوئی اندرونی کرب بھی تھا جو اس کے دل کو سوکھے پتے کی طرح لرزا رہا تھا۔ دفعتاً ڈھلائی پر سے دو سائے آہستہ آہستہ اوپر چڑھتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ سن ہوگئی۔ دیکھتے دیکھتے ایک کوارٹر کی طرف مڑ گیا، دوسرا اس طرف آنے لگا۔ کوارٹر کی طرف جانے والے سائے کو وہ پہچان گئی۔ وہ سیاہ لبادے والی خوب صورت عورت تھی، دوسرا سایہ اسد تھا۔ برآمدے میں صبا کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اندھیرے میں بھی صبا نے اس کے بدلتے ہوئے رنگ کو محسوس کیا۔ پھر کچھ سنبھل کر وہ بولا، ''یہاں کیوں کھڑی ہو؟''

صبا خاموشی سے اندر چلی آئی۔ اسد اس کے ساتھ تھا۔ غسل خانے سے آتی ہوئی روشنی میں اسد کا چہرہ بالکل سفید تھا۔ اس نے صبا کی طرف یوں دیکھا جیسے کسی سوال کا منتظر ہو۔ دونوں کی نظریں ملیں۔

اسد نے نظریں جھکالیں، پھر جیسے اس نے خود پر قابو پالیا۔

''کیا بات ہے تم... بالکل زرد ہورہی ہو۔'' اس نے پوچھا۔

اس وقت صبا کا دل بہت کچھ کہنے اور پوچھنے کو تڑپ اٹھا مگر اس نے صرف اتنا کہا ''میں ڈر گئی...اندھیرے میں، جب میں نے تم دونوں کو دیکھا۔''

صبا نے دیکھا کہ اسد کا رنگ ایک بار پھر بدل گیا۔ ایک لمحہ رک کر وہ بولا، ''میں تو ذرا باہر ٹہل رہا تھا۔ میرے ساتھ تو کوئی نہیں تھا۔''

اس وقت وہ لڑکھڑاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ مقفل کرلیا۔ دروازے سے لگی ہوئی اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور ہاتھ لرز رہے تھے۔ اسد نے تھوڑے وقفے کے بعد کئی بار دروازہ کھٹکھٹایا مگر وہ نہ کھلا۔ مایوس ہوکر وہ بستر پر دراز ہوگیا۔

Marfat.com

دوسرے روز جب خوب دن چڑھ گیا اور اس نے کئی بار صبا کو پکارا تو ڈگمگاتے قدموں سے اٹھ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ اسد نے اسے غور سے دیکھا، اس کا ہاتھ تھام لیا اور یکایک کہا، ''تمھیں تو بخار ہے۔'' واقعی صبا کو تیز بخار تھا۔ اسد نے آہستگی سے لاکر صبا کو اپنے بستر پر لٹا دیا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر آہستہ آہستہ اس کا سر سہلانے لگا۔ دفعتاً وہ بولا، ''صبی کیا تمھیں یقین ہے کہ تم نے رات کو میرے ساتھ کسی اور کو دیکھا ہے؟''

صبا کا تمتمایا ہوا چہرہ اور بھی سرخ ہوگیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور آواز کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''مجھے یقین ہے کہ میں نے تمھارے ساتھ سپاہی کی بیوی کو دیکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے پرس میں جتنے روپے کم ہیں، وہ اس وقت اس عورت کے پاس ہیں۔'' یہ کہہ کر صبا نے دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر اسد بولا، ''معلوم نہیں تم میری بات کا یقین کروگی یا نہیں...'' صبا کچھ نہ بولی۔ اور وہ دھیرے دھیرے کہنے لگا، ''میں اس عورت کو اور اس کے میاں کو پہلے سے جانتا ہوں۔ پہلے جب میں سوات آتا تھا تو کبھی کبھی اس ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا کرتا تھا۔ ان کا ایک لڑکا ہے، شاید بارہ تیرہ سال کا ہوگا۔ ایک بار کوئی امیر آدمی یہاں سیر کو آیا اور اس کے باپ سے بات کرکے اس لڑکے کو اپنے ساتھ لے گیا۔ ماں بہت روئی پیٹی مگر باپ کے لالچ کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ کل شام جس وقت تم یہاں لیٹی تھیں اور میں باہر گیا تھا، اس عورت نے رو رو کر بتایا کہ اس لڑکے کا مالک بہت ظالم ہے، اسے مارتا ہے، نہ کھانے کو دیتا ہے، نہ تنخواہ دیتا ہے۔ لڑکا خط لکھتا ہے کہ مجھے بلوا لو۔ باپ کہتا ہے کہ جھوٹ بکتا ہے، تم پرواہ مت کرو۔ شاید اس کی تنخواہ منی آرڈر کے ذریعے باپ کے پاس آجاتی ہو...اب کے اس نے ماں کو خط لکھا کہ اگر تم نے مجھے کچھ روپے نہیں بھیجے کہ میں گھر آسکوں تو میں دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلوں گا۔ میں نے اس عورت سے کہا کہ وہ خط لاکر مجھے دکھائے۔ وہ خط لینے گھر گئی اور میں روپے لینے اندر آگیا تو تم اٹھ چکی تھیں، میں نے سوچا نامعلوم تم کیا سمجھو، اس لیے اس وقت میں نے روپے دینے مناسب نہ سمجھے۔ وہ مجھے وہاں نہ دیکھ کر شاید واپس چلی گئی۔''

یہ سب سنانے کے بعد اسد دیر تک خاموش رہا۔ شاید وہ صبا کے کسی سوال یا ہوں ہاں کا منتظر تھا لیکن وہ خاموش تھی۔ آخر وہ پھر بولا، ''رات کو مجھے پھر خیال آیا کہ اگر میری

Marfat.com

تھوڑی سی مدد سے اس کے بچے کی جان بچ سکتی ہے تو مجھے روپے دے دینے چاہئیں۔ باپ کو دینے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا کیوں کہ وہ کبھی بچے کو نہیں بھیجتا۔ وہ آدمی بڑا کنجوس اور لالچی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں سپاہیوں کی تنخواہیں بھی کم ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ رات کو وہ گارڈ روم میں ہوگا، اس لیے میں گیا، عورت کو باہر بلایا اور وہ روپے اسے دے دیے۔"

اس وقت صبا کا دل تڑپ اٹھا کہ آنکھیں کھول کر اسد کے اس بیان کی تصدیق اس کی آنکھوں سے کرے۔ آنکھیں جو سچ اور جھوٹ صاف صاف کہہ دیتی ہیں لیکن وہ ڈر گئی... اگر اس کی آنکھوں نے اس کے بیان کو جھٹلا دیا... وہ سوچتی رہی اگر یہ بات ٹھیک ہے تو اسد نے اس پر اعتماد کیوں نہیں کیا کہ سارا قصہ سنا دے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ وہ روپے پیسے کے معاملے میں اتنی سخت نہیں ہے۔ اگر وہ ساری بات بتا دیتا تو وہ اپنے ہاتھ سے روپے اس عورت کو دے دیتی۔ اس سے زیادہ پوچھنا نہ اس کے بس کا تھا، نہ اس سے امید تھی کہ وہ بتائے گا۔ وہ خاموش آنکھیں موندے پڑی رہی لیکن یہ بات اس کے دل کے کسی کونے میں ایک گرہ سی بن کر بیٹھ گئی۔ ایک ایسی اندورنی چوٹ جس کی صحیح جگہ کا تعین چاہے نہ ہو مگر تکلیف برابر ہوتی ہے۔

تب وہ اجلا مصفا پانی، وہ دریا کے کنارے، اور پہاڑوں میں سیدھے کھڑے ہوئے ہرے بھرے درخت، وہ لہراتی سڑک، وہ بپھرتے پانی کے اوپر بنے ہوئے جھولتے پل، وہ شفاف نیلے آسمان پر قاز کے پروں کے سے سفید بادل ایک دم اس کے دل سے اتر گئے اور اس کا دل یوں بوجھل ہوگیا جیسے کسی نے من بھر کا پتھر باندھ کر کنویں میں لٹکا دیا ہو۔ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی گئی۔ وہاں دور دور کسی ڈاکٹر کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس لیے وہ پہاڑیوں کے اوپر چوکور زمردیں قطعے چھوڑ کر نیچے اترنے لگے۔ صبا پچھلی سیٹ پر لیٹی غنودگی کے عالم میں کار کے ہلکے ہلکے جھٹکے سہہ رہی تھی۔ شام کو پہاڑوں کے درمیان مرغولے کھاتا دھواں اور دور دور ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں انھیں الوداع کہہ رہی تھیں اور اسد کار چلاتے ہوئے جانے کس سوچ میں گم تھا۔

○○○

Marfat.com

حصّہ دوم

Marfat.com

۱

سیاحت میں ایک فائدہ یہ ہے کہ افسانوں کے لیے نئے نئے موضوع مل جاتے ہیں مگر ہم دونوں میاں بیوی کے ساتھ سیاحت کرنے میں یہ برائی ہے کہ اکثر دونوں ایک ہی موضوع کو افسانے کے قالب میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ پھر دونوں کو یہ اصرار ہوتا ہے کہ بس اس خاص موضوع کو جس طرح اس کا قلم افسانے کا روپ دے گا، وہ امر ہوجائے گا اور اگر دوسرے نے اسے چھیڑا تو اس موضوع کا بھی ستیاناس ہوجائے گا۔ اس بات کا فیصلہ زبانی ہو بھی نہیں سکتا۔ چناں چہ اس فساد میں اکثر وہ جیتتا ہے جس کا افسانہ پہلے مکمل ہوجائے۔ میرا پلڑا اکثر بھاری رہتا ہے۔ کیوں کہ امجد نہ صرف اس معاملے میں سست ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کو غمِ روزگار کے سلسلے میں کچھ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ چوں کہ سیاحت کی وجہ محض افسانہ نگاری نہیں بلکہ دونوں کا شوق ہے، اس لیے وہ ہر حالت میں جاری رہتا ہے۔

اب ہماری مالی حالت اتنی غیر متوازن اور غیر متوقع رہتی ہے کہ شاید انگلستان کا موسم بھی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی ہم ایس اے ڈی کے خوب صورت طیارے میں سفر کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں اور کبھی اپنی سودیشی ریل کی پسنجر ٹرین کے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں اور ہم دونوں صورتوں میں خوش رہتے ہیں۔ اپنے بجٹ کے نشیب و فراز کو بھی ہم نے اپنی سیاحت کے قالب میں ڈھال لیا ہے اور افسانہ نگاری ہمیں ہر ذلت سے بچاتی ہے۔ اگر ہم تھرڈ کلاس میں سفر نہ کرتے تو ہمیں یہ موقع بھلا کہاں دیکھنے کو ملتا کہ ایک اندھے نے صدا لگائی اور ایک بڑھیا نے اس سے پوچھا، ''بابا ریزگاری ہے؟'' اندھے نے اپنے پرانے رومال کے کونے سے ٹٹول ٹٹول کر ایک روپے کی ریزگاری بڑھیا کو دی اور

Marfat.com

اس نے ایک چھید والا نیا پیسا اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اب دونوں میں معرکے کی جنگ ہو رہی ہے۔ اندھا کہہ رہا ہے کہ دکان دار سے ریزگاری لو تو ایک آنہ وہ بھی رکھ لیتا ہے۔ بڑھیا بھی بڑبڑائے جاتی ہے۔ ہم تھرڈ کلاس کی لکڑی کی سیٹوں کی سختی کو نظر انداز کیے، اس وقت تک دلچسپی سے دیکھتے ہیں جب تک پڑوس کی سیٹ کی بچی عین میرے سلیم شاہی جوتے کے درمیان معصوم شرارت نہیں کر جاتی۔ اب یہ موضوع اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے گو یہ ہمارے لیے خاص دلچسپ نہیں مگر اس میں تنوع ضرور ہے۔ اسی طرح بڑے بڑے پگڑ باندھے اور گھیردار شلواریں پہنے مرد اندر داخل ہونے سے پہلے بدبو کے جھونکوں سے اپنی آمد کی اطلاع دینے والی عورتیں۔ قمیص یا شلوار میں سے کوئی ایک چیز پہنے ہوئے بچے اور پوٹلیاں اٹھائے بولائی ہوئی بڑھیاں بھی ہمیں بہت قابل دید چیز لگتیں۔ پھر اس ڈبے میں ہمارے سروں اور کندھوں سے ٹکراتے ہوئے چھکڑوں میں گنے بھی بھرے جا رہے ہیں، بوریاں بھی، چارپائی کی پٹیاں اور رنگین پائے بھی اور گھی کے بڑے بڑے کلسے بھی۔ ہر اسٹیشن پر نئے آنے والوں کے خلاف پرانے مسافروں کا محاذ اور ان کے زبردستی اندر آن کر گھس جانے پر بڑی بے تکلفی سے باتیں۔ اس سب واردات کے درمیان ہم لوگوں کو یوں گھور گھور کر دیکھا جانا گویا ہم قطعی سی آئی ڈی سے تعلق رکھتے ہوں اور ہم لوگوں کے متعلق مقامی زبانوں میں خوب گل افشانیاں ہوتیں اور قیاسات کے گھوڑے دوڑائے جاتے۔

پھر اکثر ہمیں واقعات یاد آتے رہتے ہیں۔ کئی دفعہ یوں ہوا کہ ہم نیویارک کے کسی شان دار سے ہوٹل میں صوفے پر بیٹھے ٹیلی وژن دیکھ رہے ہیں اور اچانک مجھے نوشہرہ بس اسٹینڈ کا زنانہ ویٹنگ روم یاد آ گیا جہاں کسی نامعلوم منبعے سے آیا ہوا نصف فٹ پانی ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ اس میں گنڈیریوں کی سفید پھولی ہوئی لاشیں اور مالٹے کے چھلکوں کے لائف بیلٹ تیرتے رہتے ہیں۔ میل سے چیکٹ بنچوں پر معطر بدبوؤں سے بسی ہوئی عورتیں، اجنبی تیز تیز نگاہوں سے مجھ جیسی غیر جنس کو دیکھ کر مستقل اپنی زبان میں کچھ بولتی رہتی ہیں اور جب لندن کے پکاڈلی بازار میں گھوم رہے ہوتے تو اچانک امجد کہتے، ''نامعلوم کیوں اس وقت مجھے پشاور کا قصہ خوانی بازار یاد آ گیا... بروک لین برج پر سے گزرتے ہوئے ہمیں اپنے جھولتے ہوئے کشتیوں کے پل یاد آتے۔ ایک ڈرگ اسٹور میں گھس کر سائیکل اور ریڈیو سے لے کر کتابیں اور آئس کریم تک دیکھ کر دل باؤلا ہو جاتا

Marfat.com

اور اپنے وطن کی دکان دکان پھر کر چیز ڈھونڈنے اور بھاؤ تاؤ کرنے کو طبیعت مچل اٹھتی۔ فرانس کے نائٹ کلب میں گجرات کی وہ عورتیں جو نہروں میں ننگی نہاتی ہیں اور چلتی کاروں کو دیکھ کر جل پریوں کی طرح ڈبکی لگانے کے بجائے باہر آ کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ سب بہت اچھا، بہت رومانٹک اور بہت دلچسپ ہے مگر اس سیاحت میں یہ ایک کیسا عیب ہے کہ کوئی چہرہ اور نام یاد نہیں رہتا۔ مختلف ملکوں کے ہزاروں لاکھوں نئے چہرے دیکھنے اور نام سننے کے بعد ذہن بس کوئلے کی بھٹی ہو کر رہ گیا ہے۔ ہر اجنبی چہرہ جانا پہچانا اور ہر دیکھا بھالا چہرہ بھولا بھولا سا لگتا ہے۔ ناموں پر تو جیسے کسی نے ایک دم لکیر پھیر دی۔ اگر صورت جانی پہچانی معلوم ہو بھی تو نام یاد نہیں آتا، نام یاد آ جاتا تو پھر وقت ہی کاہے کی تھی۔

چناں چہ اس وقت تیز گام کی ڈائننگ کار میں بیٹھے ہوئے میرے اور امجد کے درمیان یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ جو نوجوان سامنے کی میز پر بیٹھا ناشتہ کم اور اپنے ساتھی کے کان زیادہ کھا رہا ہے، اس کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔

''شمسی، اس کو ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔'' دفعتاً امجد نے فیصلہ سنا دیا۔ اس کی شکل اس گائیڈ سے ملتی ہے جو ہمیں اہرامِ مصر دکھا رہا تھا اور آواز بالکل اسی ڈاکٹر کی سی ہے جو روم کے ہوائی اڈے پر ہمیں فضول قصے سنا کر بور کر رہا تھا۔''

''تم بھی کیا بھولا ہو...'' میں نے کہا، ''ڈاکٹر تو ہمیں برموڈا میں ملا تھا اور اہرامِ مصر تو ہم اس مصری خاندان کے ساتھ دیکھنے گئے تھے...''

''خیر کچھ بھی ہو... امجد نے میری بات کاٹ دی۔ اس لڑکے کی شکل کسی ایسے شخص سے ملتی ہے جسے ہم نے دیکھا ہے۔ اس لڑکے کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' آخر میں راضی ہو گئی۔ مگر جب باتیں کرتے کرتے اس لڑکے نے یک لخت نظریں اٹھائیں تو مجھے دیکھ کر یوں ٹھٹک گیا جیسے پہچان گیا ہو۔ پھر اس کی نظروں میں بے یقینی آ گئی اور وہ آشنا سی لہر غائب ہو گئی۔ اب میں نے دیکھا کہ اس کی باتوں میں وہ یک سوئی نہیں تھی۔ وہ بار بار میری اور امجد کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''آؤ امجد چلیں...'' ناشتا ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔ اس پر اس لڑکے نے چونک کر پھر ہمیں دیکھا اور اٹھ کر ہمارے پاس آیا۔ ''معاف کیجیے، میں نے آپ دونوں کو کہیں دیکھا ہے۔''

Marfat.com

''یہی ہم غور کر رہے تھے۔'' میں نے کہا۔

''شمسی... مجھے یاد آیا۔ ان کی شکل کچھ اپنے ظفر الحسن صاحب کے لڑکے سے ملتی ہے۔ یاد ہے، وہی جو شملے میں ہمارے کرائے دار تھے۔'' امجد نے کہا۔ وہ لڑکا ہنسا۔

''معاف کیجیے میں آپ کے اُن ظفر الحسن صاحب کا لڑکا ہی ہوں۔ اسد... اور آپ شاید شمسہ باجی اور امجد بھیا...''

یکایک، ہم سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ یہ بھی خوب اتفاق تھا اور سیاحت میں ایسے اتفاقات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ جن سے لاہور کے موچی دروازے میں پکنک پر جاتے ہوئے کباب خریدنے میں ملاقات ہوئی، ان سے پھر لندن کے میوزیم میں اتفاق سے ملنا ہوا یا اپنی کوئی کلاس فیلو جسے بھولے بسرے بھی زمانہ ہوگیا تھا، دیکھا کہ جہاز میں سامنے کی سیٹ پر براجمان ہیں۔

پھر اسد بڑی بے تکلفی سے کہنے لگا، ''اچھا تو آپ دونوں نے شادی کرلی۔ بہت اچھا کیا۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ آپ دونوں جو جدا جدا بیٹھ کر افسانے لکھتے ہیں اور ہمیشہ مختلف جگہوں کی سیر و سیاحت کے شوق میں پھرتے ہیں اگر ساتھ ایسا کریں تو زیادہ لطف رہے۔''

''اگر تم اپنا یہ خیال پہلے ظاہر کردیتے تو میرے کئی سال تنہا دشت نوردی میں ضائع نہ ہوتے۔'' امجد نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ تم کیا کر رہے ہو؟''

''سروے میں ہوں، زمین ناپتا پھر رہا ہوں؟'' اس نے کہا۔

''شادی کی؟''

''جی ہاں، ابھی ایک ماہ ہوا۔''

''بیگم کہاں ہیں؟''

''اپنے کوپے میں۔''

''ناشتے پر تمھارے ساتھ نہیں آئیں؟''

''جی نہیں، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

پھر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب ہم شملے میں رہتے تھے تو میرے، امجد اور اسد کے والد ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ ظفر الحسن صاحب اسد کے والد، امجد کی

Marfat.com

کوٹھی میں بہ طور کرائے دار تھے اور آپس میں سب کے تعلقات بہت اچھے تھے۔

لاہور آنے سے پہلے اسد بہت بے تابی سے اٹھا اور ''ایکسکیوز می'' کہہ کر تیز تیز قدم رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہم بھی ناشتہ کب کا ختم کر چکے تھے، اس لیے اٹھ کر چلے آئے۔ ہم نے دیکھا کہ ایئر کنڈیشنڈ کوچ میں داخل ہونے والے دروازے پر کھڑا اسد ایک گول مٹول بچے کو گود میں لیے بے تحاشا پیار کر رہا ہے اور وہ بچہ اس کے گلے سے چمٹا منے منے قہقہے لگا رہا ہے اور خوشی میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر کوئی شخص اس منظر کو ہنس کر دیکھ رہا تھا۔ وہ غالباً اس بچے کو لے کر آیا تھا۔

بچے کا رنگ بے حد سفید اور بال بھورے تھے، نیوی بلیو سوٹ میں وہ سلولائیڈ کا بڑا سا بوا لگ رہا تھا۔ کوئی رشتے دار ہوگا، ان سے ملنے آیا ہوگا۔ میں نے سوچا لیکن جب ٹرین چلی تو وہ بچہ اسد کے ساتھ ٹرین ہی میں رہ گیا اور پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا شخص ان دونوں سے ہاتھ ملا کر بھیڑ میں گم ہوگیا۔

''کس کا بچہ ہے؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''میرا...'' کہہ کر وہ کسمسایا، پھر ہنس پڑا اور جھک کر اس لڑکے سے انگریزی میں کچھ باتیں کرنے لگا۔ مجھے کچھ ٹوہ سی ہوئی۔

''کس کا بچہ ہے یہ؟'' میں نے اصرار کیا۔

''میرا ہی سمجھ لیجیے۔''

''تمھارے ایسے کالے کوے کا؟'' میں نے اسے چھیڑا۔

''اور ابھی شادی کو ایک مہینہ ہوا ہے۔'' امجد نے چوٹ کی۔

''کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔'' کہہ کر وہ پھر ہنس پڑا۔ پھر نہایت سنجیدگی سے بولا، ''ہم نے اسے گود لیا ہے۔''

وہ ہمیں اپنے کوپے میں لے گیا اور اپنی بیوی سے ملوایا۔ اس کی بیوی کا چہرہ ان چہروں میں سے تھا جن کو ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد آسانی سے بھلایا نہیں جاسکتا۔ اس کے نقش غیر معمولی خوب صورتی اور معصومیت سے گندھے ہوئے تھے۔ سادگی اور بھول پن اس کی شخصیت کا طرۂ امتیاز تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک سوز سا تھا۔ جیسے وہ کسی اندرونی سوزش سے جل رہی ہوں یا شاید یہ اس وقت کے بخار کا اثر ہو۔ جس وقت ہم پہنچے، وہ

Marfat.com

لیٹی ہوئی تھی، ہمیں دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ اسد نے پیچھے تکیہ لگا دیا اور وہ اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''صبی، یہ ہمارے بہت پرانے جاننے والے ہیں۔ شمسہ باجی اور امجد بھیا... اسد نے تعارف کروایا اور یہ ہیں، ہماری بیگم صبا۔''

''ہم صرف جاننے والے نہیں ہیں۔ میں تمھارا استاد بھی رہا ہوں، کیوں یاد ہے؟'' امجد نے مذاق میں رعب ڈالا۔

''اچھا ہاں... چند مہینے آپ ہمارے استاد بھی رہے ہیں۔ آپ لڑکوں کو خوب پیپر آؤٹ کروایا کرتے تھے، ہے نا...'' اسد نے کہا۔

نالائق... استاد کے لیے ایسا کہتے ہیں۔'' امجد مصنوعی غصے سے بولے اور ہم سب ہنس پڑے۔

''یہ اس زمانے میں اتنا کام چور اور غبی ہوا کرتا تھا کہ حد نہیں۔ کیا اب بھی ایسا ہی ہے؟'' امجد نے صبا سے پوچھا۔

''نہیں تو...'' وہ بے یقینی سے بولی۔

''اچھا... گویا آپ نے خوب کس رکھا ہے۔''

''میں کس لائق ہوں۔'' اس نے شرما کر کہا۔

وہ گول موٹا بوا جس کا نام اسد نے بوبی بتایا تھا، کوپے میں پارے کی طرح مچل رہا تھا۔ کبھی وہ منی سی سیڑھی لگا کر اوپر کی برتھ پر چڑھ جاتا اور چند منٹ بعد نیچے اتر کر کوریڈور میں نکل جاتا۔ پھر وہ دیکھو تو غسل خانے میں پانی سے کھیل رہا ہے۔ وہاں سے نکلا تو صبا کے سینے پر چڑھ بیٹھنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔ صبا اس کے سرخ موٹے گال پر پیار کر کے اپنے پاس لٹا لیتی اور چند سیکنڈ بعد وہ اسد کی گود میں جھول رہا ہوتا۔ ہم دوپہر کے کھانے کے لیے اٹھ گئے۔ اسد صبا کو دودھ اور دوا اور بوبی کو کھانا کھلانے کے بعد ہم میں آن ملا۔ اس نے بتایا کہ کئی سال ہوئے، وہ امریکا گیا تھا۔ وہاں بوبی کے ماں باپ کا کسی حادثے میں انتقال ہوگیا اور اس نے بوبی کو گود لے لیا۔

''چہ چہ... بے چارہ...'' میں نے کہا۔

امجد چند لمحے خاموشی سے کچھ سوچتے رہے، پھر بولے،'' کوئی رشتے دار نہیں تھا

Marfat.com

ان کا؟''

''نہیں...'' اسد نے سر ہلایا پھر ایک دم بولا... ''نیویارک میں تو کوئی نہیں تھا، اگر ہوگا بھی تو انھیں میرے بوبی کو گود لینے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔''

''کیا تم نے ان سے پوچھا تھا یا اخبار میں اشتہار دیا تھا؟'' امجد کے ذہن میں ضرور کوئی افسانہ ابھر رہا تھا۔

''ہاں... کچھ... اس قسم کی... رسمیات ہوئی تو تھیں۔ اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں... آپ کا پرس تو بے حد پیارا ہے، کہاں سے خریدا۔'' دفعتاً موضوع پلٹ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوگیا۔

''دیسی مال ہے۔'' میں نے کہا، امجد پر کھوئے رہنے کا دورہ شروع ہو چکا تھا، جب وہ اپنی ناک کی پھننگ کو نوچتے ہوئے خیال کی دنیا میں ڈوب جاتے ہیں، ضرور کسی تازہ افسانے کا نزول ہوتا ہے۔ میں نے سوچا جہاں مجھے اپنے افسانے پر دھیان دینے کے لیے اکثر رات کی خموشی کی ضرورت ہوتی ہے، امجد پر دن دہاڑے تمام تر شور وشر کے درمیان یہ کیفیت نازل ہوتی رہتی ہے۔

''اور سب لوگ کہاں ہیں؟'' میرا مطلب ہے تمھارے والدین، بھائی وغیرہ۔'' امجد نے تخلیق کے آسمان سے یک لخت زمین پر اتر کر پوچھا۔

''ابا کا انتقال ہوگیا۔ اماں بڑے بھائی کے ساتھ لاہور میں ہیں۔'' اسد نے کہا۔

''شادی کہاں ہوئی؟''میں نے خالص نسوانی قسم کے سوالات پوچھنے شروع کیے۔

''برات پنڈی گئی تھی، واپسی پر لاہور جانا تھا مگر میں نے ارادہ بدل لیا۔ ہم لوگ اس روز سے ہنی مون کے لیے نکل کھڑے ہوئے، اب واپس لوٹتے ہیں۔ بوبی اور سارا سامان لاہور چلا گیا تھا جو اب ہمیں مل گیا۔ صبا کی بیماری کی وجہ سے کار بک کروانی پڑی اور ہم گاڑی سے جارہے ہیں۔''

کوریڈور میں چھت تک چنے ہوئے سوٹ کیسوں کی وجہِ جواز یہ تھی بہت سا سامان پہلے ہی بک کروایا جاچکا تھا۔

''مگر ولیمہ کہاں ہوا؟'' میں نے اس سوال کو بے حد ضروری سمجھا۔

''غائبانہ ولیمہ لاہور ہی میں ہوا۔ اب ہم کوئٹہ پہنچ کر ایک شاندار سی پارٹی

Marfat.com

دے ڈالیں گے اور قصہ ختم۔ لاہور جاتے تو فضول رسمیں ہوتیں۔ جانے کہاں کہاں سے رشتے دار اور برادری اکٹھی ہوجاتی ہیں۔ ان قضیوں سے بہت گھبراتا ہوں مگر عجب بات یہ ہے کہ صبیحی کو یہ گورکھ دھندے پسند ہیں اور ایک دن کہہ رہی تھی، مجھے ارمان تھا کہ دلہن بن کر بیٹھوں، محلے کی بیویاں آئیں اور دلہن کو دیکھیں۔ پگلی دقیانوسی لڑکی...'' اسد نے زور سے قہقہہ لگایا، ''اب بھی چاہتی تھی کہ ہم لاہور میں اتر جائیں۔ ان کے خیال میں سسرال میں قدم رکھے بغیر شاید شادی ہی نہیں ہوتی، میں نے کہا بیماری میں تمھیں آرام کی ضرورت ہے نہ کہ بھیڑ بھاڑ اور شور شرابے کی۔''

''شاید انھیں محلوں ٹولوں میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا؟'' میں نے کہا۔

''بالکل نہیں... ایک ان کے بابا ہیں۔ ایک پگلی سی پھوپھی ہیں اور ایک یہ ہیں، کل تین عدد ہیں۔ ایک بڑی خوب صورت سی کوٹھی راول پنڈی میں ہے، ایک کراچی میں۔ بابا زیادہ تر پھرتے رہتے ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد یہ بھی ان کے ساتھ پھرتی رہتی تھیں۔'' اس تمام قصے کے دوران اسد کا لہجہ فخریہ سا تھا، شاید اپنے بڑے سسرال کا مان تھا۔

''یوں کسی اسٹیشن پر یا کسی پکچر ہاؤس میں تمھاری ان سے ملاقات ہوئی پھر دونوں کی شادی ہوگئی اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔'' امجد کے اس پیوند پر ہم زور سے ہنس پڑے۔ آس پاس کے موٹے موٹے بزنس مین کاٹن ایکسچینج کی دلچسپ گفتگو میں خلل پڑتے دیکھ کر ہمیں گھورنے لگے۔ تب ہمیں اپنی بدتمیزی کا احساس ہوا اور یہ بھی کہ کھانا ختم ہوچکا ہے، چائے کا دور چل چکا ہے اور ہم خواہ مخواہ بیٹھے ہیں۔ پہلے میں اٹھی، پھر امجد اور اسد۔ جس وقت میں نے اپنے کیبن کے سامنے پہنچ کر پلٹ کر دیکھا تو دونوں کا پتا نہیں تھا۔ شاید ڈائننگ ہال کے دروازے پر یا کوریڈور میں کھڑے ہوکر باتوں میں کھو گئے تھے۔ ''یا اللہ! یہ آج کل کے مرد کس قدر باتونی ہوگئے ہیں۔'' میں نے یوں کہا جیسے اب سے چند سال پہلے مرد ہم عورتوں کے بارے میں کہا کرتے تھے۔

بوبی کوریڈور کی تمام کھڑکیوں کے شیشوں سے باری باری جھانکتا آ رہا تھا... میرے نزدیک پہنچا تو میں نے پوچھا، ''امی کیا کر رہی ہیں؟''

''Mummy is sleeping.'' اس نے انگریزی میں کہا۔

Marfat.com

"Don't you know urdu." میں نے اس سے پوچھا۔
"آتی ہے، ممی سو رہی ہیں۔" اس نے قابلیت جھاڑنے کے انداز میں اترا کر کہا۔
اتنے چھوٹے بچے کی ایسی باتیں سن کر میں نے سوچا کہ وہ صرف خوب صورت ہی نہیں بلکہ ذہین بھی ہے۔
"تمھیں ممی زیادہ پیار کرتی ہیں یا ڈیڈی؟" میں نے بچوں سے اکثر کیا جانے والا گھسا پٹا فضول سا سوال کیا۔
"دونوں!" اس نے کھڑکی کے پردے کو تسمے کے ساتھ کھولتے بند کرتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔
"زیادہ کون کرتا ہے؟"
"زیادہ کوئی بھی نہیں کرتا۔" اس نے معصومیت سے کہا۔ شاید وہ سوال سمجھا ہی نہیں تھا۔
"دونوں کم کرتے ہیں؟" میں نے پھر پوچھا۔
"ہاں دونوں کم کرتے ہیں۔" اس نے بے خیالی میں دہرا دیا اور میں ہنس پڑی۔
اسی وقت اسد اور امجد باتیں کرتے ہوئے اندر آئے۔ اسد کا چہرہ خاموش اور گمبھیر سا تھا۔ جانے دونوں کیا باتیں کر رہے تھے۔
"کیا تم نے یہاں بھی اپنی استادی جھاڑنی شروع کر دی۔" میں نے کہا، "اسد کا چہرہ اس وقت بالکل اس شاگرد کا سا ہو رہا ہے جس نے ہوم ورک نہیں کیا۔"
دونوں ہنس دیے۔ اسد کے چہرے پر ہلکی سی بشاشت آ گئی۔ وہ بولا، میں کبھی اچھا شاگرد نہیں بن سکا۔"
"اور میں کبھی اچھا استاد نہ بن سکا... حد ہو گئی کہ تم لوگوں نے میرے بنائے ہوئے پیپر تک آؤٹ کر لیے... اب تو بتا دو کہ تم نے کیا چالاکی کی تھی؟" امجد نے کہا۔
اسد ہنسا، "میں تو اس میں یوں ہی شریک تھا۔ دراصل میرا دوست اصغر، یاد ہے بڑا چالاک سا تھا۔ اس نے چپراسی سے مل کر الماری کھول لی تھی اور پیپر آؤٹ ہو گیا تھا۔"
"تم لوگوں کی اس شرارت کی وجہ سے مجھے استعفیٰ دینا پڑا۔ گو پرنسپل کو یقین تھا کہ میں نے خود پرچہ نہیں بتایا لیکن ایک دفعہ آپ دوسروں کی نظروں میں ذلیل ہو جائیں تو

نوکری کرنی بڑی مشکل ہوجاتی ہے۔'' امجد نے کہا۔

''یہ تو اپنا اپنا خیال ہے۔'' اس زمانے میں کالج میں ایک پرچہ آؤٹ ہوجانا بڑی بات سمجھی جاتی تھی ورنہ اب تو یونی ورسٹیوں تک کے پیپر آؤٹ ہو جاتے ہیں۔'' اسد نے رائے ظاہر کی۔

خیر اب تو ہر محکمے میں کرپشن آ گیا ہے۔ پہلے دو ایک محکمے اس لعنت سے پاک تھے، ان میں ایک تعلیم کا محکمہ بھی تھا۔''

''اچھا... وہ... اصغر...'' امجد سوچ میں کھوئے ناک کی پھننگ سہلاتے اصغر کا نقشہ اپنے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید اب اس لڑکے پر افسانہ لکھ کر بدلہ لینے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ کیوں کہ اس نے ایک زمانے میں ان کی روزی پر لات ماری تھی۔ ''وہی تو نہیں جس کی ناک پر مستا تھا، چشمہ لگاتا تھا، بڑا فتنہ تھا۔''

''جی ہاں، بالکل وہی...'' اسد نے کہا۔

''کہاں ہے آج کل وہ؟'' امجد نے شاید اس سے بدلہ لینے کا پورا تہیہ کرلیا تھا۔

''پڑھ لکھ کر تو اس نے دیا نہیں، اس کے ابا نے کسی بڑے آدمی سے سفارش کروا دی اور وہ آٹو موبائل انجینئرنگ کے لیے انگلینڈ چلا گیا۔ اب اپنا ایک گیراج کھول لیا ہے جس میں صرف سفارت خانے والوں کی کاریں ٹھیک ہونے آتی ہیں۔ جو بل بنتے ہیں ان میں سے آدھی تو قطعی بوگس ہوتے ہیں، باقی میں کام ہوتا ہے دس کا، تو دکھائے جاتے ہیں سو۔ ان کے ڈرائیوروں سے کچھ ماہانہ طے کر رکھا ہے۔''

''کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔'' امجد نے افسوس سے کہا۔

''بل سفارت خانے والوں کو خود ادا نہیں کرنے پڑتے بلکہ سفارت ادا کرتی ہے۔ اس لیے وہ کبھی یہ دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ کار میں کبھی وہ خرابی بھی ہوئی تھی جس کا ذکر بل میں کیا گیا ہے۔''

''تب تو وہ خوب کما رہا ہوگا۔''

''لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔'' اسد نے کہا، ''اور اب اس کی ناک پر مستا وستا کچھ نہیں ہے، نہ وہ چشمہ لگاتا ہے۔''

''کیوں؟'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

Marfat.com

"مستا اس نے کٹوا دیا ہے اور آنکھوں کے اندر لینس فٹ کروا لیے ہیں۔ اب تو ایسے ٹھاٹھ سے رہتا ہے کہ آپ دیکھیں تو پہچان بھی نہ سکیں۔ سفارت خانے کی بڑی بڑی پارٹیوں میں آتا جاتا ہے۔ چھوٹے آدمیوں سے بات بھی نہیں کرتا۔"

امجد کچھ بجھ سے گئے۔ سوچا ہوگا کہ اب اس سے بدلہ لینا بڑا مشکل ہے جب کہ اس کی شخصیت ہی بدل چکی ہے، خصوصاً شخصیت کے وہ جزو (مستا اور عینک) جو ان کے ذہن میں محفوظ تھے، غائب ہو چکے ہیں۔

"آؤ چلیں۔" انھوں نے کہا۔ ہم اپنے کیبن میں آگئے۔ اسد نے بوبی کا ہاتھ تھام لیا اور وہ جاتے ہوئے بولا، "چائے پر ملاقات ہوگی اب۔"

"ان شاء اللہ۔" میں نے دور سے کہا۔

امجد ابھی تک کسی سوچ میں غرق تھے اور میں اندازہ لگا رہی تھی کہ وہ بیش بہا تخلیق جو اس وقت ان کے ذہن میں ہے، اسد اور صبا سے متعلق ہے یا عینک اور مستے والے اصغر سے۔ ناک کی پھننگ سہلاتے ہوئے دفعتاً وہ چونک کر بولے، "میں شرط لگا سکتا ہوں۔"

"کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں... پھر بتاؤں گا۔"

یہ بات بھی میرے لیے قطعی نئی نہیں ہے۔ اکثر وہ کوئی بات کہتے کہتے پھر بتانے کا وعدہ کرکے پھر کبھی نہیں بتاتے۔ شاید وہ کوئی ایسا انوکھا خیال ہوتا ہے جسے بتاتے بتاتے وہ اچانک ڈر جاتے ہیں کہ کہیں میری بیوی اسے اپنا نہ لے اور "جملہ حقوق محفوظ" کہہ کر اسے ذہن میں مقفل کر لیتے ہیں جہاں وہ گل سڑ کر حافظے کے خانے سے گر کر بھول کی کھاد میں مل ملا جاتا ہے۔ میں اپنی دونوں ٹانگیں سکیڑ کر کھڑکی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنی ڈائری میں لکھنے لگی۔ یہ ڈائری بعد ازیں مجھے افسانے لکھنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ اس لیے گاڑی کے جھٹکوں اور حروف کی بگڑتی شکل سے قطعِ نظر میں بلاناغہ اپنی ڈائری لکھتی ہوں۔ امجد ایسا نہیں کرتے اور اکثر چوری چھپے میری ڈائری سے استفادہ کرتے ہوئے پکڑے جاتے ہیں۔ ایک مرض انھیں یہ بھی ہے کہ جب میں ڈائری لکھتی ہوں تو وہ برابر بولے جاتے ہیں۔

Marfat.com

''میں سوچتا ہوں انسان کی شخصیت کتنی بدل جاتی ہے۔'' بیٹھے بیٹھے انھوں نے ایک دم انکشاف کیا۔

''ہوں...'' میں نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

''اب یہ اسد بچپن میں اس قدر ضدی اور لاپرواہ تھا کہ حد نہیں۔ ذرا سی بات پر غصے سے بھوت ہوجایا کرتا تھا اور اب دیکھو کتنا سلجھا ہوا نظر آتا ہے۔ میرے تو خواب و خیال میں نہیں تھا کہ انسان اتنا بدل سکتا ہے۔''

''انسان بدل سکتا ہے مگر اس کی شخصیت کی بنیادی چیزیں کبھی نہیں بدل سکتیں۔'' میں نے ڈائری سے نظر اٹھائے بغیر کہا۔

''تمھارے بیان میں ہمیشہ تضاد ہوتا ہے۔ انسان بدل سکتا ہے مگر بدل نہیں سکتا۔ یہ کیا بات ہوئی۔'' انھوں نے مجھے چڑایا۔

''انسان ظاہرا طور پر بدل سکتا ہے جیسے کسی چیز پر ملمع ہوجاتا ہے۔''

''غلط... حالات اور ماحول انسان کو بدل دیتے ہیں۔'' وہ بہ ضد تھے۔

''کسی حد تک۔'' میں نے سمجھوتا کرنے کی کوشش کی۔

''میں تو زمین و آسمان کا فرق دیکھ رہا ہوں۔ اس کی ظاہری صورت میں اتنا فرق نہیں ہوا جتنا خیالات، رکھ رکھاؤ اور personality میں۔ ممکن ہے بیوی نے کچھ اثر ڈالا ہو...''

''شاباش...'' میں اپنی ہنسی روک نہ سکی، ''شادی کو ابھی صرف ایک مہینہ ہوا ہے۔ personality نہ ہوئی کپڑے ہوئے کہ پرانے اتار کر نیا شادی کا جوڑا چڑھا لیا۔''

''تمھیں تو میری بات کے خلاف کہنے کا مرض ہے۔'' امجد خفیف ہوکر خاموش ہوگئے۔

''اسد کے والد بھی تو بہت خوف ناک آدمی تھے۔ سنا تھا، انھوں نے اپنے کسی بچے کو چھت پر سے دھکا دے دیا تھا۔''

''وہ یہی تھا۔ اس وقت اس کی عمر مشکل سے چار سال کی ہوگی۔ نامعلوم کس بات پر غصے میں انھوں نے اسے دھکا دے دیا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور بہت چوٹیں لگیں۔ سر میں ٹانکے لگے اور کئی مہینے بیمار رہا۔ اس کے بعد ان کے والد صاحب تو کچھ سدھر گئے

Marfat.com

مگر یہ حضرت باپ کے بعد کے نرم برتاؤ اور ماں کے لاڈ پیار میں دو کوڑی کے ہو گئے۔''
اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ امجد نے کھولا تو وہاں اسد کھڑا تھا۔
''صبی کا بخار تیز معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے پاس تھرما میٹر ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔
میں نے اٹھ کر اپنے سفری دواؤں کے بکس سے تھرما میٹر اور بخار کم کرنے کے لیے دوا اسے دی۔ نئی دلہن کی بیماری اور وہ بھی سفر میں شوہر کے لیے کتنی تشویش ناک ہوسکتی ہے، اس کا اندازہ مجھے اسد کی صورت سے ہوا۔ انھیں روہڑی میں اتر کر کوئٹہ جانے والے کمپارٹمنٹ میں بیٹھنا تھا۔ سیدھے کوئٹہ جانے والی کوچ میں ان کا ریزرویشن نہ ہوسکا تھا۔ وہ اس لیے اور بھی پریشان تھا میں بھی صبا کو دیکھنے آئی۔ بخار واقعی تیز تھا۔ اس کے چہرے کی نرم جلد تمتما رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سرخ اور جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ بالوں کی ڈھیلی چوٹی نیچے سے تھوڑی سی کھل گئی تھی اور چہرے پر بھی کئی لٹیں بکھر گئی تھیں۔ بوبی اوپر کی برتھ پر سکون سے سو رہا تھا، اس کی لمبی پلکیں نصف گالوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ٹمپریچر دیکھ کر اسد نے اسے دوا پلائی۔ صبا نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں نے اسے آرام سے سو جانے کی ہدایت کی تاکہ شام تک بخار ہلکا ہوجائے۔ اس نے کروٹ بدل لی۔ اسد نے اسے گردن تک چادر اوڑھا دی اور اخبار سنبھال لیا۔ میں نے اچٹتی نگاہ ان کے قیمتی سامان پر ڈالی جس سے مجھے اپنی بے سروسامانی کا کچھ اندازہ ہوا اور میں شام تک صبا کا بخار اتر جانے کی امید کے ساتھ واپس چلی آئی۔
شام کو چائے کے وقت جب ہم نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ خیریت پوچھی تو صبا کا بخار واقعی ہلکا تھا۔ ہم سب نے ڈائننگ کار میں جانے کے بجائے وہیں چائے پی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ دفعتاً مجھے میرا بھائی یاد آیا جو کوئٹہ میں رہتا ہے۔ میں نے اسد سے کہا، ''تم کوئٹہ میں میرے بھائی سے ضرور مل لینا وہ بے چارہ وہاں تنہائی محسوس کرتا ہوگا۔

''کون؟... بڈی۔''
مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اسد کو میرے بھائی کا نام اب تک یاد تھا۔
''ہاں وہی... مگر اب اسے بڈی نہ کہنا، بگڑ جائے گا۔ بڑا حساس ہے، ابھی لا ختم کیا ہے۔ ابا کے ایک پرانے دوست بڑے گھاگھ وکیل وہاں ہیں۔ انھوں نے اسے اپنے

Marfat.com

پاس بلا لیا ہے۔"

"کہاں رہتا ہے وہ۔" اسد نے پوچھا۔

"کوئی چیز ہو تو میں پتا لکھ دوں۔" اسد نے ایک چھوٹی سی ڈائری دی جس پر میں نے عامر کا پتا لکھ دیا۔

"میں اس کی شکل قطعی بھول گیا ہوں۔" اسد نے کہا۔

"اب تو وہ پہلے سے بدل بھی بہت گیا ہے۔ بچپن میں تو بڑا چینچلا سا ہوتا تھا، اب تو ماشاء اللہ خوب جسم نکالا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہم ضرور ملیں گے۔" اسد نے کہا۔

"میں بھی اسے خط لکھ دوں گی، وہ تم لوگوں سے مل لے، کہاں قیام ہے تمھارا؟"

"ہم تو خانہ بدوش ہیں۔ آج یہاں کل وہاں، ٹھکانا وکانا کہیں ہوتا نہیں۔ کبھی کسی ریسٹ ہاؤس میں، ریسٹ ہاؤس نہ ہوا تو اپنے خیموں میں رہتے ہیں۔ ویسے آج کل ہم "ہوٹل چمنستان" میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"تب تو ہماری تمھاری زندگی ایک سی ہوئی۔" میں نے کہا، "میں عامر کو لکھ دوں گی کہ وہ کبھی ہوٹل جا کر تم لوگوں سے مل لے کب تک رہو گے کوئٹہ میں؟"

"سردیوں میں ہم میدان کا سروے کرتے ہیں۔ گرمیوں میں کوئٹہ، مری یا سوات چلے جاتے ہیں۔"

"بڑے خوش قسمت ہو ایسی نوکری ملی ہے۔" امجد نے کہا۔

"بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں۔" اسد نے اترا کر کہا۔

یہ تمام گفتگو صبا خاموشی سے سن رہی تھی، اور سر تکیے سے لگائے دھیرے دھیرے چائے کے گھونٹ پی رہی تھی۔ ہم مدت بعد اسد سے اور زندگی میں پہلی مرتبہ صبا سے ملے تھے پھر بھی کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم انھیں ایک عرصے سے جانتے ہوں اور خوب بے تکلف ہوں۔

رات کو صبا نے صرف سوپ اور دودھ پیا اور اسد ہمارے ساتھ ڈائننگ کار میں

Marfat.com

چلا آیا۔ کھانے کے بعد صبح کی طرح پھر یہ دونوں کوریڈور میں کھڑے سگریٹ سے شوق کرتے اور گپ شپ ہانکتے رہے اور میں صبا کو یہ کہہ کر کہ اب روہڑی میں ملاقات ہوگی، اپنے کمرے میں آ گئی۔ مجھے گاڑی میں ویسے بھی بچوں کی طرح بے تحاشا نیند آتی ہے اور جب یہ نیلی سکون آمیز فضا ہو، دل پر کوئی بوجھ نہ ہو اور پرس میں تھوڑے سے پیسے بھی ہوں تو کوئی تعجب نہیں کہ میں کھانا کھاتے ہی رات کے کپڑے پہن بستر میں دراز ہوگئی۔

امجد آئے تو انھوں نے مجھے مسکرا کر دیکھا گویا کہہ رہے ہوں، ''بس گئیں تم تو۔''

''مجھے گاڑی میں ایسی نیند آتی ہے جیسے کچھ پی رکھا ہو۔'' میں نے صفائی پیش کی۔

''مجھے معلوم ہے۔'' امجد نے کہا، ''تم سو جاؤ، میں ذرا اخبار دیکھوں گا۔''

''اخبار!'' میں نے چڑ کر کہا، ''مجھے یقین ہے کہ میدانِ حشر میں بھی تمھارے ہاتھ میں اخبار ضرور ہوگا۔ جب پرسش ہوگی تو تم کہو گے کہ ذرا دم لو، میں اخبار تو پڑھ لوں... اس دن کی خبریں بھی زوردار ہوں گی، کیوں؟...'' امجد ہنس دیے اور میں آنکھیں بند کر کے چند منٹ میں سو گئی...

○○○

Marfat.com

۲

میری آنکھ دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز سے کھلی۔ گہری نیند سے اٹھنے کے بعد مجھے ہوش نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ کمرے کی نیلی فضا، گاڑی کی کھٹا کھٹ میں دروازے کی کھٹ کھٹ مجھے عجیب خواب آور سی معلوم ہوئی، امجد کے دروازہ کھولنے کے ساتھ آواز آئی، ''ایک سیکنڈ... میں اطمینان کرلوں کہ وہ سو رہی ہیں۔'' میں نے آنکھیں موند لیں، امجد نے بڑی احتیاط سے جھک کر میرے چہرے کو دیکھا۔ پھر دیوار کی طرف کروٹ دلا کر شال گردن تک میرے اوپر ڈال دی اور دروازے پر جا کر کیا، ''ہاں سو رہی ہیں۔ اندر آجاؤ...''

اور اس وقت مجھے یاد آیا کہ میں ایئر کنڈیشنڈ کوچ کے ایک کیبن میں ہوں۔ یہ فیروزی رنگ کی خوب صورت دیوار اس کیبن کی دیوار ہے اور یہ کہ امجد نے کسی کو اندر بلایا ہے۔

''یہاں بیٹھ جاؤ، اطمینان سے۔'' امجد کی آواز سنائی دی۔ میرا منھ دوسری طرف تھا مگر کان اس طرف لگے ہوئے تھے۔

''سگریٹ لو...'' لائٹر کی آواز کے ساتھ اخبار ایک طرف ڈالنے کی آواز سنائی دی۔

''ضیا کی طبیعت اب کیسی ہے۔ ان کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوا، تمھارے یہاں آنے پر۔'' امجد مستقل بول رہے تھے۔

''وہ تو گہری نیند سو رہی ہیں۔'' پہلی مرتبہ اسد کی آواز سنائی دی۔

''اچھا تم کب گئے تھے امریکا؟'' امجد نے پوچھا۔

Marfat.com

''چار سال کے قریب ہو گئے۔'' اسد نے کہا۔

''تم تو اس وقت بہت کم عمر ہو گے۔''

''جی ہاں، ظاہر ہے۔''

''ان حالات میں وہ بات زیادہ قرینِ قیاس بھی ہے۔'' امجد نے کسی خاص بات کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ ابھی تک اس بات پر مصر ہیں۔'' اسد نے کھسیانی سی ہنسی ہنس کر کہا۔

''یقیناً...اور اب تو تم ایک طرح سے اقرار کر چکے ہو۔ میں نے تمھیں اس لیے بلایا ہے کہ تفصیل سے سارا قصہ سنوں۔''

''پہلے ایک بات بتائیے...آپ کو یہ شک ہوا کیسے؟'' اسد نے پوچھا۔

''شک ایسے ہوا کہ میں شروع سے تمھاری طبیعت کو جانتا ہوں کہ کون سی ذمہ داریاں تم لے سکتے ہو اور کون سی نہیں، اس کا مجھے اندازہ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور باتیں میں نے نوٹ کیں جو بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم پورا قصہ سناؤ۔''

''مگر... دیکھیے ... اگر یہ بات اور لوگوں کو پتا چل گئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔''

''میں کسی کو نہیں بتاؤں گا بھئی، تم یقین کرو۔ اور یوں کہنے کو تو میں اب بھی کہہ سکتا ہوں، لوگ اپنے قیاس سے کہی ہوئی بات آنکھوں دیکھی سے زیادہ وثوق سے کہتے ہیں پھر بات پھیل جاتی ہے اور یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔''

''وعدہ کیجیے کہ آپ شمسہ باجی کو بھی نہیں بتائیں گے۔''

''نہیں...انھیں بھی نہیں۔'' امجد نے کہا۔

''اور بعد میں کبھی بھولے سے بھی کسی سے ذکر نہ کیجیے گا۔ ایک طرح سے یہ میری موت اور زندگی کا سوال ہے۔'' وہ ہنسا۔

''ارے بھئی نہیں، ہم یہاں رہتے ہی کون سے ہیں۔ آج اتفاق سے برسوں بعد تم سے ملاقات ہو گئی، ورنہ تم کہاں اور ہم کہاں۔'' امجد کی آواز سنائی دی۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ اس کے بعد اسد کی میٹھی، رواں آواز نے کہنا شروع کیا۔

''قصہ یہ ہوا کہ میرے امریکا جانے سے چند روز پہلے ہی اصغر وہاں سے ہو کر آیا تھا۔ وہی اصغر جس کا ذکر میں نے صبح کیا تھا۔ اس نے وہاں کے بڑے رنگین قصے مجھے

Marfat.com

سنائے۔ جگہیں اتنی حسین ہیں کہ ساری عمر دیکھتے رہو تو دل نہ بھرے اور لڑکیاں... وہ تو لڑکیوں کا ملک ہے بھائی۔ دفتروں میں، ہوٹلوں میں، دکانوں میں، لائبریریوں میں ہر جگہ انھیں ہی دیکھ لو جیسے بجلیاں چمک رہی ہوں۔ جسم جیسے سانچے میں ڈھلا ہوا، باتیں کریں گی تو یوں جیسے پھوار گر رہی ہو۔ جب وہ آپ سے بات کریں گی تو معلوم ہوگا کہ اس سے زیادہ بے تکلف تو وہ اور کسی سے ہو ہی نہیں سکتیں، ایک یہاں کی لڑکیاں ہیں کہ مزاج ہر ایک کا ساتویں آسمان پر۔ غرض کہ اس نے مجھے بہت سے قصے سنائے اور کہا کہ دیکھو یوں اگر through proper channel تم نے رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تو بہت دن لگ جائیں گے، روز روز کی دعوتیں اور ناچ کے بلاوے تمھارا دیوالیہ نکال دیں گے اور پھر بھی مطلب حل ہو یا نہ ہو۔ بہتر یہ ہے کہ تم وہاں شادی شدہ زندگی گزارو۔

''کیا مطلب؟'' میں نے تعجب سے کہا، ''شادی کرلوں وہاں جاکر، ایسی کون لڑکی میرے لیے تیار بیٹھی ہے وہاں۔''

''اوہو، کون احمق کہتا ہے کہ نکاح پڑھوا لو۔ ارے بھئی وہاں یہ چیز عام ہے، لڑکیوں کے پاس مکان ہیں، آپ وہاں میاں بیویوں کی طرح رہیے، جتنے دن، جتنے مہینے چاہیں۔ ڈیڑھ دو سو ڈالر مہینے پر یہ سودا برا ہے؟ اور پھر ایک ایسی لڑکی کو میں جانتا ہوں کہ ساری عمر یاد کرو گے۔''

''سچ کہو... تم نے بھی وہاں یہی کیا؟''

''ہاں... اور احسان نہ مانو گے کہ اس شعلۂ جوالہ کا پتا بتا رہا ہوں، کہو تو ایک سفارشی خط بھی لکھ دوں؟'' اس نے مجھے پتا دیا اور شاید اسے ایک خط بھی لکھ دیا۔ میں نے اس بات کو اس وقت کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی بلکہ مذاق میں ٹال دیا۔

امریکا پہنچ کر ایک دن باتوں باتوں میں ایک ساتھی سے اس کا ذکر آ گیا... وہ وہاں جانے پر مصر تھا۔ اس کی ضد پر میں بھی ساتھ چلا گیا، کچھ احساسِ تجسس ہی سمجھ لیجیے... اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ وہ لڑکی تھی یا عورت یہ تو میں قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا مگر اس نے خود کو خوب صورت ضرور بنا رکھا تھا۔ وہ وہاں کی عام لڑکیوں سے زیادہ اچھی نظر آتی تھی اور اس کا مذاق عام کال گرلز کی طرح چیپ نہیں تھا... اسے میرا نام معلوم ہوا اور یہ کہ میں نیا آیا ہوں تو اسے یہ احساس ہوگیا کہ میں وہی ہوں جس کا ذکر احمد نے خط میں کیا

Marfat.com

تھا۔ اس کا رویہ کچھ زیادہ دل رُبایانہ ہوگیا۔ دوسرے دن اس نے مجھے چند قابلِ دید جگہیں دکھانے کی پیش کش کی اور صرف مجھے ہی بلایا۔ میں چلا گیا... سچ کہتا ہوں، اس وقت تک مجھے کچھ خیال نہیں تھا صرف وہی تجسّس سمجھ لیجیے... اس رات اس نے مجھے اپنے ہاں کھانا کھانے کی دعوت دی، بڑا گھریلو سا ماحول تھا۔ اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی دو تین چیزیں تھیں۔ کھانے کے بعد ہم بہت دیر تک وہاں کے ہٹ ریکارڈ سنتے رہے، پھر ترنگ میں آکر ڈانس کرنے لگے... پھر نہ جانے اس لڑکی نے کچھ جادو کر دیا، شاید جب میں وہاں گیا تھا تو دل میں کہیں کوئی چور تھا جو بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ بہ ظاہر تو میں ایسی زندگی کے لیے تیار نہ تھا مگر کوئی مجبور کردے تو پھر میں اتنا باہمت بھی تو نہیں ہوسکتا تھا۔''

''سچ کہتے ہو...'' امجد شاید اسد کی صاف گوئی سے متاثر ہوگئے تھے۔

''بہرحال ہم میاں بیوی کی طرح رہنے لگے۔ اس کی آواز میں بے حد رس تھا۔ وہ مجھے ڈارلنگ کہتی تو محسوس ہوتا کہ جیسے میں اس آواز کے رشتے سے ہی اس سے بندھ گیا ہوں۔ شروع میں جب مجھے خیال آتا کہ یہ سب جھوٹ ہے، ڈھونگ ہے چند ماہ بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا اور یہ گھریلو فضا ختم ہوجائے گی تو میرا دل بیٹھنے لگتا۔ مجھے یہ سب بڑا اچھا لگنے لگا تھا۔ صبح اٹھ کر بیڈ ٹی بنانے میں جب کہ ایک کندن سا آپ کے بستر پر پڑا دمک رہا ہو، کسی کے سنہری ریشمی بال بکھرے ہوئے ہوں تو ایک خاص قسم کی راحت محسوس ہوتی ہے نا؟'' اسد ہنسا اور ساتھ ہی امجد بھی۔ مگر میرے جاگ اٹھنے کے خیال سے شاید دونوں محتاط تھے۔ امجد یہ چاہتے تھے کہ ہنسی میں یا اِدھر اُدھر کی باتوں میں موضوع بدل نہ جائے۔ چناں چہ وہ درمیان میں بولنا بھی پسند نہ کرتے اور اس وقت تک خاموش رہتے جب تک اسد سگریٹ کا کش لے کر دوبارہ اپنی ٹوٹی بات کا سرا نہ جوڑ دیتا۔

''جتنے میں تیار ہوتا وہ اٹھ کر ناشتا بنا لیتی۔ ہم دونوں ساتھ ناشتہ کرتے، وہ نیک بیوی کی طرح روز مجھے دروازے تک چھوڑنے آتی۔ شام کو ہم اکثر باہر جاتے۔ کبھی پکچر، کبھی بازار، کبھی کسی نائٹ کلب میں پہنچ جاتے۔ کسی سخی دل میاں کی طرح میں اپنا پرس ہر جگہ فرخ دلی سے نکالتا۔ یہ میں ضرور کہوں گا کہ کیٹی کو فرمائش کرنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ اس کی فرمائش چاہے کسی نئے گاؤن کی ہو، کسی زیور یا کسی پارٹی کی، کبھی گراں نہیں گزرتی تھی۔ دن رات یوں ہی خواب میں گزر رہے تھے۔ مجھے کیٹی سے محبت نہیں تھی۔ میں اس

Marfat.com

کے بغیر تڑپتا نہیں تھا۔ مجھے گھریلو زندگی کی وہ گرم گرم فضا اچھی لگتی تھی...مگر کئی مرتبہ کسی اچھی ڈانس پارٹنر کو دیکھ کر دل بے اختیار چاہتا کہ کیٹی کی جگہ یہ ہوتی تو...اور چند دن بعد اس نشے کا خمار بھی اترنے سا لگا۔ شاید انسان کا دل ہر چیز سے اکتا جاتا ہے، خصوصاً جب چند معقول یا غیر معقول وجہیں بھی اس کے پاس ہوں...کبھی میں سگریٹ پی رہا ہوتا اور وہ میری کرسی کے ہتھے پر بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگتی تو مجھے خیال آتا کہ مجھ سے پہلے جانے کتنوں سے اس نے اسی طرح باتیں کی ہوں گی، کتنے کانوں میں اس نے یوں ہی رس گھولا ہوگا۔ یہ ریشمی بال کتنے ہی ہاتھوں نے چھوئے ہوں گے، کبھی میں اپنی جگہ احمد کو تصور کرتا، کبھی کوئی سیاہ ریچھ میری جگہ بیٹھا نظر آتا جس سے وہ اسی طرح ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے۔ یوں ہی بہلا پھسلا کر باتوں باتوں میں کسی ڈانس پارٹی میں جانے کی یا نئے گاؤن کی فرمائش کر رہی ہے۔ یہ احساس بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔'' وہ ہنسا، ''اور پھر دیکھیے یہ کتنی بیوقوفی تھی۔ کیٹی میری بیاہتا بیوی نہیں تھی، جب میں نے اس کے ساتھ رہنا شروع کیا تھا، اس وقت بھی مجھے معلوم تھا کہ یہ اس کی تجارت ہے۔ وہ یہی کرتی آئی ہے اور یہی کرتی رہے گی۔ میں نے اسے بہ قائمِ ہوش وحواس تسلیم کیا تھا مگر اب میرا دل بجھا بجھا سا رہتا تھا۔''

''آپ کے خیال میں کیا میں بہت جذباتی ہوں؟'' دفعتاً اس نے پوچھا۔

''شاید...'' امجد نے گول مول سا جواب دیا۔

''لیکن میں خود کو بہت جذباتی بھی نہیں سمجھتا یا شاید اس کے بعد میں سنبھل گیا ہوں۔ اس زمانے میں تو واقعی میں کم عمر بھی تھا اور ناتجربہ کار بھی۔ بہرحال اب وہ گھریلو فضا مجھے اتنی اچھی نہ لگتی تھی۔ باہر بھی اکثر تنہا ہی چلا جاتا تھا۔ کئی مرتبہ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا، میں نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اپنی معصومیت، اپنی ماں کا اعتماد، بہن بھائیوں کا بھروسا پردیس میں آکر کس بے دردی سے روند ڈالا۔ میں کیوں اس غیر، آوارہ لڑکی پر روپیہ پانی کی طرح بہا رہا ہوں؟

بھائی لکھتے تھے کہ کوئی اچھی بڑی سی کار لانا، یہاں بہت قیمت پر اٹھ جائے گی، بہنیں اور بھاوجیں طرح طرح کی چیزوں کی فرمائش کرتی تھیں۔ امی نے لکھا تھا، تمھارے لیے لڑکی تلاش کر رہی ہوں، وہاں سے بری کے لیے کپڑے لیتے آنا۔ مگر میں نے ان

Marfat.com

باتوں پر کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔ یہ باتیں میرے ذہن کے کسی کونے میں اس طرح پڑی تھیں جیسے گھر والوں کے خطوط میز کی کسی دراز میں۔ لیکن یکایک میرا دل صبح شام مجھ سے کہنے لگا۔

''یہاں سے چلے چلو... چلے چلو...''

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ مہینے کے آخر میں کسی طرح کیٹی سے کسی ضروری کام پر دوسری جگہ جانے کے بہانے سے رخصت چاہوں کہ اچانک اس نے وہ خوش خبری سنائی جسے سن کر میں بدحواس ہوگیا۔ میں نے اس کے متعلق کبھی نہیں سوچا تھا۔ احمد نے اشارتاً بتایا تھا کہ ان باتوں کے متعلق تمھیں قطعی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اچانک یہ خبر سن کر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کروں، ہوش آیا تو میں نے اسے اس آفت سے چھٹکارا پانے کی رائے دی۔ اس نے کہا کہ وہ پہلے ہی کوشش کر چکی ہے اور اب اس حد سے آگے نکل جانے کے بعد ہی اس نے مجھے بتایا ہے۔ میں خاموش ہوگیا اور کیا کرتا۔

''تم نے کسی سے رائے بھی نہیں لی؟'' امجد بولے۔

''نہیں... میں ڈرتا تھا کہ بات پھیل جائے گی۔'' اور وہاں کوئی ایسا نظر بھی نہ آتا تھا جو صحیح رائے دے سکے... میں پہلے کی طرح کیٹی کے ساتھ رہتا تھا۔ اب میں سب کچھ اس طرح برداشت کرتا رہا جیسے ایک غریب شوہر اپنی مرضی کے خلاف باندھی گئی لڑکی کے ساتھ مرنا بھرنا گوارا کرتا ہے۔ میں اس کا خیال رکھتا تھا۔ کھانے کے بعد کیلشیم اور وٹامن کی شیشیاں اس کے ہاتھ میں دیتا تھا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے مارے احتیاط کے اس کا ہاتھ تھام لیتا تھا اور جب وہ اسپتال میں درد سے تڑپ رہی تھی تو برآمدے میں اس طرح بے چینی سے ٹہل رہا تھا جیسے کوئی بھی باپ اپنے پہلے بچے کی پیدائش سے پہلے ٹہلا کرتا ہے۔ پھر جب میں نے اُسے دیکھا تو مجھے اس پر بے اختیار پیار آنے لگا۔ وہ بڑا پیارا تھا اور میرا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچتا تھا۔

جب ایک دن کیٹی نے کہا کہ وہ بچے کو کسی امیر گھر میں ہمیشہ کے لیے دے رہی ہے تو میں نے اسے روک دیا... وہ میرا بچہ تھا اور میں اسے پاس رکھنا چاہتا تھا، میں نے والد کو صاف صاف لکھ دیا کہ میں مصیبت میں گرفتار ہوگیا ہوں بلکہ صورتِ حالات کو کہیں نازک بتایا۔ اس حد تک کہ اگر لڑکے کو میں نے گود نہ لیا تو بات مقدمہ بازی تک

Marfat.com

پہنچے گی، ساری عمر کے لیے مالی طور پر قید ہوجاؤں گا، بدنامی الگ ہوگی اور لڑکا پھر بھی میرے پاس نہ رہے گا، یوں بات چپ چپاتے طے ہوجائے گی کیوں کہ لڑکی اس بات پر تیار ہے۔ ظاہر ہے ابا اس خط پر بہت تلملائے۔ لوگوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ اس کے بعد سے وہ بیمار پڑے اور کبھی نہ اٹھے مگر میں اس بات کو نہیں مانتا... اماں کئی دن تک سینہ کوٹتی رہیں، بہنیں ایک دوسرے کے گلے لگ کر روتی رہیں... یہ سب بعد میں بڑے بھائی نے بتایا... وہ خود بڑے خاموش طبیعت اور فلسفی مزاج آدمی ہیں۔ انھوں نے صورتِ حالات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک رات سب کو جمع کر کے حالات کی اونچ نیچ سمجھائی کہ جو کچھ ہوگیا، اب اس کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ کے لیے بہترین صورت کیا ہوسکتی ہے، مختلف زاویوں سے انھوں نے بتایا کہ بہترین طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ میں لڑکے کو لے آؤں۔ ظاہر ہے رفتہ رفتہ سب اس بات پر رضا مند ہوگئے۔ جو کچھ ہوچکا تھا وہ واقعی مٹایا نہیں جاسکتا تھا اور میں لڑکی تو تھا نہیں کہ ابا کھود کر گاڑ دیتے۔ امی اپنے ہاتھ سے زہر کا پیالہ دے دیتیں یا بھائی کسی بہانے جنگل میں لے جاکر لاٹھیوں سے سر پھاڑ دیتے۔ میں لڑکا تھا اور نوجوان تھا۔ بھائی نے مجھے لکھا کہ امی نے صدمے کے پہلے جھٹکے پر قابو پانے کے بعد میری پرجوش سفارش کی اور کہا، مرد ذات سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ چناں چہ خاندانی سبکی سے بچنے کے لیے وہ بہانہ گھڑا گیا جو میں نے آپ کو سنایا تھا۔'' غالباً اس نے ایک زوردار کش لگایا اور خفت آمیز ہنسی کے ساتھ بولا، ''اب یہ بات سناتے سناتے بعض دفعہ مجھے خود بھی یہی محسوس ہوتا جیسے یہ بات ٹھیک ہو۔ اگر مجھے بوبی سے اتنی بے تحاشا محبت نہ ہوتی تو شاید میں واقعی بھول جاتا کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ اور میں نے اسے کسی حادثے سے بچا کر نہیں پالا۔''

''دراصل اسی چیز نے تمھارے راز کو افشا کیا۔'' امجد کی آواز آئی۔

جب پہلی مرتبہ تم نے اسے گود میں لے کر پیار کیا ہے تو تمھارے چہرے کی کیفیت اور تمھاری آنکھیں تمھاری ماتما کی چغلی کھا رہی تھیں... ماتما، میں نے اس لیے کہا کہ باپ کی محبت کے لیے کوئی ایسا لفظ ہی موجود نہیں۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا، یہ تمھارا بھانجا بھتیجا ہوسکتا ہے مگر تمھیں اس سے اس درجے پیار کیوں کر ہوا مگر جب تم نے بتایا کہ تم نے اس بچے کو گود لے رکھا ہے تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ گود لیا ہوا

Marfat.com

بچہ بھی فطری محبت پیدا نہیں کرسکتا۔ پھر جب میں نے اس کے گود لینے کے قصے پر تھوڑی سی جرح کی، تمھارا رنگ فق تھا اور تم جو کچھ کہہ رہے تھے، ایسی بے یقینی سے کہہ رہے تھے کہ اس کا سچ ہونا تو ایک طرف، معلوم ہوتا تھا، تم نے کبھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے... میں آپ کی قیاس آرائی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"میاں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے؟" امجد نے رعب ڈالا، "اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہ بات تم نے اپنی بیوی سے بھی چھپائی ہے..." اب باقی قصہ امجد دوسرے طریقوں سے اگلوانا چاہتے تھے۔

"پہلے میرا ارادہ تھا" اسد نے کہا، "شادی کے کچھ عرصے بعد موقع دیکھ کر میں اسے بتا دوں گا مگر اب میں نے دیکھا کہ وہ دوسرے مزاج کی لڑکی ہے۔ وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرسکے گی... شروع میں باوجود کوشش کے وہ حادثے والا قصہ میں اس کے سامنے نہ دہرا سکا اور وہ بوبی کو پہلی بیوی سے میرا بیٹا سمجھتی رہی اور اس وقت بعض دفعہ میں نے اس کے چہرے پر اس دکھ کی پرچھائیاں رینگتی دیکھیں۔ وہ بڑی آئیڈلسٹ قسم کی لڑکی ہے اور عورتوں اور مردوں کے لیے علاحدہ اخلاقی معیار کی قائل نہیں ہے۔"

"ایسی حالت میں اس سے چھپائے رکھنا ہی بہتر ہے، تاوقتے کہ کوئی خاص ضرورت محسوس نہ ہو..." امجد نے کہا۔

چند منٹ خاموشی رہی جس میں دونوں یقیناً سگریٹ پیتے رہے ہوں گے۔ پھر امجد کی سنجیدہ اور گمبھیر آواز سنائی دی، "اب تمھیں محتاط رہنا چاہیے۔ اسد میں مانتا ہوں بعض اوقات ایسے حادثات پیش آجاتے ہیں لیکن بہت سے مرد شادی کے بعد بھی اسے اپنی عادت بنائے رکھتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ سچی رفاقت ذہنی اور جسمانی یک جہتی اور ایمان داری کا نام ہے اس کے بغیر زندگی میں سکون نہیں ملتا۔" اسد دھیرے سے کچھ بڑبڑایا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اسد کو زیادہ پریشان نہ کرنے کی خاطر شاید امجد نے موضوع بدل دیا، بولے۔

"اب تو جلد ہی بوبی کو کوئی بھائی یا بہن کھیلنے کے لیے مل جائے گا۔"

"جی نہیں۔" اسد نے کہا، "میں چاہتا ہوں کہ بوبی اتنا بڑا ہوجائے کہ اپنی دیکھ

Marfat.com

بھال کر سکے۔ صبی اپنے بچے کے آگے بوبی کی اتنی دیکھ بھال نہ کر سکیں گی اور نہ جانے کیوں میں بوبی کو neglected دیکھنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔"

"مگر تمھیں یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ تنہا بچے کی تربیت بہت مشکل ہوتی ہے۔ بغیر کسی ساتھی کے وہ عموماً ضدی، خودسر اور اکل کھرے ہوجاتے ہیں، میرا خیال تو یہ ہے کہ دو بچوں کی عمر میں ہمیشہ کم فرق ہونا چاہیے تاکہ وہ تنہائی محسوس نہ کریں..."

"آپ کے کتنے بچے ہیں؟" یکایک اسد نے پوچھا۔ ظاہر ہے امجد کو یوں بے تحاشا نصیحتیں کرتے دیکھ کر اس کا خیال ان کی اولاد کی طرف گیا ہوگا۔ میرا خیال تھا کہ امجد ایک زوردار قہقہہ لگا کر "سیون تھیوریز نو چائلڈ" کا لطیفہ سنائیں گے مگر تھوڑی دیر خاموشی کے بعد وہ بڑی سنجیدگی سے بولے، "افسوس ہم اس نعمت سے محروم ہیں۔ تمھیں کبھی اندازہ نہیں ہوگا کہ عورتوں کو بچوں کا کس قدر شوق ہوتا ہے۔ جب شمسہ کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ ماں نہیں بن سکتی تو اس کا دکھ اتنا گہرا اور ناقابلِ برداشت نظر آتا تھا... وہ مجھ سے چھپاتی تھی اور میں اس سے۔ ہم دونوں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ہمیں ایک دوسرے کی رفاقت ہی بس ہے لیکن دل میں ہم دونوں ہی پریشان تھے۔ بعد میں، میں نے سوچا کہ صرف سیاحت ہی ہمارے درد کا مداوا ہوسکتی ہے۔ جگہ جگہ گھوم پھر کر، نئی نئی چیزیں دیکھ کر اور ان کے متعلق لکھ کر ہم اس غم کو بھول جاتے ہیں مگر کبھی کبھی رات کی تنہائی میں گھنٹوں میں شمسہ کے متعلق سوچ کر کڑھتا ہوں۔ اس عورت کو کیا محسوس ہوتا ہوگا جس کی مامتا کا سوتا پھوٹنے سے پہلے ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خشک ہوگیا۔ سچ کہتا ہوں، بعض دفعہ یہ سوچ کر میرے آنسو بھی نکل آتے ہیں۔ میں یہ کہنے میں شرمندگی محسوس نہیں کرتا، آنسو ہمیشہ کسی بلند تر جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کیوں اسد؟"

"جی؟... جی ہاں!" اسد کی کسی قدر گھبرائی ہوئی آواز آئی جیسے وہ کچھ اور سوچ رہا تھا اور امجد نے اسے ایک دم چونکا دیا ہو...

رات کے سناٹے میں امجد کی یہ باتیں میرے دل کو اتھل پتھل کرنے لگیں۔ میں نے کبھی اندازہ نہیں کیا تھا کہ امجد کو میرے درد کا اتنا احساس ہے۔

دو آنسو چپکے سے میری آنکھوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہوگئے مگر میں اسی طرح دم سادھے پڑی رہی۔

''اس سیاحت میں تو بڑا روپیہ خرچ ہوتا ہوگا۔ آپ اس کا بندوبست کیسے کرتے ہیں؟'' اسد نے موضوع بدل دیا۔

''مجھے ابا کی جائیداد سے بھی حصہ ملا ہے۔ تھوڑی بہت زمین بھی ہے، ہم نے ایک خاصا حصہ بڑھاپے کے لیے الگ کر رکھا ہے اور باقی سیر و سیاحت کی نذر کر دیتے ہیں۔ کبھی اس میں کمی آجاتی ہے تو ہم دونوں تھوڑے دن کے لیے کوئی کام کر لیتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں ایسے بہت مواقع مل جاتے ہیں، اس سے ہم زندگی سے نزدیک تر رہتے ہیں۔ تجربہ بھی حاصل ہوتا ہے اور روپیہ بھی۔''

''اور آپ لوگ افسانے بھی تو لکھتے ہیں۔'' اسد نے کہا۔

''ہمارے ملک میں لکھنے لکھانے سے کچھ نہیں ملتا۔ یہ ایسی ہابی ہے جو ہمیں سے خرچ کرواتی ہے۔'' امجد نے کہا۔

''اچھا...اب میں چلوں گا، بہت دیر ہوگئی۔'' شاید اسد کھڑا ہوگیا۔

''بہتر...روہڑی میں ملاقات ہوگی۔'' امجد نے کہا۔

اسد چلا گیا...امجد نے کمرہ مقفل کیا اور لیٹ گئے۔ میں کچھ دیر اسد کی سنائی ہوئی کہانی میں کھوئی رہی، پھر نہ جانے کب اونگھ آگئی۔ دوبارہ جب امجد نے مجھے اٹھایا تو روہڑی آچکا تھا۔ گاڑی ایک گھنٹا لیٹ تھی۔ آدھی رات ہونے کے باوجود اسٹیشن پر چہل پہل تھی۔ پلیٹ فارم کے پل پر بہت سے لوگ چڑھ اتر رہے تھے۔ چائے کے اسٹالوں پر چائے کے دور چل رہے تھے۔ ہم اسد کے کیبن میں پہنچے تو اس کا سامان اتر چکا تھا۔ بوبی کھوئی کھوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ پہلے سے بھی پیارا لگ رہا تھا۔ میں نے پہلے اسے پھر اسد کو غور سے دیکھا اور پھر ان دونوں کے آپس کے رشتے سے بے خبر صبا کو...اس کو اس وقت بخار نہیں تھا مگر نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ اترنے سے پہلے خاصی دیر تک الوداعی علیک سلیک کے بعد ایک دوسرے سے ملنے کے وعدے بھی کیے گئے۔ ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر اور بوبی کے گال پر باری باری پیار کرنے کے بعد ہم نے انھیں رخصت کر دیا۔

○○○

Marfat.com

۳

اب وہ بیگم اسد تھی اور برابر کے کمرے کے بجائے ہوٹل ''چمنستان'' کے اس کمرے میں آ گئی تھی، جہاں قدم رکھتے ہوئے بھی پہلے اس کا دل دھڑکا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بالکنی میں کھڑے ہوکر دل ہی دل میں اس تغیر پر اظہارِ حیرت کرتی اور پچھلی باتیں یاد کیا کرتی جب وہ اپنے بابا کے ساتھ برابر کے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی، سب کچھ وہی تھا مگر اس زندگی میں کیسا زبردست انقلاب آ گیا تھا۔ وہ صبا سے بیگم اسد اور ساتھ ہی بوبی کی ممی بن گئی تھی... ابھی ابھی بارش کے بعد موسم کھلا تھا۔ اودے اودے بادلوں اور خنک ہوا نے موسم کو بڑا خوش گوار بنا دیا تھا۔ کئی کمروں کے لوگ مل کر پکنک کے لیے جا رہے تھے۔ لڑکوں کی خوش رنگ بشرٹوں اور لڑکیوں کی رنگ برنگی اونچی اونچی ڈھیر سارے گھیر والی فراکوں نے بھی ایک سماں باندھ دیا تھا۔ بارش سے سرو کے درختوں میں لگی ہوئی بتیوں کے جھولے گر گئے تھے۔ جنھیں ہوٹل کے نوکر ٹھیک کرنے میں مصروف تھے۔ ہوٹل کی دیوار پر رکھے ہوئے نیلے، سرخ، پیلے اور سفید گول ہانڈیوں کی شکل کے خوب صورت گملے اور ان میں لگے ہوئے پودے نکھر آئے تھے اور پیچھے کوارٹروں میں اونچے اونچے تہمند اور پجاموں میں، کندھوں پر تولیہ ڈالے مرد اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ننگ دھڑنگ سیاہ فام بچے جگہ جگہ بھرے ہوئے پانی میں چھپا چھپ مچا رہے تھے اور عورتیں سیلی ہوئی لکڑیاں پھونک پھونک ان لکڑیوں کی طرح آہستہ آہستہ سلگ رہی تھیں۔ کوارٹروں کے پاس پڑا ہوا کوڑے کا انبار شاید اپنی اہمیت جتانے کو بارش سے پسر کر پھیل گیا تھا اور بدبو دے اُٹھا تھا۔ ابھی ابھی ہوٹل کا منیجر اور کلرک اس کے معائنے کے لیے گئے تھے۔ کیوں کہ دس سال سے یہاں

Marfat.com

رہنے والی بدیسی بیگم کا داماد میڈیکل کور میں ہے۔ اگر اے ڈی ایم ایس نے آ کر ایسی ویسی رپورٹ دے دی تو عرصہ دو سال میں دو لمبی لمبی کاریں مہیا کرنے والا ٹھیکا خطرے میں پڑ جانے کا زبردست اندیشہ ہے۔

بیگم گراموفون اودی ساری میں اودی گھٹا کی طرح سارے لان میں چھا رہی تھیں۔ آج اسد اور صبا کو واپس ''چمنستان'' ہوٹل آئے کئی ماہ ہو چکے تھے مگر بیگم گراموفون اب تک یہیں موجود تھیں۔ اس عرصے میں وہ ایک شان دار پارٹی اپنے دوستوں کو دے چکے تھے اور بیگم گراموفون کئی دفعہ صبا سے اس کے جہیز کے بارے میں یوں کرید کرید کر پوچھ چکی تھیں گویا جہیز کی ساری چیزیں ایک سرے سے چوری کی ہوں اور انھیں ان کی تفتیش پر مامور کیا گیا ہو۔ جہیز کی فہرست سے وہ کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھیں۔ کپڑے اور زیور ان کے نزدیک ہلکے تھے، فرنیچر اور دیگر سامان غائب، صرف ایک عدد پرچی پر (جس کا نام لوگوں نے چیک رکھ دیا ہے) پچاس ساٹھ ہزار یا ایک لاکھ روپیہ لکھ دینے سے کوئی جہیز والی بات تھوڑی آ جاتی ہے۔ صبا نے انھیں لاکھ سمجھایا کہ زیور اور بھاری کپڑے وہ پہنتی نہیں۔ فرنیچر اور دیگر فضولیات کے لیے ابھی کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں مگر وہ اپنی اس ناامیدی پر کسی طرح قابو نہ پا سکیں کہ ''اتنے بڑے آدمی'' نے اپنی اکلوتی بیٹی کو ان کے حسبِ منشا سامان نہ دیا۔ اس ناامیدی میں میڈم ڈبل روٹی بھی برابر کی شریک تھیں مگر اب وہ جا چکی تھیں۔ اس لیے ان کی طرف سے مزید پریشانی کا امکان نہ تھا۔ صبا نے سنا تھا کہ اس کے چلے جانے کے بعد ان دونوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو جانے پر بات چیت بند ہو گئی تھی اور دن خاصے بے کیف ہو گئے تھے، اس لیے چلتے چلتے اپنا موڈ بنانے کے لیے ایک زبردست لڑائی چھیڑی گئی جس میں ایک دوسرے کے بخیے سرِ عام ادھیڑے گئے۔ بیگم گراموفون نے بڑے وثوق سے بتایا کہ میڈم ڈبل روٹی کے گھر والے امرتسر میں جوتے بنایا کرتے تھے اور جواباً میڈم ڈبل روٹی نے انکشاف کیا کہ بیگم گراموفون کا خاندان آج بھی لاہور کے شاہ عالمی دروازے میں بڑھئی کا کام کرتا ہے (جیسے وہ ابھی دیکھ کر آ رہی ہوں اور بھی جو چاہے ابھی جا کر اطمینان کر لے)۔ اس بات نے جب مزاجوں کی آنچ کو ہوا دی تو میڈم ڈبل روٹی نے مزید انکشاف کیا کہ بیگم گراموفون کے میاں امریکا میں کالی عورتوں کے پیچھے پھرتے تھے، چھی چھی... اور بیگم گراموفون نے بتایا کہ وہ بھی ان کے میاں

Marfat.com

کے سارے خفیہ رازوں سے واقف ہیں۔ اس کے بعد اور اس سے پہلے کہ خاندان اور شوہروں کے بعد وہ ایک دوسرے کے بھید کا آنکھوں دیکھا حال بیان کریں، آپس میں بیچ بچاؤ کرا دیا گیا۔ میڈم ڈبل روٹی تو اپنے سامان کا چھکڑا روانہ کر کے ٹیکسی میں بیٹھ کر چمنستان کو خیر باد کہہ گئیں مگر گراموفون آج تک بھرے ہوئے ریکارڈ کی طرح میڈم ڈبل روٹی کی تعریف میں بجتی نظر آتی تھیں، یہاں تک کہ صبا یہ قصے سن سن کر سر سے پیر تک اوبھ گئی تھی۔ اب بھی کئی مرتبہ اس کا دل چاہا کہ نیچے جا کر اس موسم کا لطف اٹھائے مگر بیگم گراموفون کے خوف سے ہمت نہیں پڑی۔ اسی وقت دھوبی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اس کے ''آجاؤ'' کہنے پر اندر آ گیا۔ وہ میلی پھٹی ہوئی دھوتی اور سفید کرتا پہنے ہوئے تھا اور اس کے چہرے پر خلافِ معمول آج پٹے ہوئے کتے ایسی قابلِ رحم کیفیت تھی، کپڑے لے کر منہ ہی منہ میں بدبداتے ہوئے اس نے کہا، ''آج شاید استری کے کپڑے نہ دے سکوں، مرے ہوئے بچے کا بندوبست کرنا ہے۔''

''مرا ہوا بچہ کس کا؟'' صبا نے حیرت سے پوچھا۔

''میرا... رات کو پیدا ہوا تھا۔''

''اچھا...'' وہ حیران سی رہ گئی۔ اسے آج تک یہ معلوم نہیں تھا کہ دھوبی کی چھوٹی سی فیملی میں اضافہ ہونے والا ہے۔

''بچہ کب مرا؟''

''مرا ہوا ہی پیدا ہوا تھا۔'' دھوبی نے کہا۔

''تمھاری بیوی تو ٹھیک ہے۔''

''جی وہ تو ٹھیک ہے۔''

صبا نے اسے تنخواہ کے پیسے دیے اور کہا کہ آج وہ کپڑے نہ لے جائے۔ وہ کپڑوں کی گٹھڑی وہیں چھوڑ کر خاموشی سے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹہلتی ٹہلتی کوارٹروں کی طرف چلی گئی۔ دھوبی کے گھر کے آگے کھری چارپائی پر دو چار بڑھیاں بیٹھی سوں سوں ناکیں پونچھ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ سب کی سب گھبرا گئیں۔ ایک بڑی بی نے اسے مزاج پرسی کی مہلت دیے بغیر کہنا شروع کر دیا، ''ہماری کسمت کھراب تھی۔ بیگم صاب پہلوٹی کا لڑکا مرا ہویا پیدا ہویا۔'' دھوبی سر جھکائے زمین پر بیٹھا تھا۔

Marfat.com

''تمھاری بیوی اندر ہے... اسے دیکھ لوں؟'' وہ گھبرا کر بولی۔

''دیکھ لو صاب... آپ کی مہربانی ہے صاب...'' دھوبی بھی آج اس معجزے سے چکرایا ہوا تھا کہ بیگم صاحبہ یہاں آئیں تو کیسے۔

صبا لٹھے کی چادر جو دروازے پر بہ طور پردہ پڑی ہوئی تھی اور ضرور کسی کی دھلائی کی تھی، اٹھا کر اندر چلی گئی۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ایک چارپائی لمبائی میں اور ایک چوڑائی میں بچھی ہوئی تھی۔ ایک پرانی سی بے رنگ و روغن میز پر جو استری کے کام میں آتی ہوگی۔ مٹی پتی انگیٹھی میں راکھ کے نیچے دبے کوئلے آخری سانس لے رہے تھے۔ ان سب چیزوں کے بعد کمرے میں اتنی کم جگہ تھی کہ بہ مشکل دو آدمی کھڑے ہو سکتے تھے۔ ایک چارپائی پر سرخ رنگ کی چھینٹ کی میلی سی رضائی اوڑھے دھوبن لیٹی تھی، اس نے آہٹ پر چونک کر آنکھیں کھولیں۔ چند ثانیے جیسے وہ حیرت سے تکتی رہی پھر آہستہ سے ہاتھ اٹھا کر سلام علیکم قسم کا کوئی لفظ بہ مشکل اس کی زبان سے نکلا اور مارے نقاہت کے اس کی آنکھیں مند گئیں۔ اس کی سانولی جلد کے نیچے سرسوں کے پھولوں کی زردی بچھی ہوئی تھی۔ اس کے پائینتی رضائی کے اوپر موٹی، پکے ہوئے رنگ کی ایک چٹاخ پٹاخ عورت بیٹھی تھی جو روانی سے کچھ بولے جا رہی تھی۔ صبا کو دیکھ کر اس عورت نے اشارہ کیا اور کہا، ''ادھر نکل آؤ۔'' وہ اس ماحول میں کچھ حیران و پریشان سی کھڑی تھی۔ دوسری چارپائی پر، میز پر اور چارپائی کے نیچے کپڑوں کے بڑے بڑے گٹھڑ جھانک رہے تھے، اس کے ساتھ دو تین اور بھی عورتیں اندر چلی آئی تھیں اور اس کا دم الٹ رہا تھا۔ دائی نے دوبارہ للکار کر کہا، ''اس طرف آجاؤ نا۔'' تو وہ ناچار انگیٹھی سے دامن بچاتی دوسری چارپائی تک چلی گئی مگر بیٹھی نہیں۔

''یہ تو ٹھیک ہے؟'' صبا نے سرخ رضائی کے تلے دبے ہوئے سرسوں کے پھولوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

''خدا کا فضل ہے۔'' جہاں دیدہ دائی نے منھ چلاتے ہوئے کہا۔

''عین وقت پر مجھ کو بلا لیا ان لوگوں نے، ورنہ جانے کیا ہوتا۔ خیر زندگی تھی، بڑا بے ڈھب کیس تھا۔ تم جانو میں نے تو بہت دن ہوئے یہ گندا کام چھوڑ دیا۔ پانچوں وقت کی نماز اور ڈیڑھ سو دانے تسبیح کے روز پڑھوں ہوں۔ پر یہ اپنی طرف کے لوگ ہیں، زبردستی کھینچ لائے ہیں تو منع بھی کیسے کروں۔''

Marfat.com

''مگر بچہ تو...'' ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ دائی نے اپنے پچپن سالہ تجربے اور خرانٹ پن کے ساتھ رات کا واقعہ کچھ ایسے گنجلک انداز اور الفاظ میں سنایا کہ ایک لفظ اس کے پلے نہ پڑا، سوائے اس کے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ دوسری عورتوں نے بھی اس کی تصدیق کی اور بتایا کہ بڑی تجربہ کار دائی انھیں قسمت سے میسر آ گئی۔ صبا ان سب باتوں کو چپ سادھے سنتی رہی، وہ مارے ہم دردی کے آ تو گئی تھی مگر کہنے سننے کو کچھ نہیں مل رہا تھا۔ یکایک ایک عورت نے انگیٹھی کے پاس پڑی ہوئی پیڑھی پر پڑا ہوا، ایک کپڑے کا پلو اٹھایا تو اس نے دیکھا کہ میدے کی طرح سفید ریشمی سا ایک بچہ مٹھیاں بھینچے، آنکھیں موندے پڑا ہے۔ عورت نے کپڑا ڈھانک دیا اور وہ بغیر ایک لفظ کہے کوارٹر سے نکل آئی اور دھوبی سے یہ کہہ کر کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلاتامل کہہ دے، وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اتفاق سے اسے کسی نے آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی، دھوبی کو اس بچے کے مرنے کا غم تو ضرور ہوگا۔ سات سال کی لڑکی کے اوپر یہ پیدا ہوا تھا۔ ان لوگوں میں تو لڑکے کی خواہش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ نامعلوم یہ بچہ اتنے سال بعد کیوں ہوا، ورنہ کوارٹروں میں تو یہاں سے وہاں تک بچوں کی بھرمار تھی، صرف دو مہتروں کی فیملی ملا کر ایک کرکٹ ٹیم بنتی تھی۔ کوارٹروں کے سارے بچے ملا کر تو آسانی سے ایک پلٹن تیار ہو سکتی تھی۔ برکت مسیح کے بچے تو اپنی عادات و اطوار اور شکل و صورت کے لحاظ سے اتنے متنوع تھے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ کسی کی آنکھیں نیلی، بال بھورے اور گورا چٹا ہے تو کوئی کالا بھجنگ، چپٹی ناک اور چیاں سی آنکھوں کا مالک ہے۔ ان سب کے نام بھی اسی طرح مختلف زبانوں اور مذہبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑا بچہ ناصر مسیح تو چھوٹا جان البرٹ، ایک لڑکی کا نام حمیدہ بیگم ہے تو دوسری کا نام ایلزبتھ، سب سے چھوٹا بچہ جو کوے کی طرح کالا اور مینڈک کی طرح بدصورت اور بہت کچھ برکت مسیح سے ملتا تھا، ٹامس تھا جسے ماں نامعلوم پیار یا غصے سے ٹھوس کہا کرتی تھی۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ جو بچے گورے چٹے تھے وہ اکثر بابا لوگوں کے پھوسڑے نکلے رامپر سوٹ یا جینز میں پائے جاتے تھے۔ منھ بھی دھلا دھلایا رہتا تھا۔ بال تیل میں چپڑے ہوئے اور کنگھی چوٹی سے درست اور جو بے چارے سیاہ فام تھے، وہ ملیشیا کے اوٹنگے نکروں اور گریباں کھلی قمیصوں میں پھرتے تھے۔ ان کے توے ایسے رنگ پر ڈھیر سا کاجل لگی سفید سفید آنکھیں

Marfat.com

عجب بے بسی سے جھانکتیں جیسے پوچھ رہی ہوں، سگے بہن بھائیوں میں یہ فرق کیوں؟...

ابھی اس کے خیالات کا دھارا کوارٹر میں رہنے والوں میں ہی بھٹک رہا تھا کہ دفعتاً ادھر سے چیخ و پکار اور بین کرنے کی آواز آئی۔ اس نے سوچا کہ شاید بچے کو دفنانے لے جارہے ہیں مگر پچھلی کھڑکی سے جھانکا تو جنازے کا سا ڈسپلن کہیں نہیں تھا۔ صرف عورتیں اور لڑکیاں مختلف کونوں میں منھ دیے رو رہی تھیں۔ وہ نیچے اتری، اسی وقت کوارٹروں کی طرف سے آتے ہوئے ایک بیرے نے بتایا کہ دھوبی کی بیوی مرگئی ہے۔

''مرگئی ہے؟'' یہ آواز سنتے ہی اس کے دل کو کچھ ہونے لگا اور وہ تیزی سے کوارٹروں کی طرف چلی۔ دھوبی کی بیوی زندہ تھی مگر اس کے ہاتھ پاؤں یخ ہورہے تھے۔ ایک بوڑھی عورت اس کے سرہانے بیٹھی ناک پر ہاتھ رکھے بھاپ پہنچانے کی کوشش میں بار بار نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ صبا نے دھوبن کے کپکپاتے ہونٹ دیکھے اور زندگی کی رمق دیکھ کر وہ الٹے پاؤں بھاگی۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے اس نے ڈاکٹر صاحب کا دروازہ کھٹکھٹا دیا جو چند دن پہلے آئے تھے۔ خیال تھا کہ بیوی کو سارا قصہ سنا کر کہے گی کہ وہ اپنے میاں کو ایک نظر دھوبن کو دیکھ لینے پر راضی کرلیں، نزدیک کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں تھی۔ ڈیڑھ گھنٹا ہوا دھوبی کسی مسیحا نفس کی تلاش میں نکلا تھا مگر اب تک نہ لوٹا تھا۔ صبا کی امید کے خلاف نائٹ سوٹ میں ملبوس ڈاکٹر صاحب باہر نکلے اور اسے بتایا کہ بیگم شاپنگ کے لیے بازار گئی ہوئی ہیں۔

''مجھے دراصل... ان سے تو نہیں... آپ ہی سے کام ہے۔ میرا مطلب ہے کہ...'' صبا کو ہکلاتے، گلابی اور زرد پڑتے دیکھ کر انھوں نے ہمت افزائی کے طور پر کہا، ''میں حاضر ہوں... فرمایئے۔''

وہ دروازے سے ایک طرف کو بھی ہٹ گئے۔ گویا وہ اندر آنا چاہے تو کوئی مذائقہ نہیں مگر اس نے وہیں کھڑے کھڑے اکھڑی ہوئی سانسوں میں انھیں جو کچھ بتا سکی، بتا دیا۔ آخر میں وہ یوں صورتِ تصویر بنے کھڑے تھے گویا کہہ رہے ہوں۔ اس سب سے میرا کیا تعلق؟

''آپ ذرا چل کر اسے دیکھ لیجیے۔ وہ بالکل قریب المرگ ہے اتنی دیر میں اور تو کوئی نہیں آسکتا۔'' صبا نے مدعا بیان کیا۔

Marfat.com

''میں تو کچھ نہیں کرسکوں گا، اس کیس میں لیڈی ڈاکٹر کا ہونا ضروری ہے۔''
انھوں نے بڑی دل جمعی سے کہا۔

''پھر بھی... آپ کچھ تو بتا سکتے ہیں ناں... کم از کم یہی کہ ایسی حالت میں اس کو اسپتال لے جایا جاسکتا ہے یا نہیں...'' وہ رونکھی ہوگئی۔

آج ہی نہیں اسے ہمیشہ ڈاکٹروں کے سامنے زبردست احساسِ کم تری ہوجایا کرتا تھا۔ معمولی مرض ہو یا مرض الموت، ڈاکٹر ہمیشہ ہی مریضوں اور تیمار داروں کو انتہا کے احمق ہونے کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ گویا وہ کوئی اعلیٰ مخلوق ہیں، جیسے مارنے اور جلانے کا ادھ کچرا ہنر سیکھ کر انھوں نے واقعی خدائی سے ناتا جوڑ لیا ہے۔

''اچھا، چل کر دیکھ لوں گا۔'' مریضہ کی خاطر تو نہیں البتہ صبا کی بے بسی دیکھ کر وہ راضی ہوگئے اور جھٹ اندر گھس گئے۔ صبا اس خوش فہمی میں مبتلا رہی کہ شاید وہ اپنا بیگ اور ضروری دوائیں لینے گئے ہیں۔ ممکن ہے ڈریسنگ گاؤن بھی پہننا چاہتے ہوں۔ پندرہ بیس منٹ تک وہ باہر برآمدے میں بے چینی سے ٹہلتی رہی پھر اس کے کمرے کے آگے کھڑے رہنا مناسب نہ سمجھ کر وہ لان میں چلی آئی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ نکلے تو ان کا چہرہ صاف شفاف تھا، سوٹ پہن رکھا تھا، کریم کی لپٹیں اور جمے ہوئے بال پورے میک اپ کا پتا دے رہے تھے مگر ان کے ہاتھ خالی تھے صبا آگے آگے اور ڈاکٹر صاحب پیچھے پیچھے کوارٹر تک آئے۔ روتی ہوئی عورتوں کو نظر انداز کر کے وہ انھیں کوارٹر میں لے گئی لیکن دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ اب سب کچھ ختم ہوچکا ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر دس منٹ تک اس کی نبض ٹٹولتے رہے۔ ماچس منگا کر آنکھوں کی روشنی دیکھی اور... ''یہ تو کب کی مرچکی ہے'' کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے کمرے کی طرف لوٹ گئے۔ وہ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لیے سرخ رضائی کے نیچے سوئی ہوئی بے حس دھوبن کو دیکھ رہی تھی، ان آنکھوں کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی تھیں۔ صبح والی دائی کا کہیں پتا نہیں تھا اور اب پہلی مرتبہ عورتیں اسے بتا رہی تھیں کہ کیس نارمل نہیں تھا اور خون بند نہ ہونے کی وجہ سے اس کا مرنا یقینی تھا اور یہ کہ سب خدا کی طرف سے تھا۔ وہ حیران تھی کہ یہ لوگ کس طرح ہر چیز کو خدا کی طرف سے سمجھ کر آسانی سے قبول کر لیتے ہیں، چاہے وہ صاف لاپروائی کے سبب آنے والی موت ہی کیوں نہ ہو۔ انھیں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ بروقت

Marfat.com

اسے اسپتال میں داخل کردیا جاتا تو وہ بچ جاتی۔ اگر اسے پوری طبی امداد مل جاتی تو یہ کیس اتنا خطرناک نہیں تھا۔ بڑے بڑے اسپتالوں میں اس قسم کی مریضاؤں کو دواؤں کے ذریعے یا خون دے کر بڑی آسانی سے بچایا جاسکتا ہے مگر وہ یہ باتیں نہیں جانتے کیوں کہ انھوں نے کبھی یہ چیزیں نہیں دیکھیں۔ انھوں نے صرف ڈاکٹروں کے نخرے اور فیسیں دیکھی ہیں۔ آخری وقت میں بلکہ اکثر بعد از وقت کئی کئی میل پیدل چل کر کسی ڈاکٹر کو لانا اور پھر یہ سوچ کر مطمئن ہوجانا کہ جو کچھ ہوا خدا کی طرف سے ہوا، مدتوں سے ان کی زندگی کا محور رہا ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتے اور نہ جاننا ہی ان کے لیے بہتر ہے۔ جب تک اتنے ڈاکٹر نہ ہوں کہ سب کو طبی امداد مل سکے۔ جب تک اسپتال کے چکنے فرش صاف اور ستھرے بستر انھیں مہیا نہ ہوسکیں یا جب تک وہ اس قابل نہ ہوسکیں کہ ڈاکٹر کو منھ مانگی فیس دے کر اپنا علاج کرائیں اور ہر مرض کے اسپیشلسٹ تک ان کی رسائی ہوسکے تب تک انھیں ایسی حقیقتوں سے لاعلم ہی رکھنا بہتر ہے، ان کے دل میں یہ خیال پیدا کرنا کہ ان کے آئے دن کے مرتے مریضوں کو نہایت آسانی سے بچایا جاسکتا تھا، انھیں سوائے احساسِ محرومی اور رنج کے کیا دے گا۔ مکمل اور بھرپور صبر اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان یہ سمجھ لے کہ جو کچھ ہوا، اس کی طاقت سے باہر تھا۔ وہ قادرِ مطلق کی طرف سے تھا جس میں چوں چراں کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر اس میں انسانی محرومی یا ناکامی کا تصور شامل ہو تو دل اور ضمیر کے کچوکے احساسِ غم کو دگنا کردیتے ہیں۔

باہر سے چیخ و پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ دھوبی بغیر ڈاکٹر کے یا کسی ٹٹ پونجیا قسم کے عطار کو لے کر واپس آگیا تھا اور چلا چلا کر رو رہا تھا۔

''اے ری مجھے بھی اپنے ساتھ لے جا۔ اے ری تو مجھے کیوں چھوڑ گئی۔ ماں ری مجھے زہر دے دو۔ میں بھی اس کے ساتھ جاؤں گا۔'' اور وہ سوچ رہی تھی، یہ عورتیں کتنی خاموشی سے مرجاتی ہیں... بغیر ایک لفظ کہے، یہ زندہ بھی اسی طرح رہتی ہیں۔ یہی دھوبی اسے دن رات، اے ری بڑی لاٹ صاحب کی بچی ہے چل استری کر، قسم کے جملوں سے نوازتا تھا، تب بھی وہ خاموش رہتی تھی، جب وہ اسے کپڑوں کی طرح دھما دھم کوٹتا تھا، تب بھی اس کے دل سے اپنے مرجھلے میاں کی محبت میل کی طرح کٹ نہ جاتی تھی۔

آخر زیادہ دیر اندر کھڑا رہنا فضول سمجھ کر وہ باہر نکل آئی۔ دھوبی کی ماں عجیب

Marfat.com

یکساں بناوٹی انداز میں بین کر رہی تھی، ''اے ہے میرا تو پہلونٹھی کا پوتا مویا ہویا رے...
اے سات سال بعد بھی میرے ارمان تو پورے نہ ہوئے رے۔'' تب ایک دم صبا کا دل
بیزار سا ہوگیا۔ اتنی خاموشی سے مرجانے والی عورت کے لیے یہ شور کتنا بے ہنگم تھا... دل
چاہا اس عورت کی گردن پکڑ کر کہے تو اس پہلونٹھی کے لڑکے کا ماتم کر رہی ہے جس نے
دنیا میں آن کر آنکھ بھی نہیں کھولی، تجھے اس جواں سال بہو کا کوئی غم نہیں جو تیرے بیٹے
کے گھر کا چراغ تھی۔ جس کے دم سے اس چولھے میں آگ جلتی تھی جس کے بھاری بھرکم
جسم کے سہارے اس نے اتنے گھروں کا کام لے رکھا تھا۔ جو کل رات نو بجے تک کھڑی
ڈھیر سارے کپڑوں پر استری کرتی رہی۔ اس ہستی کا بھی ماتم کر جو تیرے بیٹے کو گرما گرم
روٹی دیتی تھی اور بدلے میں اس کی گرما گرم جوتیاں کھاتی تھی مگر وہ بڑھیا زمین پر اکڑوں
بیٹھی، اسی مونوٹونس انداز میں بین کرتی رہی کیوں کہ وہ اس دیس اور اس معاشرے کی پیدا
کردہ عورت تھی جہاں مرا ہوا لڑکا جواں سال لڑکی سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا۔ صبا کسی کو
بغیر ایک لفظ تسلی کا کہے صرف دھوبی کی سات سالہ لڑکی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر
چلی آئی۔ اس وقت بیگم گراموفون اپنی نئی سہیلی مسز جنید کے ساتھ باہر بیٹھی تھیں اور اس کو
کوارٹروں کی طرف سے آتا دیکھ کر بڑے پرمعنی انداز میں مسکرائی تھیں۔ اس وقت ان کی
مسکراہٹ کی صفائی پیش کرنے کی اس میں قطعی ہمت نہیں تھی۔ اس کا دل زور زور سے
دھڑک رہا تھا، ہاتھ کانپ رہے تھے۔ تصور میں سفید ریشمی آنکھیں مندا بچہ اور سرمئی جلد
کے نیچے سرسوں کے پھولوں کی زردی یوں رچ گئی تھی کہ قدم اٹھاتے ڈر لگتا تھا جیسے وہ ان
میں سے کسی چیز کو روند دے گی۔

برآمدے میں پڑی کرسی پر سکون سے ٹیک لگا کر وہ بیٹھ گئی اور آنکھوں سے
موٹے موٹے آنسو نکل کر کپڑوں میں جذب ہوتے رہے۔ تب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ
اپنے زیرِ سایہ رہنے والوں سے اتنی بیگانہ نہیں رہے گی۔ حد ہے کہ اتنی نزدیک ہونے والی
باتوں سے وہ بے خبر ہے۔ بیرے، مالی اور دھوبی انھیں یہ باتیں بتاتے ہوئے ڈرتے
ہیں۔ بھلا صاحب لوگوں کو ایسی باتوں سے کیا واسطہ؟ اگر دھوبی یا موٹی دائی اسے جلد
صورتِ حالات سے آگاہ کر دیتے تو وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرسکتی۔ انسے اس کم بخت دائی پر
غصہ آنے لگا جو اپنی قابلیت جتانے کے شوق میں مریضہ کی اصل حالت چھپاتی رہی اور

Marfat.com

اسے قبر کے آخری کونے تک پہنچا کر دم لیا اور دھوبی... اسے یہ اندازہ کیوں نہیں کہ صاحب اور بیگم صاحبہ بھی انسان ہیں اور وقت پڑنے پر کسی کے کام آسکتے ہیں۔ اگر وہ رات ہی کو آگیا ہوتا تو وہ اسے کار میں اسپتال لے جاتی اور اس طرح شاید اس کی جان بچ جاتی مگر وہ صاحب لوگوں پر بھروسا نہیں کرتے اور اس میں قصور سراسر ہمارا ہے۔ انھیں یہ احساس دلانا ہمارا فرض ہے کہ کبھی وہ ہم سے مدد کے لیے رجوع کریں گے تو مایوس نہیں ہوں گے۔ شام تک اس کی طبیعت بیزار رہی۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ دھوبی کے گھر سے گریہ و زاری کی آوازیں ہوا کے دوش پر سوار آتی، یوں معلوم ہو رہی تھیں جیسے دور کہیں کسی پرانے تھرڈ کلاس ریڈیو پر ریکارڈ بج رہے ہوں۔

OOO

Marfat.com

۴

صبا کو دن بھر ایک لمحے کے لیے بھی یاد نہیں آیا کہ آج انھیں ریڈ کراس کے لیے منعقدہ مینا بازار میں کلب جانا ہے جہاں پورے شہر کے سارے قابلِ قدر لوگوں کے علاوہ لاہور سے آئے ہوئے وہ فلمی ستارے بھی ہوں گے جو انھیں کے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور جن کے دیدار کے لیے ایک صبح سے ہوٹل میں کارواں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ بیگم گراموفون کی نئی سہیلی بیگم جنید کئی دن سے تنبولا میں سو روپے کی سنوبال کے نام سے ہی ریشہ خطمی ہو رہی تھیں اور ہر ایک کو رائے دے رہی تھیں کہ اس سنہری موقعے کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

شام کو جب تیار ہونے سے پہلے اسد نے اپنے کپڑوں پر استری نہ دیکھی تو اس کا موڈ ایک دم خراب ہوگیا۔ صبا نے استری لگا کر سوٹ پر استری کی اور خود دل نہ چاہنے کا عذر کر دیا۔ اسد نے ایک گہری نگاہ سے اسے دیکھا اور خاموش ہوگیا۔ ان چند ماہ میں دل نہ چاہنے کا عذر خاصا پرانا ہوگیا تھا۔ اگر اس کا موڈ خراب نہ ہوتا تو شاید وہ اصرار اور خوشامد کے ختم ہوتے ذخیرے سے کھرچن نکال کر آزماتا مگر اب وہ خاموشی سے تیار ہوتا رہا اور آخر میں ''میں جا رہا ہوں'' کہہ کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

وہ کچھ دیر بوبی کے ساتھ قالین پر بیٹھی پرانے رسالوں سے تصویریں کاٹتی اور کاپی پر چپکاتی رہی، پھر چند حرف پڑھائے اور جب اس کی آنکھیں سرخ ہو کر مندنے لگیں تو اس کو سلا کر اپنے چاروں طرف مختلف کتابیں ڈھیر کر کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اسد جلد لوٹا تو آدھی رات کے بعد آئے گا۔ ابھی بہ مشکل آدھا گھنٹا گزرا ہوگا

Marfat.com

کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو روبینہ کھڑی تھی۔ آتشی رنگ کی نائلون کی ساڑھی، اسی رنگ کے جوتے، اسی رنگ کے بڑے بڑے ٹاپس کانوں میں، سیاہ بال اور سیاہ بلاؤز کی بیک گراؤنڈ میں خوب دمک رہے تھے۔ ناخنوں پر آتشی رنگ کی پالش تھی، بغل میں اسی رنگ کا پرس تھا۔ سیاہ لانبی بنائی ہوئی بھنوؤں اور آنکھوں کے سائے میں اس کے گال آگ کی طرح دہک رہے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آئی اِدھر اُدھر دیکھا بھالا، پھر بولی، ''ارے تم تیار نہیں ہوئیں ابھی تک؟''

صبا نے سنی اَن سنی کر کے کہا، ''اُفوہ! آج تو شعلہ بنی ہوئی ہو کس کو جلا کر خاک کرنے کا ارادہ ہے؟''

''چھوڑو...'' وہ ہنسی اور اتر کر بیڈ روم میں بڑھ کر قدِ آدم آئینے کے سامنے اپنے سراپے کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی، ''اللہ، تم دونوں نہیں چل رہے کیا بھئی۔''

''اسد جا چکے ہیں، میں نہیں گئی۔''

''تو یہاں پڑے پڑے کیا انڈے دے رہی ہو۔ بوبی بھی سو گیا چلو نا تم بھی۔''

صبا نے سوچا کہ آٹھ بجے سے رات کے پچھلے پہر تک تنہا پڑے رہنے سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔ اس نے لباس تبدیل کیا، ملازم لڑکے کو اندر بٹھایا اور دونوں ٹہلتی ہوئی کلب میں جا داخل ہوئیں۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف بار تھی جس پر رندانِ بلانوش کا جمگھٹا تھا۔ ایک موٹے سے سفید بالوں والے صاحب جو پہلے فوج میں میجر اور اب بیسک ڈیموکریٹ تھے، دھت بنے چلا چلا کر حالاتِ حاضرہ پر ایسی زبان میں تبصرہ کر رہے تھے کہ شاید آسمان کے تاروں نے بھی کانوں میں انگلیاں دے لی ہوں گی، اس پر یارانِ مے کدہ کے قہقہوں نے سوئے پنچھی بھی جگا دیے تھے۔ ان کا تماشا دیکھنے کے لیے لوگ باگ اور پلا رہے تھے۔ ہو سکتا ہے مفت کی پینے کے لیے ہی انھوں نے یہ ڈھونگ رچایا ہو۔ آگے بڑا سا شامیانہ تھا جس کے نیچے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آٹھ آٹھ دس دس کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ لیکن اس وقت قریب قریب تمام خالی تھیں۔ فرش پر یہاں سے وہاں تک مرغی کے نچے ہوئے پروں کی طرح تنبولا کے بے شمار ٹکٹ کئی راؤنڈ کھیلے جانے کا پتا دے رہے تھے۔ اس وقت سب لوگ ڈانس فلور کے چاروں طرف جمع تھے۔ فلور کے چاروں طرف اینٹوں کا بنایا ہوا اونچا سا جنگلا روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ بینڈ

Marfat.com

کا عملہ ایک طرف خاموش بیٹھا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت ڈانس نہیں ہو رہا۔ نزدیک پہنچ کر معلوم ہوا کہ کوئی چیز نیلام کی جا رہی ہے اور لوگ ریڈ کراس کے خیال سے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ اس وقت اس کی قیمت اسّی روپے تک پہنچ چکی تھی۔ صبا نے سنا تھا کہ چند ایک پینٹنگ اس مینا بازار میں نیلام کی جائیں گی مگر آگے بڑھ کر جب انھوں نے لوگوں کے درمیان سے دیکھنے کی کوشش کی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ نیلام کی جانے والی چیز پینٹنگ نہیں، وہسکی کی بوتل تھی۔ نیلام امریکن طریقے سے ہو رہی تھی۔ آخری بولی دینے والا شخص اپنی اور پہلی بولی کے فرق کا روپیہ نکال کر دیتا جاتا تھا۔ شہر کے معزز ترین اشخاص میں سے ایک صاحب بوتل ہاتھ میں لیے بے تحاشا اِدھر سے اُدھر دوڑ کر بولی کی رقم پکار پکار کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ تین چار صاحب لوگ چینی کے ڈونگے لیے تیار کھڑے تھے۔ تا کہ دوڑ کر روپے دینے والوں کی پذیرائی کر سکیں۔ فلور کے درمیان میں ایک چھوٹی سی ٹائم پیس رکھی تھی۔ ''جس وقت الارم بجے گا، اس وقت جس کی بولی ہوگی، بوتل اس کو مل جائے گی۔'' روبینہ نے صبا کو مطلع کیا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، جوش بڑھتا جا رہا تھا، لوگ جلدی جلدی بولی دے رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے رقم سو کے ہندسے کو پار کر گئی۔ اتفاق سے انھیں دو کرسیاں خالی مل گئیں۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد جب صبا نے اسد کو دیکھنے کی کوشش کی تو وہ ایک سو پانچ بولی لگا کر روپے جیب سے نکال رہا تھا۔ اس کے بعد بھی اس نے اسد کو کئی مرتبہ بولی لگاتے دیکھا۔ بہت سے غیرملکی مرد اور عورتیں بھی اس نیلام میں حصہ لے رہی تھیں لیکن زیادہ تعداد پاکستانی نوجوانوں کی تھی، جس میں نزدیک اسٹیٹ کے نواب کے بھائیوں نے سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ان بھائیوں اور ان کے دوستوں کی عمریں اٹھارہ سے بائیس کے درمیان تھیں۔

دفعتاً بولی کی رفتار غیرمعمولی تیز ہوگئی۔ لوگوں کی نظریں ٹائم پیس پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک بولی مشکل سے ختم ہوتی تھی کہ دوسری آواز آجاتی تھی۔ بوتل والے صاحب روک اینڈ رول کرتے ہوئے نظر آتے تھے، اسی تیزی سے روپیہ جمع کرنے والے چینی کے ڈونگے نوٹوں سے لبالب بھرے گردش کر رہے تھے۔ ابھی شمال میں، ابھی جنوب میں، ابھی یہاں، ابھی وہاں۔ پاکستانی آرٹسٹ بھی جو ایک طرف بیٹھے تھے۔ اب رقم ایک سو پچیس

تک جاچکی تھی۔ جو لوگ اس نیلام میں حصہ نہیں لے رہے تھے، ان کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ یہ چوتھی بوتل تھی اور ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا جارہا تھا۔ کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد یہ قصہ ختم ہو تو مہمان آرٹسٹوں کے گانے اور ناچ کی باری آئے۔ نیلام میں حصہ لینے والے ایسے مدہوش تھے گویا اس وہسکی کی بوتل کے علاوہ دنیا و مافیہا کو بھول چکے ہوں۔ ذرا سی دیر میں رقم دو سو تک جا پہنچی پھر دو سو تین تک۔ یکایک اسد کھڑا ہوکر چلایا ڈھائی سو اور جیسے گھڑی لفظ سو کا انتظار کر رہی تھی۔ ٹن، ٹن، ٹن الارم بج اٹھا۔ تالیاں بجنے لگیں، اسد نے جیب سے بیس روپے نکال کر دیے اور بوتل لینے کے لیے آگے بڑھا، صبا اپنی جگہ سے اٹھ کر اسی طرف چلی۔ اسد نے اسے حیران ہوکر دیکھا، بوتل والے صاحب اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''مبارک ہو جی، یہ لیجیے۔'' انھوں نے وہسکی کی بوتل صبا کو تھما دی۔

''شکریہ۔'' اس نے کہا۔ اسد اور وہ دونوں کرسیوں کی طرف پلٹے۔ یکایک وہسکی کی بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چکنے فرش پر گری اور ٹوٹ گئی۔ وہسکی صاف شفاف چکنے فرش پر بہنے لگی۔ شیشے کے ٹکڑے رنگین روشنیوں میں جگمگانے لگے اور وہسکی کی خوش بو کے ساتھ حاضرین میں ایک بے چینی سی پھیل گئی... ڈھائی سو روپے کی بوتل جس نے ان کا کتنا قیمتی وقت لیا تھا، اس کا یہ حشر...

''مجھے افسوس ہے۔'' صبا نے دھیرے سے کہا، مگر اسد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ بتا رہے تھے کہ اس کو غصے پر قابو پانے میں خاصی جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے۔ عورتوں میں چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کئی قسم کھانے کو تیار تھیں کہ صبا نے جان بوجھ کر بوتل توڑی تھی، باقی ثابت کر رہی تھیں کہ یہ محض اتفاق تھا۔ بیرا ایک بڑا سا جھاڑن لے آیا اور جگہ صاف کرنے لگا۔ اسد اس سے کٹ کر کسی اور طرف کو نکل گیا اور وہ بیوقوفوں کی طرح تنہا کھڑی رہ گئی۔ اب دوسری بوتل منظرِ عام پر آ گئی، بولی کی رفتار سست تھی اور نیلام ختم کرکے آرٹسٹوں کو موقع دینے کی واضح آوازیں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ صبا روبینہ کے پاس آئی اور اس سے چلنے کو کہا۔ روبینہ نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو، گانا سنے اور ناچ دیکھے بغیر آخر وہ کس طرح جا سکتی تھی۔

''اچھا تو میں جاتی ہوں۔'' صبا نے کہا۔ روبینہ نے سنی ان سنی کردی، صبا نے

Marfat.com

اپنی سیاہ قیمتی شال جس پر سنہرا کام ہوا تھا، شانے پر اچھی طرح لپیٹی اور چل کھڑی ہوئی۔
آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے اور پچھلی تاریخوں کا چاند سرد کے ایک طویل درخت کی عین سرو چوٹی پر ترازو بنا کر کھڑا تھا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے صبا نے دیکھا کہ اسد بار کے پاس کھڑا ہے مگر اسد نے اسے نہیں دیکھا... اس کا دل بوجھل تھا۔ دماغ میں جیسے لاوا ابل رہا تھا۔ صبح کے تجربے کے بعد اسے ریڈ کراس کے سلسلے میں ہونے والا یہ مینا بازار تماشا سا نظر آ رہا تھا۔ ایسا ڈھکوسلا جس میں لوگ صرف وہسکی اور تین سو روپے کی سنوبال اور سیما کا ناچ دیکھنے آتے ہیں اگر وہ اس کے بجائے صرف یہ دیکھ لیا کریں کہ ان کے پاس پڑوس میں کیا ہو رہا ہے تو شاید اس سے کہیں زیادہ مفید ہو... خدایا... یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ وہی ڈپریشن جس کو وہ کبھی کوئی نام نہ دے سکی۔ ہوٹل میں جانے کے بجائے وہ سیدھی ان مشہورِ زمانہ فقیر کے مزار پر چلی گئی... آج تک اس نے کبھی کسی مزار پر جا کر منت نہیں مانی تھی، دعا نہیں کی تھی... لیکن آج جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔

ان بزرگ کے مزار کے احاطے کے اندر چاروں طرف کئی کمرے اور غسل خانے تھے۔ بیچ صحن میں پکی قبر تھی جس کے چاروں طرف جمعرات کے دن اتنے دیے جلتے تھے کہ روشنی کا چوکھٹا سا بن جاتا تھا۔ ذرا اوپر قبر کی ہی لمبائی اور چوڑائی کے برابر بانس بندھے ہوئے تھے جن پر سرخ، سبز اور سفید کپڑوں کی دھجیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ بانس میں بندھی ہوئی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ اب مزید دھجیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ مزار کے اوپر لمبے لمبے بانسوں میں سفید اور سبز جھنڈے لگے ہوئے تھے جو دور سے اس زیارت کی نشان دہی کرتے تھے۔ مزار کے سرہانے کھڑے ہو کر اس نے عقیدت سے سر جھکا کر دل ہی دل میں کہا، ''اے بزرگ! تجھ سے لوگ اپنی مرادیں مانگتے ہیں، میں صرف ایک دعا مانگتی ہوں۔ اگر تو واقعی مانگنے والی چیز دے سکتا ہے تو مجھے... ہمت اور حوصلہ دے...''

بہت سے دیے بجھ چکے تھے، جو باقی تھے، وہ ہوا کے تیز جھونکوں سے لڑ جھگڑ کر ٹمٹما رہے تھے۔ ان کی روشنی مزار پر عجیب پراسرار سائے بنا رہی تھی۔ خاموشی سے وہ باہر نکل آئی۔

''اللہ کے نام پر کچھ دے دو بابا... سردی سے مر رہا ہوں۔'' ایک کپکپاتی آواز صبا کے قدموں کی آہٹ پا کر بلند ہوئی۔ پہلے تو صبا ڈر گئی، پھر حواس پر قابو پا کر اس نے

Marfat.com

اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک شخص چیتھڑے لگائے سکڑا ہوا کھمبے کا سہارا لیے بیٹھا تھا۔ اس کے ماتھے پر ایک بڑا سا سیاہ نشان چاند اور کھمبے کی روشنی میں بڑا بھیانک سا نظر آ رہا تھا۔ کتنا بیوقوف شخص ہے جو کسی دیوار کی آڑ میں بیٹھنے کے بجائے سڑک پر تیز ہوا کی زد میں بیٹھا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اسے اپنے اس خیال پر افسوس ہوا۔ یہ بیوقوفی نہیں ضرورت ہے۔ اتنا تو جانور بھی سمجھتے ہیں کہ کس جگہ انھیں زیادہ آرام ملے گا، یہ تو آدمی ہے اسے یہاں ہوا کی زد میں راہ گیروں کی چاپ کی تمنا نے بٹھایا ہے۔ داتا دیواروں کی اوٹ میں چھپے ہوئے فقیروں کو ڈھونڈتے نہیں پھرتے، ٹھوکروں میں آجانے والے فقیروں ہی کو کچھ مل جاتا ہے۔ کبھی دھتکار، کبھی پیسا... صبا کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ پرس لے کر نہیں نکلی تھی۔ اس وقت سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے ایک سوالی کے سوال کو ٹھکرا دینا اسے بہت برا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ بزرگ جن سے وہ ابھی ابھی دعا مانگ کر نکلی تھی، اس کا امتحان لے رہے ہوں۔ اس نے اپنی جہیز میں ملی ہوئی ڈھائی سو روپے کی قیمتی شال اتار کر فقیر کو دے دی۔ فقیر نے اسے حیرت سے دیکھا جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہو۔ پھر صبا کو جاتے دیکھ کر اس نے خود کو جلدی سے شال میں لپیٹا اور دعاؤں کا طومار باندھتا ہوا ایک طرف کو چلا گیا۔ اب وہ ایک باریک ساڑی اور بلاؤز میں تھی۔ ٹھنڈی ہوا اس کے ننگے بازوؤں میں گدگدی سی کر رہی تھی۔ اس نے ساری کے پلّو کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوٹل میں داخل ہوگئی۔ اس کا دل دھڑک دھڑک کر جیسے کہہ رہا تھا۔ خدایا مجھے ہمت اور حوصلہ دے۔ صبح پانچ بجے ٹیکسی کا ہارن بار بار اس کی کھڑکی کے نیچے چیخ رہا تھا۔ صبا کی آنکھ کھلی تو وہ جلدی سے ڈریسنگ گاؤن پہن کر بالکنی میں گئی کہ دیکھے کیا ماجرا ہے۔ ایک چھنکتی ہوئی آواز نے اسے پکارا، ''صبی ڈارلنگ، اپنے میاں کو سنبھالو'' وہ روبینہ تھی، ہونٹ بھینچ کر وہ جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگی... اسد اس وقت نشے میں دھت تھا۔

OOO

Marfat.com

۵

ہوٹل کے پیچھے کے علاقے یعنی کوارٹروں میں جنوں کا بطورِ خاص دخل تھا۔ مہتر ایک دن کمرے میں صفائی کر رہا تھا کہ اس کی بیوی دھاڑیں مار کر روتی ہوئی آئی۔ معلوم ہوا اس کی لڑکی روٹی پکاتے پکاتے دھڑام سے گری اور جب ہوش میں آئی تو عجیب و غریب باتیں کرنے لگی۔ اس کے دو دن بعد ہی بہشتی کی جوان لڑکی پر بھی جن آ گیا۔ نامعلوم وہ ایک ہی جن تھا جو سب پر آتا تھا یا جنوں کا پورا قافلہ اس بستی میں اتر آیا تھا۔ اس کے بعد تو آئے دن کنواری چھوڑ بیاہیوں پر بھی جن آنے لگے۔ جب جن آتے تو مٹھائی کھانے کو مانگتے، سب کو ناپاک قرار دے کر کسی کو اپنے نزدیک نہ بھٹکنے دیتے، صرف گیراج کے زیرِ سایہ بنی ہوئی مسجد کے ملا جی بہ ہزار دقت جن کو شیشے میں اتارتے لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں کیوں کہ پھر جب جنوں کا دل چاہتا، وہ وقت بے وقت آ دھمکتے۔ چند دن وہ صرف عورتوں کے سر پر مسلط رہے پھر ایک دن یکایک ہیڈ بیرے کے جوان لڑکے پر جو تانگا چلاتا تھا، جن آ گیا اور اس کے بعد تو اس نے وہاں مستقل بسیرا بنالیا۔ کبھی تانگا چلاتے چلاتے اس پر جن آ جاتا تو اسے اپنی کچھ سدھ بدھ نہ رہتی۔ رات کو کوئی جاننے والا اسے تانگے کو بے تحاشا بھگاتے دیکھ کر پکڑ کر لاتا۔ اس وقت وہ زور زور سے چلاتا، گردن ٹیڑھی ہو کر اکڑ جاتی، آنکھیں ابلنے لگتیں، ماں باپ بہ مشکل گھسیٹ گھساٹ کر اسے چارپائی پر ڈالتے۔ ایسے وقت کبھی اس کی جیب سے ایک پیسا بھی نہ نکلتا اور بعد میں بھی اسے کبھی یاد نہ آتا کہ اس نے دن بھر کی کمائی کیا کی۔ اس پر جو جن آتا، اس کو ایک دور دراز کے بزرگ سے بڑی عقیدت تھی۔ چناں چہ وہ ہمیشہ ان کے مزار کے مجاوروں اور وہاں کے

Marfat.com

بچوں میں بیس تیس روپے تقسیم کرنے کا حکم دیتا۔ ماں باپ اپنے اور بچوں کا پیٹ کاٹ کر یہ روپیہ فراہم کرتے جس کو وہ خود بہ نفسِ نفیس بانٹ کرآتا لیکن کچھ عرصے بعد جن صاحب کو پھر ماما اٹھتی اور وہ پھر آبراجتے۔

اب صبا اکثر بیگم گراموفون اور ان کی سہیلی کی مسکراہٹ کی پروا کیے بغیر ٹہلتی ٹہلتی کوارٹروں تک چلی جاتی اور وہاں کے حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتی۔ اب اسے ہمیشہ معلوم رہتا کہ کس فیملی میں اضافہ ہونے والا ہے۔ کس بچے نے کہاں سے گر کر اپنی ٹانگ توڑی ہے اور کون سا بچہ کس بیماری میں مبتلا ہے۔ اسے یہ بھی پوری طرح معلوم رہتا کہ کس عورت یا لڑکی پر کب جن آیا اور کب اترا۔ بلکہ رفتہ رفتہ اسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ہوٹل کے مالی کی بیوی پوری مادام بواری ہے جو اپنے میاں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے لیے لمبے لمبے پیتل کے بندے، سستی لپ اسٹک اور نیل پالش اور چتی پتی کلیوں والے ریشمی کپڑے مہیا کرتی ہے اور کوارٹر کی بعض سادہ دل عورتیں اس کے سائے سے بھی کتراتی ہیں، خصوصاً ہیڈ بیرے کی بیوی نے جو مرتے وقت اس کے منہ میں پانی بھی نہ ٹپکانے کا پکا ارادہ کرلیا ہے مگر وہ خود ہی ان غلیظ غیر فیشن ایبل عورتوں کو نہیں دھارتی۔ گنگا ری گنگا تو کیا لہرائے، میں پاؤں بھی تو ڈبوؤں! اسے یہ بھی معلوم تھا کہ پروپرائٹر کے ڈرائیور کی دونوں بیویاں چاندنی راتوں میں ایک دوسرے کی انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر چک پھیریاں کھاتی ہیں اور پھر کسی دن اتنا لڑتی ہیں کہ ایک دوسرے کے بال نوچ کھسوٹ کر لہولہان کردیتی ہیں۔ اسے برکت مسیح کے بچوں کے لال پیلے ہونے کی وجہ تو پہلے بھی معلوم تھی مگر اب معتبر ذرائع سے اس کی تصدیق ہوگئی تھی۔ دوسری مہترانی تو خود کہتی کہ میرے ''آدمی'' کو مرے ہوئے تو ایک زمانہ گزر گیا، یہ تو یوں ہی ''پرائیویٹ معاملہ'' ہے۔

پھر ایک دن بہشتی کی جوان لڑکی کو سخت پیچش ہوگئی۔ ماں کپڑے دھو دھو کر اور پھیلا پھیلا کر عاجز آگئی۔ اس نے خاص طور سے ''چوٹی والی بیگم صاحب'' یعنی صبا کو ساری بات تفصیل سے بتائی اور پیچش کی دوا بھی مانگی جو اتفاق سے اس کے پاس نہیں نکلی اور اس نے نوکر سے منگوا دینے کا وعدہ کیا مگر دوسرے دن ہی پولیس آموجود ہوئی۔ مالی کی بیوی ''بی بی'' نے جس پر ہیڈ بیرے کی بیوی ہمیشہ اپنی زبان دراز رکھتی تھی، ایک لمحے کو بھی اپنا

Marfat.com

منہ بند نہ کیا۔ خوب لے دے مچی، پروپرائٹر نے درمیان میں پڑ کر کسی طرح معاملہ ٹھنڈا کیا اور دو مہینے بعد جیداں کو جو ہلدی کی طرح زرد ہوگئی تھی، ماں نے کانسی اور تانبے کے برتن اور سستے پھول دار ریشمی کپڑے بنا کر ہیڈ بیرے کے تانگا چلانے والے لڑکے کے ساتھ بیاہ دیا مگر جن پھر بھی بہ دستور آتے اور جاتے رہے۔

کوارٹر میں وہ ''چوٹی والی بیگم صاحب'' کہلاتی تھی اور وہ سب لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے اور اکثر و بیش تر اس کی نصیحتوں پر عمل بھی کرتے تھے مگر جنوں کے خلاف ایک لفظ سننا بھی انھیں گوارا نہ تھا، ایک دن جب وہ عورتوں سے اسی موضوع پر بات کر رہی تھی ایک آیا کی چلبلی سی لڑکی بول اٹھی، ''ماں یہ ہوٹل اتنا پاس ہے پھر یہاں پر جن کیوں نہیں آتے۔ میں دیکھتی ہوں، شام کو ساری عورتیں سر کھولے پیڑ کے نیچے بیٹھی ہوتی ہیں اور کئی کی تو ٹانگیں بھی کھلی ہوتی ہیں۔'' اس پر کچھ عورتیں مسکرائیں اور ماں نے بے چاری لڑکی کو ڈانٹ دیا، ''چل چپ رہ، تو جب بات کرے گی الٹی۔''

''ہاں بات تو ٹھیک ہے، بتاؤ ہم لوگوں پر جن کیوں نہیں آتے؟'' صبا نے پوچھا۔

''جنوں کی مرضی... خدا کا حکم۔'' عورتوں نے کہا۔

''ہم لوگوں پر جن اس لیے نہیں آتے کہ ہم ان پر یقین نہیں رکھتے۔'' صبا نے کہا۔

''توبہ توبہ کرو جی...'' سب عورتیں اپنے کانوں پر ہاتھ لگانے لگیں۔ ''جن اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، قرآن شریف میں اس کا ذکر ہے۔''

''مگر یہ کہاں لکھا ہے کہ وہ آدمیوں کے سر پر چڑھ کر ناچتے ہیں اور مٹھائی کھانے کو مانگتے ہیں۔''

''توبہ کرو...'' عورتیں اپنے گالوں پر تھپڑ مارنے لگیں، ''برے وقت سے ڈرنا چاہیے، برا وقت آتے دیر نہیں لگتی۔'' صبا کو محسوس ہوا کہ وہ ان سب کی نظروں سے ایک دم گر گئی ہے۔ انگریزی پڑھ کر ایمان خراب کرنے والی بات ان کے نزدیک لفظ بہ لفظ صحیح ہو رہی تھی۔

''دیکھو، تم کسی دن اپنے لڑکے کے پیچھے کسی کو بھیجو اور دیکھو کہ وہ ان بیس تیس روپوں کا کیا کرتا ہے جو تم اسے دیتی ہو۔'' صبا نے تانگے والے کی ماں کو سمجھایا۔

''نہیں نہیں بیگم صاحب۔ میرا لڑکا ایسا ویسا نہیں ہے۔ دارو وہ نہیں پیتا، بیڑی

Marfat.com

وہ نہیں پیتا۔"

"سگریٹ پیتا ہے، میں نے خود کئی بار دیکھا ہے۔" وہ چلبلی بول اٹھی۔

"چپ رہ بدذات۔" ماں نے اسے پھر ڈانٹا۔

"وہ تو بہت غریب مسکین لڑکا ہے، وہ بیس تیس روپے کا کیا کرے گا۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا کہ روپے میں کتنے آنے ہوتے ہیں۔"

"تو پھر تانگے کی مزدوری کیسے لیتا ہے؟" صبا نے پوچھا۔

"بس جو کچھ کسی نے خوشی سے دے دیا، لے لیا۔"

"اوں..." لڑکی منہ بنا کر کچھ کہنے کو تھی کہ ماں کی خشمگیں نظروں سے ڈر کر خاموش ہوگئی۔

صبا بہت دیر تک ان کو سمجھاتی رہی کہ وہ ان فضول ڈھکوسلوں کو چھوڑیں مگر کسی نے اس کی بات کی طرف زیادہ توجہ نہ دی اور جب وہ واپس چلی گئی تو عورتوں میں یہ مسئلہ بڑی شدومد سے زیرِ بحث آیا کہ ہوٹل والیوں پر جن کیوں نہیں آتا۔

"اے ان کرستانوں، نجس عورتوں پر کیوں جن آنے لگے، بال کٹے ہوئے، ٹانگیں کھلی ہوئی، سینے کھلے ہوئے۔ برکت اللہ مارا کہہ رہا تھا کہ یہ ساری کی ساریاں پیاروں پیٹیاں پانی کے بجائے کاغذ استعمال کرتے ہیں۔"

"اللہ قسم!" عورتوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور پھر جو ہنسی کے فوارے چھوٹے تو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

"اے ہے، ان کی باتیں تو جب معلوم پڑیں جب سب بیروں کی باتیں چھپ کر سنو۔ وہ جو کونے والی میم ہے، اس کا میاں ایک ہزار روپے مہینہ بھیجے ہے اور سارا انگریز اور امریکنوں پر اڑا دے ہے۔"

"اور ایک عجب یہ کہ اس کے کمرے میں کوئی نہ جائے ہے، یہ کھود جائے ہے۔"

اس انکشاف پر سب منہ پر ہاتھ رکھ کر کھل کھلانے لگیں۔ لڑکی حیرت سے دیکھتی رہی تو ماں نے دو ہتڑ مار کر اسے بھگا دیا۔ جا، جا کر منے کو دیکھ کھڑی بڑی بوڑھیوں کی باتیں سن رہی ہے علامہ۔" لڑکی اپنا دل باتوں میں چھوڑ کر چلی گئی۔

اے ہے بڑھیا ہے کم بخت کونے والی تو... میں نے تو نجیک سے دیکھا ہے۔

Marfat.com

ایسی جھریاں پڑی ہیں، مانو سو سال کی عمر ہو۔"

"ہوں... دور سے دیکھو تو کیسی چٹاخ پٹاخ ہے۔ جب شام کو بن سنور کر اس امریکن کے ساتھ نکلے ہے تو یوں جان پڑے ہے جیسے کوئی جوان جوڑا ہے۔ کل دیکھا تھا، گلابی باریک گاؤن اور کالی جالی کی آستین اور یہ لمبے لمبے بندے پہنے کھٹاک کھٹاک مردوے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلی جا رہی تھی۔"

"اے ہے یہ بالشت بھر کی کیل ایسی ایڑھیوں پر کیسے مٹک مٹک کر چلے ہیں کہ انگ انگ ہلے ہے، میں تو سچ مچ آنکھیں نیچی کر لوں ہوں دیکھ کے۔"

"اور جو اپنی یہاں کی عورتیں سارا تن ڈھکیں ہیں تب بھی ننگی کی ننگی۔" "کون سا سارا تن ڈھانکے ہیں، بس سمجھ لو ٹانگیں کھلی نہ رکھیں۔ اوپر سے وہی بغیر آستین کی قمیص، بلاؤز میں سے پیٹ جھانک کر غیر مردوں سے تاتا کرے ہے۔" اس بات پر سب کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔

"اے ہے پہلے تو آگے سے یہاں یہاں تک گلے کھلے رکھے تھیں اور اب یہ نیا پھیسن چلا ہے اللہ مارا کہ ساری پیٹھ ننگی..."

"اے بوا! اگایا تو دکھا لیا نا دل بھر کے، اب پچھایا دکھانے کی باری ہے۔"

اس بات پر پھر پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔

"اے ہے جو تم میری عراقی بیگم کے رات کے کپڑے دیکھ لو، یہ گلابی لیس اِدھر اُدھر ٹکی ہوئی اور مہین ایسا کہ جسم تو کیا، جسم کے اندر کی چیزیں بھی دیکھ لو۔"

"لو اور سنو، کپڑا نہ ہوا، یہ تو وہ ہو گیا موا ایکسٹرا۔"

"ایکسٹرا نہیں ایکسرے۔"

"لو میں کیا جانوں ان سسرے ولایتی ناموں کو۔"

'اور میری بیگم کہوے ہے کہ ہم عراقی مسلمان ہیں اور مصر میں اور ایران میں سب جگہوں میں مسلمان ہیں، پر پہناوا کرسٹانوں کا پہنے ہیں۔"

"اے ہے وہ جو ایرانی ہے وہ تو بالکل امریکن دکھائی دے ہے۔ بال کٹے ہوئے، یہ لمبے لمبے ناخون، میاں کی بغل میں یوں ہاتھ ڈال کر چلے گی جیسے وہ چھوڑ کر بھاگا جا رہا ہو... قسم ہے بہن، سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے اور میں بچوں کو لے کر گھاس پر

بیٹھی ہوں۔ اب تم سے کیا کہوں، نظر جا کے جو کہیں رکے تو بس سیدھی جانگیے پر۔''

''اور وہ جو جرمنی کی کھوے ہیں لوگ۔ جب تیر کر یا ٹینس کھیل کر آئے گی اپنے نیچے کے کپڑے اتار کر عین مین سامنے رسّی پر لٹکا دے گی کہ لو دیکھ لو۔''

''اے تو انھیں کیا شرم، جب وہی کپڑے پہن کر مٹکتی پھرے ہیں تو خالی خولی سے کیا حیا...''

''وہ تیرے صاحب اور بیگم صاحب کپڑے تو فرنگی پہنے ہیں، پر جب آپس میں بولے ہیں تو معلوم دیوے ہے جیسے قرآن شریف پڑ رہے ہوں۔ پتا نہیں اتنے زور زور سے حلق سے آواز نکال کر ان کے گلے بھی نہیں پڑ جاتے۔''

''عربی بولے ہیں وہ۔'' آپا نے اکڑ کر کہا۔

''پھر تو کس طرح ان سے بات کرے ہے؟''

''انگریجی میں۔'' آپا نے زبان داں کی شان سے کہا۔

''ایمان قسم، تجھے انگریجی آوے ہے۔''

''اور کیا...''

''پر روم بیرا تو اس دن بولے تھا، بیگم صاحب نے کہا آپا بے بی سلیپ تو تو لے کر کھانا کھلانے لگی...''

''جانے دو اس روم بیرے کی باتیں۔ وہ تو جیسے سیدھا بلایت سے آ رہا ہے۔ ایمان قسم میں بتاؤں ہوں اسے کہ بیگم کیا کہہ رہی ہے، ایک دن بیگم نے اسے پانچ روپے دے کر کہا، ''گو، برنگ کچن۔'' اب بیرا کھڑا کھڑا اس کا منھ دیکھے۔ اس نے پھر کہا۔ ''گو مارکٹ کچن...'' اب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا تب میں نے کہا، ارے مرغی کو کہہ رہی ہے۔ مرغی لے، باجار سے۔ تب وہ سمجھا۔ اب تک اس بات پر میں اس کا مجاخ بناؤں ہوں تو بگڑ کر کھوے ہے، ''تجھے پتا تو ہے نہیں، بیگم گلط بول رہی تھی، مرغی کو کچن نہیں چکن کھوے ہیں...لو یہ تو اس کی حالیت ہے...''

اس پوری روئیداد کے بعد جملہ حاضرین پر آپا کی انگریزی دانی کی دھاک بیٹھ گئی مگر روم بیرے کا اعتراض ابھی باقی تھا۔ جب کسی نے پھر اسے دہرایا تو بڑی بے پروائی سے بولی، ''بیگم کو کھود کون سی انگریجی آئے ہے۔ ایک ایک لفظ بولے ہے،'' آپا بے بی

Marfat.com

سوپ آیا ہے بی گو...'' اس دن جو اس نے سلیپ کہا تو میں سمجھی سوپ کو کہہ رہی ہے، میں سوپ پلانے لگی۔''

اب کسی اعتراض کی گنجائش نہیں تھی، اس لیے بات پلٹ کر پھر وہیں آ گئی کہ ان ہوٹل والی بیگموں پر جن آتا ہے نہ بڑھاپا۔ مثال کے طور پر بارہ سال سے یہاں رہنے والی میم بارہ سال سے جوں کی توں تھی۔

''ارے غفور بیرا کہے ہے، اس کی میز پر خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی دس شیشیاں رکھی ہیں۔ کسی میں اٹامن ہے کسی میں وٹامن۔''

اس بات پر بھی سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

''ایمان قسم زندگی تو انھیں کی ہے۔ ہم تم تو اللہ ماریاں مردہ ہیں مردہ۔ قبروں میں لیٹنے کے لائق۔''

''لو اس کو دیکھو، شیطان آ گیا نا آخر... خدا نہ کرے کہ ہم ان جیسی ہوں...''

اور وہ سب اپنے منھ پر تھپڑ مارتی پھر روزمرہ کے کاموں اور الجھنوں میں گرفتار ہو گئیں لیکن یہ مسئلہ نہ سلجھا کہ ہوٹل کے پچھواڑے جنوں کی اتنی بہتات ہونے کے باوجود ہوٹل والیوں پر جن کیوں نہیں آتے۔

''جس دن کسی ہوٹل والی پر جن آ گیا، میں بابا کے مزار پر گھی کے چراغ جلاؤں گی...''

مالی کی بیوی نے جو اِن ہوٹل والیوں سے سب سے زیادہ جلتی تھی، بہ بانگِ دہل اعلان کیا۔

○○○

Marfat.com

۶

سردیوں کے کہر آلود اور ٹھٹھرا دینے والے دن گزر گئے تھے۔ اس دفعہ اسد کو پھر کوئٹہ بھیجا جا رہا تھا... اسد اور بوبی پنڈی سے سیدھے کوئٹہ چلے گئے تھے۔ صبا چند روز اپنی دوست عذرا کے پاس رہنے کے لیے لاہور ٹھہر گئی تھی۔ اس نے چاہا بھی کہ اسد بوبی کو اس کے ساتھ چھوڑ جائے مگر اسد نے کہا، ''مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی، اشرف تو ساتھ ہے ہی... پہلے بھی تو میں اسے ساتھ رکھتا تھا۔'' پھر ہنس کر اس نے اضافہ کیا، ''میں بوبی کو اس لیے ساتھ لیے جا رہا ہوں کہ تم زیادہ دن لاہور نہ ٹھہرو...'' صبا سوچتی رہ گئی کیا اب بھی اسد مجھ پر بوبی کے سلسلے میں بھروسا نہیں کرتا یا اسے واقعی بوبی سے اتنی محبت ہوگئی ہے کہ اس کے بغیر رہنا گوارا نہیں۔ اسے یہ دوسری بات زیادہ صحیح معلوم ہوئی اور ایک طرح سے دل کو تسلی سی ہوگئی...

لاہور اسٹیشن پر یک بہ یک وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگ گئیں اور بہ قول کسے پھوٹ پھوٹ کر ہنسنے لگیں۔ دونوں کی شادیوں کے بعد ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ خط و کتابت کے ذریعے وہ کسی حد تک ایک دوسرے کے حالات سے واقف تھیں مگر ملاقات پھر ملاقات ہے۔ ہنستی کھلکھلاتی باتوں اور قہقہوں کے طوفان میں وہ یوں بہ رہی تھیں کہ کئی مرتبہ عذرا اسٹیرنگ سے غافل ہوجاتی اور کار سانپ کی طرح بل کھانے لگتی۔ گھر پہنچ کر عذرا نے صبا کا تعارف اپنی بہن، بہنوئی اور اپنے میاں سے کروایا۔ عذرا کی آپا کو دیکھ کر وہ ایک دم چونک سی پڑی۔ کتنا فرق تھا دونوں بہنوں کی شکل وصورت میں، عذرا بے ڈول اور بھدی تھی اور اس کی آپا کا شمار یقیناً حسینوں میں ہوسکتا تھا۔ ان میں حسن ہی

Marfat.com

نہیں تمکنت بھی تھی اور سب پر چھائے رہنے کی سی کیفیت، اس لحاظ سے بھی وہ عذرا سے قطعی مختلف تھیں۔ عذرا ہر جگہ نرم روی اور غیر محسوس طور پر چلنے والی ہوا تھی تو آپا اپنے فیض کے کرشموں سے واقف، بادل کا وہ ٹکڑا تھیں جو کہیں کہیں برستا ہے۔

ملاقاتی کمرہ بے حد خوب صورتی سے آراستہ تھا۔ جب صبا نے اس کی تعریف کی تو عذرا نے فوراً ہنس کر کہا، ''سب آپا نے کیا ہے، ان کو داد دو۔'' صبا نے اپنی داد کا رخ موڑ دیا۔ آپا نے صرف ہلکی سی مسکراہٹ سے اس داد کو وصول کیا۔ کمرے میں آپا کی دو تین نہایت حسین تصویریں قیمتی فریموں میں بک ریک اور تپائیوں پر رکھی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ اتنی حسین تصویریں کمرے کے حسن میں اضافہ کر رہی ہوں گی لیکن ملاقاتی کمرے میں اتنی فراخ دلی سے ان کا استعمال اسے بھلا نہ لگا، خصوصاً جب کمرے کی آرائش بھی انھوں نے خود کی تھی۔ مگر عذرا نے فوراً ہی اس بات کو صاف کر دیا۔

''صرف آپا کی یہ تصویریں میں نے یہاں رکھی ہیں۔ یہ اٹھا دیتی ہیں پھر میں لاکر رکھ دیتی ہوں۔ کئی سال سے یہی ہو رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ہنس دی، اس کی شخصیت میں سب سے جاذبِ توجہ چیز اس کی معصوم اور بے ساختہ ہنسی تھی۔ صبا نے کئی دفعہ سوچا تھا کہ روبینہ اور عذرا کی ہنسی میں کتنا فرق تھا۔ ایک قلقل مینا کی طرح بناوٹی اور دعوت انگیز تھی تو دوسری آزاد جھرنے کی طرح قدرتی اور لطیف... کالج میں جہاں پہلی مرتبہ صبا اور عذرا کی ملاقات ہوئی تھی، اتنی لڑکیوں کے درمیان عذرا کی ہنسی نے ہی صبا کو اپنی طرف کھینچا تھا۔

''اور تم نے یہ دیکھا۔ پردوں پر یہ عورتیں آپا نے خود پینٹ کی ہیں۔ کتنی خوب صورت لگ رہی ہیں...'' عذرا نے اسے متوجہ کیا۔

''بہت پیاری ہیں...'' اس نے کہا۔ گھر کی جس چیز کو وہ سراہتی، عذرا فوراً اسے خبردار کرتی کہ یہ آپا نے بنائی ہے یا خریدی ہے یا انھیں کسی نے تحفہ دی ہے۔

''تو یہ گھر آپا کا ہے!...'' آخر جیسے وہ بات کی تہہ پا گئی۔

''نہیں، گھر تو ہمیں ملا ہوا ہے مگر چوں کہ منے بھائی بھی یہیں کام کرتے ہیں، اس لیے دو الگ گھروں میں رہنے کی کیا تک تھی، ہم نے انھیں اپنے ساتھ رکھ لیا ہے۔ ہمارا بھی دل لگا رہتا ہے اور بچوں کا بھی۔ بچوں کے نام پر اسے بچے یاد آگئے اور وہ باہر اودھم چوکڑی مچانے والے بچوں کو گھیر گھار کے لائی اور صبا سے ان کا تعارف کرا دیا۔ تین

Marfat.com

بچے آپا کے تھے اور دو اس کے۔ پھر اس نے صبا کو اس کا کمرہ دکھایا جہاں وہ بے تکلفی سے مسہری پر دراز ہوگئی۔

''اب آرام کا وقت نہیں ہے۔ تیار ہو جاؤ، پکچر میں سیٹیں ریزرو ہو چکی ہیں۔'' عذرا نے اسے مطلع کیا۔

''ارے بھئی نہیں۔ میں تھکی ہوئی ہوں، تم لوگ ہو آؤ، تکلف نہیں۔'' صبا نے کہا۔

''اچھا...'' عذرا نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔

جب شام کو خاصی ہبڑ دبڑ، چیخ و پکار اور کاروں کے شور وغل کے بعد خاموشی چھائی تو صبا نے دیکھا کہ عذرا پھر بھی گھر میں موجود ہے۔

''ارے تم نہیں گئیں پکچر؟'' اس نے کہا۔

''تمھیں چھوڑ کر چلی جاتی؟ عجب بودم ہو۔'' وہ بے تکلفی سے ہنسی۔

''ارے بھائی میں نے کہا جو تھا۔''

''تم تو ہمیشہ اوٹ پٹانگ باتیں کیا کرتی ہو، تمھاری بات کون مانے۔''

''یہ تو تم نے بہت برا کیا، شاہد بھائی بھی نہیں گئے ہوں گے۔''

''وہ تو چلے گئے... میں نے کہا تم جاؤ، میری دوست آئی ہے، اس سے گپ شپ ہوگی، تم بور ہو گے۔''

''بڑے سعادت مند میاں ہیں۔''

''بہت...'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

منھ ہاتھ دھو، ذرا حلیہ درست کر وہ باہر آ کر ٹہلنے لگیں۔

''تمھارا باغ بے حد خوب صورت ہے۔'' صبا نے کہا۔

''اوہو، جب ہم یہاں آئے تھے، تب تم اس کا حلیہ دیکھتیں، اس قدر کا اجاڑ تھا کہ حد نہیں۔ الو بولتا تھا سچ مچ۔ یہ تو آپا نے خود مالی کے ساتھ لگ کر کام کیا ہے۔ بے چاری کے خوب صورت ہاتھ تباہ ہو گئے تھے۔ میں نے زبردستی ان سے یہ کام چھڑوایا...''

''اچھا...'' آپا کی اس تکرار سے صبا ذرا سی دیر میں بیزار ہوگئی مگر عذرا تھی کہ باغ کا کونا کونا اسے دکھا رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ آپا نے یہ سفید اور زرد گلاب فلاں کے

Marfat.com

ہاں سے منگائے ہیں، یہ زرد گلاب گورنمنٹ ہاؤس سے بہ نفسِ نفیس جا کر لائی ہیں۔ ناگ پھنوں کی قسموں کی تلاش میں تو انھوں نے کوئی نرسری اور کوئی باغ لاہور کا نہیں چھوڑا۔ بلکہ اس کے میاں کو ساتھ لے کر جنگلوں جنگلوں پھرتی رہیں... برآمدے کی بیلوں کو وہ خود تراشتی ہیں۔ ایک مرتبہ اسٹول سے گر گئیں تو خوب چوٹیں آئیں۔ شاہد نے مجھے ڈانٹا کہ تمھارے گھر کو سنوارنے کی خاطر کسی دن وہ جان دے دیں گی۔ اب بھلا میں کیا کروں، انھیں شوق ہے۔"

"بڑا کام کرتی ہیں..." صبا نے عذرا کا دل رکھنے کو کہا۔

"بس حسین ہیں، حسن پرست ہیں۔ ان کاموں میں ان کا دل لگتا ہے۔ باورچی خانے میں جانے اور بچوں کی پرورش کرنے سے وہ گھبراتی ہیں۔ یہ کام میں نے اپنے ذمے لے لیے ہیں۔"

صبا نے یہ بات ذرا سی دیر میں محسوس کر لی تھی کہ بچوں میں سے جو کوئی بھی کچھ کہنے آتا، سیدھا عذرا کے پاس۔ اس کی آپا نچنت سی اپنے خوب صورت ہاتھوں کو ادا سے گود میں ڈالے بیٹھی اپنے میاں اور بہنوئی سے باتیں کرتی رہتیں۔

"آپا کے دونوں چھوٹے بچوں کو میں نے پالا ہے۔" عذرا نے کچھ عجیب انداز میں کہا۔

"بڑی ہمت والی ہو۔" صبا نے کہا۔

"مگر تم سے زیادہ نہیں، تم تو ایک غیر بچے کو پال رہی ہو۔" عذرا نے کہا۔

"اس کی پرورش میں مجھ سے زیادہ اسد کا دخل ہے۔" صبا نے ایسے لہجے میں کہا جس میں دکھ تو نہیں مگر مایوسی ضرور تھی۔

اوپر اٹھتے ہوئے چاند کی خنک چاندنی میں ٹہل ٹہل کر جب وہ تھک گئیں تو حوض کے کنارے بیٹھ گئیں۔

"اب سناؤ اپنے بوبی اور اسد کا قصہ۔" عذرا نے گویا اس قصے کو فراغت سے سننے پر اٹھا رکھا تھا۔

"بوبی مگن ہے... اسد... اسد... بھی ٹھیک ہیں۔"

"ہیں!..." عذرا نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

Marfat.com

''اِدھر دیکھنا بنو... یہ اسد کے نام پر پرانے ریکارڈ پر اٹک جانے والی سوئی کی طرح کیوں اٹک گئی تھیں، خیر تو ہے؟''

''کہہ تو رہی ہوں ٹھیک ٹھاک ہیں۔''

''خوب! ابھی دس مہینے آپ کی شادی کو ہوئے ہیں، نہ میاں کے نام پر چہرہ سرخ ہوا، نہ مسکرائیں نہ شرمائیں۔ صاف صاف بتاؤ، کوئی اَن بن ہے۔''

''ارے واہ، خواہ مخواہ، اَن بن کیوں ہوتی۔''

''نہیں بھئی کوئی بات ضرور ہے۔ آج کے جملوں میں وہ بات نہیں جو اُن لمبے چوڑے حالات میں تھی جو مجھے لکھ کر بھیجے گئے تھے اور جن کے آخر میں ''پھر وہ ہنسی خوشی رہنے لگے'' والا تاریخی فقرہ تھا۔

دونوں ہنس پڑیں۔ صبا نے سمجھا چلو بات ٹل گئی مگر عذرا نے پھر اسے پکڑا، ''دیکھو بی... تمہارا کوئی دوسرا رازدار ہو تو دوسری بات ہے لیکن بات یہ ہے کہ دنیا میں کم از کم ایک آدمی کو دل کی بات بتا دینی چاہیے، ورنہ دل پر داغ پڑ جاتا ہے۔

''کوئی بات نہیں عذرا...'' صبا نے اپنا ٹھنڈا، یخ بستہ ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر دھیرے دھیرے کہنے لگی، ''شخصیتوں کا فرق بھی تو ہوتا ہے نا۔ بعض میاں بیوی الگ الگ ادھوری شخصیتوں کے مالک ہوتے ہیں مگر باہم مل کر ایک مضبوط شخصیت کے مالک بن جاتے ہیں۔ ایک کی کمزوریاں دوسرے کے اسٹرانگ پوائنٹس میں چھپ جاتی ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ چاہے مل کر ان کی شخصیت زیادہ مضبوط نہ ہو مگر آپس میں گھس پٹ کر ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتی ہے... مشین کے مختلف کل پرزے آپس میں فٹ ہوتے ہیں، ایک پرزہ دوسرے سے ٹکراتا نہیں مگر اجی... ہم دونوں کی شخصیت ایک دوسرے سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو رہی ہے۔ جیسے دو پتھر کے بت ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے ہوں۔ کم از کم مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چند مہینوں میں ہی لنج منج رہ گئی ہوں۔ جیسے میرے اندر اور باہر سے بہت کچھ جھڑ گیا ہو۔''

چند لمحے خاموشی رہی۔ عذرا صبا کے دکھ کو پوری طرح نہیں تو ایک حد تک ضرور سمجھ گئی تھی مگر اس خیال سے کہ اس وقت کی ہمدردی کہیں اس کے آنسو نہ نکال دے، اس نے مذاق کرنے کی کوشش کی۔

Marfat.com

''صبی، بھئی یہ شخصیت کس چڑیا کا نام ہے۔ میں آج تک نہیں سمجھ پائی۔ لوگ کہتے ہیں کہ شخصیت شکل وصورت، تعلیم و تربیت، عادت و اطوار اور چال ڈھال سب سے مختلف کوئی چیز ہے۔ آخر وہ کیا ہے۔''

''شخصیت ان سب چیزوں کا مرکب ہے۔'' صبا نے کہا۔

''میں نے تو بڑی کوشش کی کہ کسی دن اپنی شخصیت کی ترکیبِ نحوی کروں مگر کوئی سرا کہیں سے ہاتھ نہیں لگا۔'' عذرا ہنسی۔

''تم جیسی پیاری شخصیت کو ان الجھاووں میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔'' صبا نے ہولے سے کہا۔

''اچھا... دل بڑھانے کا شکریہ۔'' وہ مسکرائی، ''خود کو سمجھنے کی کوشش نہ کرو، ورنہ اتنے ہی الجھتے جاؤ گے، یہ کس کا قول ہے صبی؟''

''کسی کا بھی نہیں، یہ تمھارے اپنے دماغ کی اختراع ہے۔''

''ہیں! سچ مچ...'' اس نے زور کا قہقہہ لگایا، ''اب تو وہ اسٹیج آ گئی ہے کہ اپنی کہی ہوئی باتیں دوسروں کے اقوالِ زریں معلوم ہونے لگے ہیں، نیک فال ہے نا۔''

''بالکل... اب چند دن میں دوسروں کے قول اپنے معلوم ہونے لگیں گے۔'' صبا نے چھیڑا۔

''وہ تو پہلے بھی اپنے ہی معلوم ہوتے ہیں۔'' عذرا نے کہا۔ دونوں ہنس پڑیں۔

''ہم لوگ کتنی احمقوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔'' دفعتاً صبا نے کہا، ''بھئی یقین کرو صبی... ایسی احمقوں کی سی باتیں کرنے کو زبان ترس گئی تھی۔''

''اب ایسی باتیں کرنے کو پھر کب آؤ گی؟'' صبا نے پوچھا۔

''جب میرے میاں کو کوئی اتنا اہم کام ہوگا کہ چھٹی نہ مل سکے، تب پروگرام بناؤں گی۔

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ انھیں چھٹی نہ ملے گی تو میں اکیلی آؤں گی اور ہم خوب گپیں ہانکیں گے، اب اگر تمھارے میاں خدانا خواستہ ساتھ ہوتے تو اس وقت ہم پکچر میں بور ہو رہے ہوتے یا صوفوں پر سجے ہوئے، ہاؤ ڈو یو ڈو، قسم کی باتیں کر رہے ہوتے۔''

Marfat.com

''یہ تو سچ کہتی ہو۔'' صبا نے کہا۔

''ہم تو سدا سچ کہتے ہیں اور سکھ سے رہتے ہیں... آؤ ذرا بچوں کو دیکھیں، انھیں سلا دیں، پھر گپ شپ ہوگی دل بھر کے۔''

بڑے بچوں کو کپڑے تبدیل کرنے کا حکم دے کر اور چھوٹوں کے کپڑے خود بدلوانے کے دوران میں بھی وہ مستقل باتیں کرتی رہیں۔ عذرا نے بتایا کہ چاروں بچے الگ کمرے میں سوتے ہیں مگر آپا کی چھوٹی بے بی کو وہ خود لے کر سوتی ہے۔ وہ اس سے اتنا ہل گئی ہے کہ آپا کوشش کریں تب بھی ان کے پاس نہیں جاتی۔

''سناؤ، تمھارے ہاں چیاؤں میاؤں کی کب تک امید ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جب خدا کی مرضی ہوگی اور خداوند مجازی کی۔''

''ہیں!...'' بے بی کی فراک اتارتے اتارتے ہاتھ روک کر عذرا نے غور سے اسے دیکھا۔ کچھ دیر وہ اس کے چہرے کو تکتی رہی، پھر شرارت سے بولی،''فائیو ایئر پلاننگ (Five Year Planning) ہے؟''

''کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔'' صبا نے بہ ظاہر بے پروائی سے کہا مگر اس کا لہجہ اداس تھا۔

''ارے بھئی یہ مرد قوم بھی انتہائی احمق ہوتی ہے۔ ان میں سے کچھ تو اس درجے کے پاگل ہوتے ہیں کہ بیوی مر رہی ہے، سل ہو گئی ہے، خون تھوک رہی ہے اور ہر سال کیا ہے کہ جی صاحب زادی ہوئی ہے یا شہزادے پدھارے ہیں اور ایک قسم یہ نئی نکلی ہے کہ شادی بعد میں ہوئی اور پلاننگ پہلے شروع ہوگئی، سب کے سب احمق ہیں یہ۔''

''اسد شاید بوبی کی وجہ سے محتاط ہیں...'' صبا کے لہجے کا دکھ اس مرتبہ صاف تھا۔

عذرا بے بی کی انگلی پکڑ کر اسے باتھ روم میں لے گئی اور وہیں سے بولتی رہی۔'' میں لکھوں گی تمھارے دولھا کو، یہ کیا حماقت ہے، ہاں نہیں تو۔'' بچوں کو سلاتے سلاتے وہ خود بھی وہیں بستر پر اوندھ گئیں۔ عذرا بولی،''ایک بات تو بتاؤ، کیا تم بتائے بغیر اندازہ لگا سکتی تھیں کہ کون سے میرے بچے ہیں اور کون سے آپا کے؟''

صبا نے کچھ دیر سوچا،''شاید نہیں۔''

''یہ بھی اچھا ہوا نا کہ میرے بچے شاہد پر گئے اور آپا کے خود ان پر، اس طرح

Marfat.com

دونوں غنیمت ہوگئے۔ اگر ہمارے مجھ پر چلے جاتے اور ان کے منے بھائی پر تو دونوں کا پڑا ہو جاتا۔"

"نہیں خیر اب ایسا..." صبا نے کہنا شروع کیا۔

"چلو رہنے دو، بڑی ہمت بندھا رہی ہیں، یہی کہو گی نا۔ اب تم ایسی بدصورت بھی نہیں ہو۔"

"خیر تم تو خوب پیٹ بھر کے بدصورت ہو، میں کہہ رہی تھی منے بھائی اتنے برے بھی نہیں ہیں۔"

"اچھا... یعنی کہ ہم اس قدر بدشکل ہیں۔"

"اب لگیں نا مرچیں..." پھر وہ دونوں زور سے ہنس پڑیں۔ آپا کی بچی راحیلہ جس کو وہ تھپک تھپک کر سلا رہی تھی، چونک پڑی اور آنکھیں پھاڑ کر دونوں کو دیکھنے لگی۔

"اس طرح تو ان میں ایک سو کر نہیں دے گا۔ میں جا کر اسد کو خط لکھتی ہوں، تم بچوں کو سلا کر میرے کمرے میں آ جانا۔" صبا نے کہا۔

"اچھا... لائٹ بند کرتی جاؤ..."

جس وقت وہ سب پکچر دیکھ کر لوٹے تب بھی یہ دونوں باتوں میں جتی ہوئی تھیں۔

"کھانا کھالیا تم دونوں نے؟" آپا نے ان کے کمرے میں آ کر پوچھا، "کہاں... آپ کا انتظار ہو رہا تھا۔"

"یہ دیکھو..." آپا نے ایک بنڈل کھول کر تیز تیز رنگ کے ایک ہی ڈیزائن کے دو ٹکڑے مسہری پر پھیلا دیے۔

"یہ میں تمھاری اور اپنی قمیص کے لیے لائی ہوں۔" آپا نے عذرا سے کہا۔

"پکچر شروع ہونے میں دیر تھی تو ہم بازار چلے گئے تھے۔"

"ہے... آپ اس میں اڑ جائیں گی مگر ہم غریب... جیسے کالے کوے پر خوب صورت رنگوں سے پھول بنا دیے جائیں۔ لو یہ میری طرف سے تم لے لو۔"

جھٹ اس نے ایک کپڑا اٹھا کر صبا کو دے دیا۔

"نہیں بھئی... تمھاری آپا لائی ہیں، تمھارے لیے۔"

ارے ہم میں اتنی غیریت نہیں ہے کہ آپا برا مانیں گی۔ اللہ قسم تم پر خوب کھلے گا،

کیوں آپا؟"

"ہاں ہاں۔ تم لے لو، میں اس کی پسند کا کپڑا اسے لادوں گی اور یہ دیکھو..."
انھوں نے اپنا بایاں ہاتھ ایک ادا سے اوپر اٹھایا، یہ تمھارے دولھا بھائی نے زبردستی میرے ہاتھ پر لاد دیا۔" ان کی سفید براق کلائی میں جدید وضع کا ایک چوڑا سا بریسلٹ پڑا ہوا تھا... "میں نے لاکھ کہا مجھے اچھی نہیں لگتیں ایسی چیزیں۔"

"کیسا تو خوب صورت لگ رہا ہے، کیوں صبی؟"

"ہاں، بہت اچھا ہے..." صبا نے کہا مگر جواب سننے سے پہلے عذرا کھانا نکلوانے باہر جا چکی تھی۔

"رات کو کسی وقت صبا کی آنکھ کھلی تو کمرے کی تمام بتیاں جلی ہوئی تھیں، دیوالی سی ہو رہی تھی۔ اسد کے نام کا خط آدھا لکھا ہوا میز پر پڑا تھا۔ وہ اور عذرا آڑی ترچھی بستر پر لیٹے لیٹے باتیں کرتی جانے کب اونگھ گئی تھیں۔ صبا نے عذرا کو اٹھایا... "اے بی! اٹھو، جاؤ اپنے کمرے میں۔"

عذرا صرف کسمسا کر رہ گئی۔

"اونھ ہوں... اٹھو بھی نا..." اب کے صبا نے اپنے حسابوں اس کے بھیلے ایسے جسم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا مگر اس نے صرف ایک آنکھ کھول کر بھاری آواز میں کہا، "کیا ہے بھئی۔"

"ہوتا کیا... جاؤ اپنے میاں کے کلیجے میں گھس کر سوؤ۔ ورنہ وہ مجھے بددعائیں دیں گے۔"

بڑی مشکل سے وہ اٹھ پائی۔ جب وہ اپنے سلیپر گھسیٹتی آنکھیں بند کیے کمرے سے نکل گئی تب صبا نے اٹھ کر کپڑے بدلے، روشنی بند کی، اسد کا خط دراز میں رکھا اور ازسرِ نو سونے کی کوشش کرنے لگی۔

OOO

Marfat.com

۷

صبح صبا دیر سے اٹھی۔ ناشتا اپنے کمرے میں ہی کیا۔ اسد کا خط پورا کیا۔ پھر تیار ہوکر باہر نکلی تو آپا برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ صبح وہ اپنے کمرے سے اسی طرح بنی سنوری نکلتیں جس طرح رات کو اندر جاتی تھیں۔ اپنے گھر میں بھی شاید ہی کسی نے انھیں بغیر میک اَپ دیکھا ہو۔ روز کپڑے، کانوں کے بندوں اور چوڑیوں کا رنگ ضرور مختلف ہوتا تھا۔ اس حساب سے لپ اسٹک کے رنگ بھی بدلے ہوئے ہوتے ورنہ وہی سیاہ جی جان سے بنی ہوئی بھنویں۔ وہیں پاؤڈر کی تہوں سے جھانکتی ہوئی ہلکی سی سرخی، وہی پنسل سے بنائی ہوئی بادام کی شکل کی آنکھیں اور وہی ہونٹوں پر خوب صورتی سے لگائی گئی کس پروف لپ اسٹک۔ اس وقت بھی وہ اسی طرح گڑیا سی بنی تن دہی سے لیمپ کا ایک نیا شیڈ بنانے میں مصروف تھیں۔ صبا سارے گھر میں عذرا کو ڈھونڈتی پھری۔ آخر میں معلوم ہوا کہ وہ شلوار کے پائینچے چڑھائے، پرانا سا ایک ہاؤس کوٹ پہنے ہوئے ایک کے بعد دوسرے بچے کو نہلا رہی ہے۔ صبا ایک کتاب لے کر باغ کے ایک خاموش کنج میں جا بیٹھی۔ غسل خانے کی نالی سے جھاگ بھرے ہوئے پانی کے ساتھ مسلسل اس کی آواز نکل رہی تھی:

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کردیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کردیا

یہ اس کا پسندیدہ شعر معلوم ہوتا تھا کیوں کہ اسے جب بھی فرصت ہوتی، وہ یہی شعر غیرشعوری طور پر گنگنانے لگتی تھی۔ اس وقت بھی مسلسل ٹانگیں لمبی کرو، ہاں یوں... حسن بے پرواہ کو... گردن اوپر اٹھاؤ ذرا۔ اظہارِ تمنا... کر دیا... کی رٹ لگی ہوئی تھی۔

Marfat.com

پھاٹک میں سے شاہد کی کار آتی نظر آئی... وہ اتر کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے آپا کے پاس جا کھڑے ہوئے، ''عذرا کہاں ہے؟''

''بچوں کو نہلا رہی ہے۔''

وہ پاس پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ آپا نے اس شیڈ کے سلسلے میں اپنے ذہن کے سارے رنگین منصوبے انھیں بتائے اور رائے لی۔

''نائلون کی کالی لیس ہی اچھی لگے گی۔'' انھوں نے کہا۔

''مجھے ڈر تھا کہ تم بھی یہی کہو گے۔''

''ڈر تھا، وہ کیوں؟''

''کیوں کہ لیس میرے پاس نہیں ہے۔ تمھارے پاس وقت ہو تو جا کر ابھی لے آؤ۔''

''آپ کے لیے میرے پاس صرف وقت ہے... اور کچھ نہیں۔'' شاہد نے فلسفیانہ موڈ طاری کر کے انگریزی میں کہا۔

''اچھا تو چلو... پاس ہی پڑا ہوا پرس اٹھا کر وہ کھڑی ہوگئیں پھر غسل خانے کی بند کھڑکی میں منھ گاڑ کر انھوں نے اطلاع دی، ''عذرا میں ذرا کالی لیس لینے جا رہی ہوں۔''

''حسنِ بے پرواہ کو... کالی بھینس؟... کیا کیجیے گا؟''

''ارے بھئی نہیں کالی لیس۔''

''کیا کیا میں نے... کالا ریل میرے سنگھار میز کی دراز میں پڑا ہے...''

''ارے کالا رِیل نہیں کالی لیس نائلون کی، شیڈ کے لیے۔'' آپا نے زور سے کہا۔

''تو لے آؤ نا، کیوں ڈکرا رہی ہو...'' عذرا ایک دم بے تکلفی پر اتر آئی۔

''ذرا تمھارے میاں کو ساتھ لیے جاتی ہوں۔''

''افوہ... تو کیا میری اجازت کی ضرورت ہے۔ لے جاؤ، واپس لے آنا۔ حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا... خود بین و خود آرا...'' وہ بڑبڑانے کے انداز میں گنگناتے جا رہی تھی۔

آپا اور شاہد چلے گئے۔ عذرا بچوں سے فارغ ہونے کے بعد کپڑے بدل کر جوڑا لپیٹتی ہوئی عذرا کی طرف چلی آئی۔

Marfat.com

''اچھا ایک بات تو بتاؤ صبی!'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی، ''اگر کسی کا پیٹ بھرا ہوتو کیا وہ دوسرے کے باغ میں لگے ہوئے خوش ذائقہ پھل توڑ کر کھائے گا یا صرف انھیں دیکھنے پر ہی اکتفا کرے گا۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' صبی حیران ہوکر بولی۔

''بھئی یوں سمجھو کہ تمھارے پڑوسی کے باغ میں بڑے خوب صورت پکے پکائے پھل لگے ہیں، تمھیں معلوم ہے کہ ان کی زیادہ رکھوالی نہیں ہو رہی مگر تمھارا پیٹ بھرا ہوا ہے تو تم انھیں توڑ کر کھانے کی کوشش کروگی یا محض دیکھ کر ہی خوش ہولوگی؟''

''عجیب ٹیڑھا سوال ہے۔ بہرحال اس کا جواب میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ بعض لوگ خالی پیٹ بھی ہوں تو دوسرے کی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کرنہیں دیکھتے اور بعض ندیدے پیٹ بھرا ہونے پر بھی نہیں چوکتے پھر تم نے سنا ہوگا، چوری کا گڑ زیادہ میٹھا ہوتا ہے۔''

''اچھا؟...'' اس نے چونک کر کہا اور چند لمحوں کے لیے جیسے کھو سی گئی۔

''بات کیا ہے، کیوں پوچھ رہی تھیں...''

''کچھ نہیں، یوں ہی خیال آیا تھا۔ ہاں یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ اپنی اپنی فطرت پر منحصر ہے۔ بعض آدمی پیٹ بھرا ہونے پر بھی نہیں چوکتے۔ اچھا خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کوئٹہ کب تک رہو گی؟''

''دیکھو... یہ گرمیاں تو گزریں گی ہی پھر شاید مشرقی پاکستان چلے جائیں۔''

''پھر تو تم بہت دور چلی جاؤ گی...'' عذرا نے کہا۔

''پھر لوٹ آئیں گے، وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔''

''یہ تو میں بھی مانتی ہوں کہ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ وقت گزرتے رہنا کتنی بڑی نعمت ہے۔'' آج عذرا خلافِ معمول سنجیدہ تھی۔

''نعمت ہے یا لعنت۔ وقت ہی تمام آفتیں اور مصیبتیں لاتا ہے۔'' صبا نے کہا۔

''لیکن وقت گزر جاتا ہے۔ کبھی تم نے یہ غور کیا ہے کہ ان کٹھن لمحوں میں جو اب گزر گئے، اگر وقت ٹھہر جاتا تو ہمارا کیا حال ہوتا۔ یہ کتنی بڑی تسلی ہر وقت ہمارے پاس ہے کہ وقت گزر جائے گا، ہر لمحہ گزر جائے گا۔ میں تو وقت کے ٹھہراؤ کو سب سے بڑا

Marfat.com

عذاب سمجھتی ہوں۔ جب ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب اور دکھ کا ذکر ہوتا ہے تو معلوم ہے میں نہ عذاب کے متعلق سوچتی ہوں، نہ دکھ کے، بلکہ لفظ ہمیشہ ہمیشہ پر غور کرتی رہ جاتی ہوں۔

ایک مشکل لمحے کا ٹھہر جانا، اس یقین کے ساتھ کہ یہ کبھی نہیں گزرے گا، اس سے بڑا عذاب اور کوئی نہیں ہوسکتا۔''

''عجیب منطق ہے تمھاری۔'' صبا نے کہا۔

بہرحال میں سمجھتی ہوں وقت کا گزر جانا بڑی نعمت ہے۔ تبھی تو ہمارے ہاں کہا جاتا ہے، اچھا برا سب وقت ٹل جاتا ہے۔ کبھی غور کرو کہ ان الفاظ میں کتنے معنی پوشیدہ ہیں۔'' عذرا نے کہا۔

''کبھی فرصت ہوئی تو ضرور غور کروں گی۔'' صبا نے طنزیہ انداز میں کہا، ''مگر آج تمھارے اوپر اس بلا کی فلاسفی کیوں طاری ہے۔''

''بس یوں ہی... یہ سب وقت کے کرشمے ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے۔''

''شکر ہے کہ وقت گزر جاتا ہے اور تمھارے اوپر سوار یہ فلاسفی کا موڈ بھی ٹل جائے گا ورنہ مجھے کسی ڈاکٹر کو بلوانا پڑتا۔''

عذرا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور گھڑی دیکھ کر بولی، ''بڑی دیر کردی آپا نے۔ اپنی پسند کی چیز اگر پاتال میں ہوگی تو وہاں سے بھی لاکر رہیں گی۔ نہ جانے کیا وحشت ہے۔ کالی لیس نہیں ملتی تو پیلی لگا دیں کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ پڑتا ہے۔ صبی یہ کیا بات ہے کہ انھیں ذرا ذرا سی باتوں سے فرق پڑتا ہے اور مجھے بڑی بڑی باتوں سے فرق نہیں پڑتا؟''

''یہ تمھاری اور آپا کی شخصیتوں کا بنیادی فرق ہے اجی۔'' صبا نے کہا۔

''واقعی مجھ میں اور آپا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان حضرت میں نسوانیت حد سے زیادہ ہے کسی کے سہارے کے بغیر تو ایک قدم نہیں چل سکتیں۔ ہزار بار کہا، کار سیکھ لو کام آئے گی۔ ایک ہی جواب ہے، میرے بس کی بات نہیں۔ کار میں جائیں تو ڈرائیور چاہیے، پیدل جائیں تو اسکورٹ چاہیے کہ لوگ اسکول کالج کی لڑکی سمجھ کر چھیڑتے ہیں۔ میں ساتھ ہوتی ہوں تو مجال ہے کہ کوئی چوں بھی کر جائے۔ بننے سنورنے کا بچیوں کی طرح شوق ہے۔ اللہ قسم، میرا تو جی بولا جاتا ہے، ایسے کپڑوں سے کسی پارٹی میں جاؤں

Marfat.com

تب بھی دل چاہتا ہے کہ ایسے کپڑے نوچ نچا کر پھینک دوں۔ جانے کہاں سے مردانہ ذہنیت آ مری ہے۔ میں تو جانوں صبی، اللہ میاں مجھے لڑکا بنا رہے تھے، آخری وقت میں جانے کیا جی میں آئی کہ لڑکی بنا دیا۔ اب تم جانو، آخری وقت کا کام تو ایسا ہی ہوتا ہے۔''

دوسرا اور تیسرا دن بھی اسی طرح باتوں اور سیر سپاٹوں میں گزر گیا۔ اس دوران میں صبا نے اکثر صبح کو شاہد کی پرچھائیں کو ایک کمرے سے نکل کر دوسرے میں غڑپ ہوتے دیکھا۔

''بھئی یہ تمھارے میاں آفس نہیں جاتے۔ یہیں پھرتے نظر آتے ہیں۔'' صبا نے کہا۔

''جاتے ہیں، آفس نزدیک ہی ہے، دن میں دو چار چکر گھر کے بھی لگا لیتے ہیں۔''

''اب میری جان کو روتے ہوں گے کہ عذرا کو ایک منٹ کو نہیں چھوڑتی۔ بے چارے اکیلے اکیلے گھومتے ہیں۔''

''ہمیشہ اسی طرح گھوما کرتے ہیں۔''

''اچھا... کیوں؟''

''میں ویسے بھی زیادہ لفٹ نہیں دیتی۔ کہتے ہیں، خوب صورت مردوں کو زیادہ لفٹ نہیں دینی چاہیے، سر پر چڑھ جاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑی۔ صبا کو اکثر پتا نہ چلتا کہ عذرا کب سنجیدہ ہے اور کب مذاق کے موڈ میں۔

OOO

Marfat.com

۸

چوتھے دن صبا نے عذرا سے کہا کہ وہ ایک دن کے لیے اپنے سسرال بھی جانا چاہتی ہے۔ گو اسد نے اسے ضروری نہیں سمجھا تھا بلکہ یہی کہا تھا کہ وہ مکان تمھیں نہیں ملے گا۔ ایسی جگہ ہے اس لیے وہاں جانے کی ضرورت نہیں پھر کبھی اکٹھے ہی چلیں گے۔ اسی شہر میں رہتے ہوئے سسرال نہ جانے میں صبا خود کو مجرم سا محسوس کر رہی تھی، اس لیے اس نے ایک دفعہ آزمائش کرنے کی ٹھان ہی لی۔ شاہد نے آفس سے اپنا ڈرائیور بھیج دیا جس کے ساتھ وہ اپنا مختصر سا اٹیچی کیس لے کر روانہ ہوگئی۔ راہ میں اس نے بچوں اور عورتوں کے لیے کچھ تحفے تحائف لیے۔ ڈاک کا پتا اسے معلوم تھا، اس کے باوجود انھیں مکان تلاش کرنے میں بڑی دقت ہوئی۔ لاہور کے گنجان شہر کی گلیوں میں گھوم پھر کے پھر وہیں آ نکلتے جہاں سے اندر داخل ہوئے تھے۔ راہ گیروں سے پتا پوچھتے تو کوئی کچھ بتاتا کوئی کچھ۔ انھیں سڑکوں کا جنھیں وہ اچھی طرح چھان چکے تھے، بتا دیا جاتا۔ صبا زچ ہوکر واپس جانے کی سوچ رہی تھی کہ اتفاقاً ڈاکیہ نظر پڑ گیا۔ ڈرائیور نے کار روک کر اس سے پتا پوچھا، اس نے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ بغیر مڑ کر دیکھے وہ ایک ایسی گلی میں گھس گیا جہاں کار جانی ممکن نہ تھی۔ صبا نے کار رکوا کر ڈرائیور کو ڈاکیے کے پیچھے دوڑایا۔ جب وہ اصل گھر دیکھ بھال کر آ گیا تو صبا اپنی ساری سنبھالتی اتری، سڑک کی سیلن اور گندگی سے پہلو بچاتی ڈرائیور کے پیچھے اس گلی میں گھس گئی۔ آس پاس گلی میں جتنے بچے تھے، کار کے چاروں طرف جمع ہوگئے، کچھ جلوس کی شکل میں اس کے پیچھے ہو لیے... چند گز پر جا کر جب ایک دروازے پر اس نے اسد کے نام کی تختی پڑھی تو جان میں جان آئی۔ اس وقت اسے اتنی

Marfat.com

فرصت نہ تھی کہ اس تختی کے اس درجہ بے رنگ و روغن ہونے کی طرف توجہ دے... نزدیک کھڑی ہوئی ایک بچی سے اس مکان کے مکینوں کی تصدیق کی اور ٹوٹی ہوئی بتیسی ایسی اینٹوں کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہوئی۔ اندر چھوٹا سا صحن تھا جس کے چاروں طرف کوٹھڑی نما کمرے تھے اور ایک زینہ جا رہا تھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ لڑکی جو گھبرائی ہوئی دروازے پر کھڑی تھی ایکا ایکی لپک کر زینے پر چڑھنے لگی تو صبا نے ہکلا کر کہا، ''کہنا کہ بیگم اسد... وہ جو کوئٹہ میں رہتی ہیں نا... وہ آئی ہیں۔''

وہ لڑکی کو نہیں پہچانی مگر لڑکی اسے پہچان گئی تھی، کیوں کہ اس نے سنا وہ کوٹھے پر چڑھ کر اخبار بیچنے والے لڑکوں کی طرح پکار پکار کر کہہ رہی تھی، ''اماں... ممانی آئی ہیں کوئٹہ والی۔''

''اے ہے کون؟'' ایک بھاری بھرکم سی آواز آئی۔ یکے بعد دیگرے چند پریشان سے چہرے چھجے پر سے جھانکے، پھر اوپر کچھ ایسی افراتفری سی پھیل گئی جیسے اچانک کوئی ہیلی کاپٹر ان کے صحن میں اترا ہو۔ ایک بھاری بھرکم خاتون دوپٹے سے گیلے ہاتھ پونچھتی زینے پر سے اترنے لگیں۔ جنھیں شادی کے دن صرف ایک نظر دیکھنے کے باوجود پہچان گئی۔ وہ اسد کی بھابی تھیں۔ اس کا سلام لے کر وہ کچھ یوں گلے ملیں جیسے اسے چھوت کی بیماری ہو اور ''اوپر آجاؤ'' کہہ کر بغیر اس کا انتظار کیے زینہ چڑھنے لگیں۔ صبا نے لوٹ کر دروازے پر کھڑے ہوئے ڈرائیور سے سامان لیا اور کل اسی وقت آنے کا کہہ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اوپر پہنچ کر اسد کی بڑی بہن نے اس سے سامان لیا اور اندر رکھنے چلی گئیں۔ وہاں اسے بہت سی ان جان صورتوں سے واسطہ پڑا۔ کچھ کو اس نے سلام کیا اور کچھ نے اسے سلام کیا اور سب کے کئی دفعہ کے اصرار پر وہ بیچ صحن میں پڑے ہوئے ایک جھولا سے پلنگ پر ٹک گئی جس پر شاید ابھی ابھی ایک دری اور چادر ڈالی گئی تھی۔ تب نیچی نیچی پھول دار فراکوں اور چھپکلی کی دم ایسی چوٹیوں والی گھبرائی ہوئی لڑکیوں اور گھٹنے تک لٹکتے ہوئے مرے چوہے کی کھال ایسے نکر پہنے لڑکوں کا اس سے تعارف کروایا گیا مگر کچھ ایسے گنجلک انداز میں کہ اسے کچھ پتا نہ چلا۔ وہ یہ دیکھ کر کچھ حیران اور کچھ مایوس ہوتی رہی کہ وہ سب اس کے اپنے بھانجے بھتیجے تھے۔

ساس اندر کمرے میں تھی۔ کسی نے انھیں اطلاع دی تو وہ اپنا بھاری بھرکم سراپا

تھلتھلاتی باہر آئیں۔ صبا نے اٹھ کر انھیں سلام کیا۔ انھوں نے اپنے موٹے گاؤ تکیے ایسے جسم سے گلے لگا کر دعا دی اور پھر ایک ہی سانس میں اسد اور بوبی کی خیریت، اس کے لاہور آنے کی وجہ، آنے اور روانگی کی تاریخ پوچھ ڈالی۔ پھر وہ بھی اس کے جواب سنے بغیر باورچی خانے میں گھس گئیں جہاں اس کی جٹھانی، نندیں اور رشتے کی بھاوجیں پہلے ہی سڑ پٹر کر رہی تھیں۔ ایک بچے کو دروازے پر بلا کر ساس نے کمر بند سے پیسے نکالتے ہوئے چپکے چپکے کچھ کہا۔ کئی منٹ تک جب کوئی باہر نہیں آیا تب وہ کونے میں کھڑے ہوئے ڈھیر سے بچوں کو باری باری بلا کر ان سے باتیں کرنے لگی۔ اس وقت اچانک اس کی نظر کوٹھے کے دوسرے حصے پر پڑی جہاں مونجھ کی چارپائی پر سیاہ دھاری دار کمبل بچھائے ایک بوڑھے سے آدمی اکڑوں گویا مراقبے میں بیٹھے تھے۔ گھر کی اچانک ہلچل اور ہر قسم کی کیفیت سے ماورا۔

''یہ کون ہیں؟'' اس نے ایک بچے سے پوچھا۔

''دادا ابا...'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ تب صبا کو یاد آیا کہ یہ اسد کے تایا ہیں جن کے متعلق اس نے بتایا تھا کہ عرصے سے دمے کے مریض ہیں۔ اس نے اپنا سر ڈھانک کر بڑے ادب سے جا کر انھیں سلام کیا مگر انھوں نے قطعی نوٹس نہ لیا۔ کھسیانی ہو کر اب کے اس نے زور سے سلام داغ دیا۔ انھوں نے نظریں اٹھا کر اسے ایسی جسارت پر کچھ ملامت آمیز نظروں سے دیکھا اور ''جیتی رہو'' کہہ کر پھر مراقبے میں کھو گئے۔ انھوں نے قطعی نہیں پوچھا کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئی ہیں۔ اسد کی طرف سے اس کی شادی میں گنتی کے لوگ شریک ہوئے تھے جن میں نہ تایا ابا تھے اور نہ بچے... صبا واپس آ کر پلنگ کے اس گڑھے میں بیٹھ گئی جہاں سے اٹھ کر گئی تھی... دیکھتے ہی دیکھتے اس کے آگے ایک بے رنگ سی میز رکھ دی گئی اور مختلف قسم اور سائز کی پلیٹوں میں تازے سموسے، باسی پیسٹریاں، مٹھائی اور نمک پارے پہنچ گئے پھر نکل کی چمکتی سی سینی میں چائے بھی رکھ دی گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس تکلف پر کچھ احتجاج کرتی، باورچی خانے سے نکلتے ہوئے باری باری سب نے ''اَرے کھاؤ نا دلہن، چائے لو نا دلہن'' کی تکرار شروع کر دی۔ خیریت اسی میں سمجھ کر وہ جلدی سے برتنوں پر جھک گئی اور ساری پیالوں میں چائے بنانے لگی۔ سب کو ایک ایک پیالی تھمانے کے بعد آخری پیالی وہ لے کر بیٹھ گئی۔ ساس تسبیح پڑھتی

Marfat.com

رہیں، نند بھاوجیں اپنے ناخن دیکھتی رہیں یا آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتی رہیں اور وہ صحن میں بکھری ہوئی مختلف چیزوں کو باری باری دیکھنے لگی۔ باورچی خانے کے آگے صحن کی موری پر مختلف قسم کے میلے برتنوں کا ڈھیر تھا۔ نزدیک دو تین پرانے گھڑے پانی سے بھرے یا خالی رکھے تھے۔ یہاں وہاں مختلف قسم کے جوتے اور چپل لڑھک رہے تھے۔ ایک کونے میں دو ایک لوٹے اوندھے سیدھے پڑے نوحہ کناں تھے۔ برتنوں کے ڈھیر پر بھنکتی ہوئی مکھیاں بہتر غذا یا زیادہ مقدار کو دیکھ کر سموسے اور پیسٹریوں کی پلیٹوں پر ہجرت کر آئی تھیں، یہ بھی ممکن ہے کہ محلے کے بچوں کی طرح صرف صبا کو نزدیک سے دیکھنے آئی ہوں۔ وہ دل ہی دل میں اس خیال سے بے چین ہو رہی تھی کہ سوائے ان بڑے میاں کے جو مراقبے میں بیٹھے ہیں، ہر آنکھ اسے کچھ عجیب انداز میں گھور رہی ہے، جیسے وہ چار سینگوں والی بکری یا اپنے جسم کے جھولے میں بچے کو اٹھا کر پھرنے والی آسٹریلین کانگرو سے بھی عجیب تر مخلوق ہے۔ یک بارگی اسے یاد آیا کہ وہ ان سب کے لیے کچھ تحفے لے کر آئی تھی۔ فضا کی بوریت کو توڑنے کا یہ موقع غنیمت جان کر وہ خود اٹھ کر اندر کمرے سے چھوٹے بڑے لفافے اٹھا لائی۔ اس نے کئی مرتبہ اسد سے اپنے بہن بھائیوں اور کزن کے بچوں کا حساب پوچھا تھا مگر وہ خود ہی بھول جاتا تھا اور یہ کہہ کر ٹال جاتا تھا کہ ہر سال تو amendment کی ضرورت پڑتی ہے، کوئی کہاں تک یاد رکھے۔ اس نے بھی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کی مگر آج اسے اپنی کوتاہی پر افسوس ہونے لگا۔ کم از کم وہ کوشش کر کے ان سب کی تعداد اور تصویروں کے ذریعے ایک حد تک صورتوں سے تو واقف ہو سکتی تھی۔ ہر چند وہ اپنے خیال میں کافی کھلونے لائی تھی مگر یہاں وہ بھی کم پڑتے نظر آنے لگے۔ آخر چھوٹے بچوں کو اس نے ٹافیوں کے رنگین تھیلوں پر ٹالا جو کھلونوں سے علاحدہ لائی تھی۔ جب بچے اپنے کھلونے دوستوں اور محلے والوں کو دکھانے بھاگ گئے، تب اس نے اپنی ساس کی شال، جٹھانی، نندوں اور رشتے کی بھاوجوں کے لیے لایا ہوا مختلف سامان نکال کر انھیں دیا۔ جنھیں پا کر وہ سچ مچ خوشی سے پھول پھول گئیں اور ایک دم اسے فضا پر چھائے ہوئے بوریت کے بادل کچھ چھٹتے ہوئے محسوس ہوئے اور زیادہ تو نہیں مگر ماحول میں ذرا سی نرمی اور گرمی کا احساس ہونے لگا... جیسے جھلستی گرمیوں کی دوپہر میں ایک ناکافی سا چھینٹا پڑ جائے۔

وہ صبا کو کہتے سن چکی تھیں کل اسی وقت ڈرائیور اسے لینے آئے گا جس کا مطلب تھا کہ وہ دن بھر اور رات کو یہیں رہے گی، دو وقت کا کھانا بھی کھائے گی۔ اس ایک مسئلے نے عورتوں کی دنیا میں خاصی ہلچل مچا دی۔ صبا اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی قسطوں میں، اندر کے ایک نسبتاً پرسکون اور صاف کمرے میں پہنچ گئی۔ یہاں کسی دلہن کا جہیز میں لایا ہوا ایک صوفہ سیٹ پڑا تھا جس کے پایوں تک پر کپڑا چڑھا ہوا تھا مگر اب کئی جگہ سے کپڑا پھٹ جانے کی وجہ سے اندر کی بے رنگ و روغن کچی لکڑی جھانک رہی تھی۔ ایک جہازی قسم کی سنگھار میز، اس سے بھی جہازی ایک مسہری جو پشتوں تک ایک ہی جگہ پڑی رہنے والی مسہریوں کے خاندان سے معلوم ہوتی تھی۔ یہ مختلف دور میں مختلف کاموں میں آتی ہے کبھی دولہا دلہن کی سیج ہے پھر اسی پر بہو بچے جنتی ہے۔ وہ بچے بڑے ہو کر گھونسلے سے اڑ جانے والے چڑیا کے بچوں کی طرح اڑ جاتے ہیں مگر یہ مسہری اپنی جگہ پڑی پرانی کہانیاں سناتی رہتی ہے۔ ایک طرف تپائی پر چھوٹا سا ٹیبل لیمپ تھا، یہ گھر کے کسی "ترقی پسند" مکین کا اضافہ تھا۔ ایک طرف الماری میں بجلی کی استری بھی رکھی تھی۔ یہیں بے حد پرانی سپاٹ خاندانی تصویریں بھی تھیں اور دیوار پر ایک آدھ اچھی سینری بھی... گویا اس کمرے میں کئی تہذیبیں گلے مل رہی تھیں۔

ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد وہ دکانوں کی طرز کے کھلنے بند ہونے والے تختوں سے لگ کر باہر دیکھنے لگی۔ نیچے عجیب ہنگامہ تھا، مدت سے اس نے ایسے مناظر اتنے نزدیک اور اتنی دل جمعی سے نہ دیکھے تھے۔ بائیں طرف گلی کے نکڑ پر قدرے کھلی ہوئی جگہ تھی۔ وہاں چارپائی پر ایک حجام پوری فراغت سے ایک گاہک کی حجامت بنا رہا تھا۔ ننھی سی سیاہ کٹوری کی سطح پر تیرتے ہوئے کنگھی کے جھاگوں کو نظر انداز کر کے خالی پانی میں انگلیاں ڈبو کر گلے پر بار بار پھیرنے کے بعد وہ اپنے استرے کی زد میں لے آتا۔ حجامت بنانے کے بعد اس نے گاہک کے سر پر بہ مشکل سر نکالنے والے بالوں کا صفایا کیا اور بڑی دیر تک اس کی گنجی چندیا کو پیار اور پانی سے سہلاتا رہا۔ کھجور اور گنڈیریوں کے ٹھیلے والے گاہکوں سے پہلے مکھیوں کو پیٹ بھرنے کا پورا موقع فراہم کرنے کے لیے آپس میں اطمینان سے باتیں کر رہے تھے۔ بعض بعض جگہ تو مکھیوں کی افراط میں یہ پہچاننا مشکل تھا کہ کون سا ڈھیر گنڈیریوں کا ہے اور کون سا کھجور کا۔

Marfat.com

ذرا فاصلے پر ایک ہوٹل تھا جس کی پیشانی دھویں سے اَٹی ہوئی تھی اور سفیدی سے لکھا ہوا ''غریب نواز ہوٹل'' آج بھی چمکنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اندر ایک طرف بڑے بڑے ساوار تھے۔ لکڑی پر کیلوں میں یہاں سے وہاں تک پھول دار پیالیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ زمین پر قطاروں میں چائے دان جمے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک بھی ثابت نہیں تھا۔ سب کے ٹوٹے ٹکڑوں کو لوہے کی باریک پتریوں سے باندھ کر چائے دان کی شکل دے دی گئی تھی۔ بعض میں یہ ٹکڑے اس قدر تعداد میں اور اتنے چھوٹے چھوٹے تھے کہ یہ باور کرنے سے کہ ان ٹوٹے ٹکڑوں کو جوڑا گیا ہے، یہ مان لینا آسان تھا کہ پورے چائے دان کو پہلے جگہ جگہ پتریوں سے باندھ کر زمین پر دے مارنے کے بعد یہ صورت پیدا ہوئی ہے۔ اندر کے حصے میں چند چارپائیاں اور بد رنگ میزیں کرسیاں پہلو بہ پہلو بچھی ہوئی تھیں اور دیواروں پر قائداعظم، لیاقت علی، پریزیڈنٹ ایوب خان کی رنگین تصاویر ''اسلامی تاریخی'' کیلنڈر، رنگین کاغذوں اور چمکتی پنیوں سے بنے ہوئے پھول پتے ایک لائن میں ''ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز'' کے شعر کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ کاؤنٹر پر جہاں چند مٹھائیاں بہ طور سجاوٹ چاندی کے اوراق کا زیور پہنے سجی تھیں، مٹی کے تیل کے کوکر کی شکل کا ایک ریڈیو اپنی پھٹی ہوئی آواز کے باوجود رفیع کا گانا چیخ چیخ کر گا رہا تھا۔ سامنے ترکاری اور پنساری کی دکان تھی۔ آخر الذکر پر سے برابر بچوں بچیوں کی ''اے حاجی صاحب چار آنے کا گھی دینا، اے حاجی جی چھ پیسے کا گڑ دو'' کی آوازیں آرہی تھیں اور صبا حیران تھی کہ اس مہنگائی کے زمانے میں واقعی چار آنے کا گھی اور چھ پیسے کا گڑ مل جاتا ہے یا کوئی خیالی چیز ان کی کٹوری اور ہاتھ پر رکھ دی جاتی ہے جسے وہ گھی سمجھ کر اپنی ہانڈی میں جھاڑ دیتے ہیں اور گڑ کی ڈلی سمجھ کر منہ میں رکھ لیتے ہیں۔ ابھی وہ اسی ٹھیلے کے نظارے میں کھوئی ہوئی تھی جس میں لکڑی کے بنے ہوئے مختلف بنے ہوئے خانوں میں پلاسٹک کے لال پیلے کھلونوں اور ربنوں پر چوٹیوں اور رنگین کمربندوں کے انبار تھے کہ ساس اندر داخل ہوئیں اور بڑی اپنائیت سے بولیں، ''دلہن کسی خاص چیز کو طبیعت چاہتی ہو تو پکوا دوں۔''

پلٹ کر اس نے ساس کو دیکھا اور مارے گھبراہٹ کے ہکلانے لگی۔ ''جی نہیں، جو گھر میں پکے گا، کھالوں گی۔ کسی قسم کا تکلف نہ کیجیے گا۔'' ان کے چہرے کی مایوسی سے

Marfat.com

ان کے جانے کے بعد اسے سوجھا کہ وہ دراصل کیا پوچھنا چاہتی تھیں۔ کوئی خاص چیز؟ مرچیں مصالحوں والی، کھٹی کھٹی۔

توبہ ان ساسوں کا بس نہیں چلتا کہ ان بہوؤں کو انڈے سینے والی مشینوں کی طرح استعمال کر کے کھٹا کھٹ بچے نکالیں اور بلب کی گرمی پہنچانے کے بجائے اپنے پوٹے تلے دبالیں۔ ارمان ہو تو ماں باپ کو ہو، ان کو کس بات کا ارمان جب پہلے ہی پوتا پوتی چاروں طرف مرغی کے بچوں کی طرح رُلتے پھر رہے ہیں۔ حد ہے دل بھی تو نہیں بھرتا ان کا...

دوپہر کے کھانے کے بعد اسے سارے عزیز رشتے داروں اور محلے میں اس طرح فخریہ پھرایا گیا جیسے وہ جانوروں کی نمائش سے تازہ خریدی گئی بھوری بھینس تھی۔ ساس کچھ شرمساری تھیں کہ وہ سادہ سی ایک ساری باندھے تھی۔ نہ بھاری کپڑے نہ زیور، پہلی دفعہ ''بڑے گھر کی بیٹی'' کو یوں ننگی بوچی دیکھ کر لوگوں پر ''بڑے گھر'' کا کچھ اچھا اثر نہ پڑے گا یہ سوچ کر وہ ہر گھر میں باقاعدہ اس بات کی وضاحت کرتی جاتیں کہ وہ صرف ایک دن کے لیے آئی ہے اور ساتھ کوئی سامان نہیں لائی ہے۔ آس پاس کے محلے کے بچے تک ان کے ساتھ جلوس کی طرح ایک گھر سے دوسرے گھر میں جاتے۔ ہر گھر میں حسب توفیق پان چھالیا، چائے بسکٹ اور پھلوں سے اس کی تواضع ہوتی گئی۔ سب جگہ گھوم پھر کر جب وہ واپس اوپر پہنچی تو واقعی تھک چکی تھی۔ اس نمائش میں اسے پسند کیا گیا یا ناپسند، اسے پتا نہ چل سکا مگر اتنا تھکنے کے بعد اب اس کو اس کی پرواہ بھی نہ تھی۔ چناں چہ جوتے اتار کر وہ اس تاریخی مسہری پر لیٹ کر بجھے بجھے دل کے ساتھ یہ سوچتی رہی کہ اسد نے اسے اپنے گھر کے حالات سے اس قدر تاریکی میں کیوں رکھا تھا۔ شادی کے بعد وہ ہنگامے سے دور رہنے کا بہانہ کر کے اسے یہاں نہ لایا تھا اور اب بھی اسے مکان نہ ملنے کا عذر پیش کر کے روکنے کی کوشش کی تھی۔ کیا وہ اتنی غیر تھی، حالاں کہ اپنے بڑے گھر کا حال پہلے ہی رات کو وہ اسد کو سنا چکی تھی۔ غیریت اور تکلف کی یہ دیوار غیر محسوس طور پر انھیں یوں دور لیے جا رہی تھی جیسے جہاز لنگر اٹھانے کے بعد آہستہ آہستہ ساحل سے دور ہو جاتا ہے، خاموشی سے، نامعلوم طور پر۔

شام کو جب گھر کے مرد اپنے اپنے کاموں سے لوٹے تو اس غیر متوقع مہمان کی

Marfat.com

آمد کی خبر انھیں سنائی گئی۔ مرد عورتوں کی نسبت اس سے کم مرعوب ہوئے۔ چناں چہ وہ اسد کے بھائی سے جن کا ذکر اسد نے کئی مرتبہ کیا تھا، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ شام کی چائے کم تکلف اور زیادہ صفائی سے پی گئی۔ اس وقت اسے لاہور کے تاریخی مقامات دکھانے کی پیش کش کی گئی مگر وہ اس خیال سے ہی کانپ گئی کہ اس سلسلے میں جانے کیا اہتمام اور لے دے ہوگی۔ اور جلدی سے بولی، وہ ساری جگہیں دیکھ چکی ہے۔ مہمان نوازی کے شوق میں پکچر دکھانے کی فرمائش کی گئی جسے اس نے مجھے زیادہ شوق نہیں کہہ کر ٹالا اور باقی وقت جس کسی سے بن پڑا خاندان کے حالات کرید کرید کر پوچھتی رہی حالاں کہ عام خیال تھا کہ اسے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہوگی۔ اس وقت اس نے ہر ایک کے بچوں کی تعداد اور نام بھی معلوم کیے۔ تب اسے معلوم ہوا کہ اَن جانے میں وہ کھلونے محلے کے کئی ایسے بچوں کو دے گئی جو انھیں دیکھنے کے شوق میں آگے بڑھ آئے تھے۔ کسی نے اسے ذرا سا بھی اشارہ نہ دیا کہ وہ غلطی کیے جارہی ہے۔ آخر ان کی صورتوں پر تو نہ لکھا تھا کہ وہ اس کے بھانجے بھتیجے ہیں۔ اسد کے بھائی نے کلیم کے جھگڑوں اور دقتوں کے بارے میں بھی بتایا اور کچھ اڑتا اڑتا اشارہ گھر کی مالی حالت کے متعلق دیا، یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہوگیا۔ کمرے کی بڑی سی میز جس پر اَن گنت کتابیں اور رسالوں کا ڈھیر تھا، صاف کی گئی۔ اور اس پر سفید چادر ڈال کر کھانا رکھ دیا گیا۔ اور سب اس کے گرد کرسیوں اور مونڈھوں پر بیٹھ کر بڑے تکلف سے کھانا کھانے لگے۔ کھانے میں نزدیک کی کسی دکان کے ڈھیروں مصالحے والے کباب اور مٹھائی بھی تھی۔

سونے کی جگہ اسے اسی تاریخی مسہری پر ملی۔ رات کو جب وہ کپڑے بدل چکی تو اس نے ایک بچی سے غسل خانے کا پتا پوچھا، بچی نے باہر صحن کی ایک نالی کی طرف اشارہ کردیا جہاں لوٹے میں پانی بھر کر سارا گھر منہ دھوتا تھا۔ جب صبا نے ذرا وضاحت کی تو اسے ایک اور زینے کا راستہ بتا دیا گیا جس پر سے اوپر چڑھ کر وہ منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی تھی۔ گو اس وقت ہلکی سی چاندنی تھی مگر زینے کے اندر اندھیرا تھا۔ ٹٹول کر دیوار کے سہارے بہ مشکل وہ اوپر پہنچی۔ آسمان پر تاروں کا جال بچھا ہوا تھا اور وہ چاندنی جو لانبے درختوں، ستھرے گھاس کے قطعوں، پرسکون پانیوں پر اس قدر جاذبِ نظر دکھائی دیتی تھی، آج دور نزدیک کے بوسیدہ مکانوں کے شکستہ چھجوں، ٹوٹی منڈیروں اور سیلے کچے فرش پر

Marfat.com

عجیب بھیانک نظر آ رہی تھی۔

صبا حیران تھی کہ صبح کے وقت یہ بھرا پرا کنبہ اس ایک ٹوٹی منڈیر کے غسل خانے سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہوگا، خصوصاً مکان کی چھت پر جب کہ آس پاس کئی مکان اور بھی تھے۔ اس قسم کی باتیں سوچتی جب وہ واپس لوٹ رہی تھی تو دفعتاً ایک عجیب وغریب چیز نے جانے کہاں سے نکل کر اس کا راستہ روک لیا۔ چاندنی میں عورت کا بھوت سا اسے نظر آیا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، بال بکھرے ہوئے، سفید پپوٹوں میں اس کی سیاہ بڑی بڑی پتلیاں صبا کو گھور رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھے یہ واہمہ ہے یا حقیقت، ایک گرج دار آواز گونجی، ''خبردار جو ایک قدم آگے بڑھایا۔'' اس واہمے کو حقیقت پا کر زور سے اس کی چیخ نکل گئی۔ قریب تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جائے کہ اس نے ایک قدم پیچھے سرک کر دیوار کا سہارا لیا۔ پھر چند لوگ بھاگتے ہوئے اوپر آئے اور صورتِ حالات کو سنبھالا۔ نند نے اس کے کان میں کہا، ''گھبراؤ نہیں، یہ تو تائی اماں ہیں۔'' پھر اس کے تھر تھر کانپتے بدن کو سہارا دے کے نیچے اتارنے لگیں۔ اندھیرے زینے پر سے ٹھوکریں کھاتی وہ نیچے اتریں۔ لکڑیوں، جوتوں اور برتنوں سے ٹکراتی کمرے میں آئیں۔ ابھی تک اس کے قدم لرز رہے تھے، دل دھڑک رہا تھا اور ہتھیلیاں پسینے سے تر تھیں۔ نند اسے مسہری پر لٹا کر چلی گئیں، وہ خاموشی سے آنکھیں پھاڑے چھت کو تکتی رہی پھر ساس آ کر اسے سارا قصہ سناتی رہیں۔ یہ تائی اماں باہر مراقبے میں بیٹھے رہنے والے تایا کی پانچویں بیوی تھیں۔ چار پہلے اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں اور اب ان کا دماغ جانے کیسے الٹ گیا تھا۔ وہ کپڑے پھاڑ، بال نوچ چھت پر نکل گئی تھیں۔ زیادہ تر وہیں رہتی تھیں۔ سارا دن خود سے باتیں کرنا، پاس پڑوس کی عورتوں سے مانگ کر کھا لینا اور ہر ایک سے یہ شکایت کہ کوئی انھیں کھانے پینے کو نہیں دیتا، ان کا روزمرہ تھا۔ تایا جب ان کی بڑبڑاہٹ سے بہت زیادہ عاجز آ جاتے تھے تو ان کو اٹھا کر پیٹ ڈالتے تھے جس پر یہ سارا محلہ سر پر اٹھا لیتی تھیں۔ راہ چلتے انھیں آدھا دھڑ نکال کر جھانکتا دیکھ کر جب مڑ کر دیکھتے تھے اور ایسی ویسی بات سمجھ کر بار بار اِدھر سے گزرتے تھے تو انھیں ایک کوٹھڑی میں کئی کئی دن کے لیے بند کر دیا جاتا تھا۔

''کوئی علاج بھی کیا؟'' اس کی آواز اب تک کانپ رہی تھی۔

''ہاں...'' انھوں نے بے دلی سے کہا۔ ''کئی حکیم ڈاکٹروں کو دکھایا۔ تعویذ گنڈے بھی کیے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔''

''ان کے بچے وغیرہ کہاں ہیں؟'' اب وہ کچھ سنبھل چکی تھی۔

ان کے بچے تو ہیں نہیں۔ سوتیلے بچے ہیں جو عمر میں ان سے بھی بڑے ہیں، وہ انھیں رکھتے نہیں۔ ماں باپ بھی مر چکے ہیں۔ ان کا دنیا میں ہم لوگوں کے سوا کوئی نہیں۔ بھائی ان کی حالت دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ وہ خود مریض ہیں کیا کریں۔'' اور پھر یکایک ان کی آواز میں رقت آ گئی۔ وہ بولیں، گھر کی حالت تم دیکھ ہی چکی ہو۔ اب تم سے کیا چھپانا ہے۔ اتنے بڑے کنبے میں صرف دو دم کماتے ہیں۔ ان کی تنخواہوں میں کھانے کا مشکل سے پورا ہوتا ہے، پھر کپڑا لتا ہے، بچوں کی فیسیں ہیں، اوپر کے خرچ ہیں۔ اب بیماریوں پر انسان کہاں سے خرچ کرے۔ ایک زمانہ تھا جب اسد کے باپ زندہ تھے تو میرے ہاتھ میں بھی فراغت تھی۔ یہ نہیں کہ ہزاروں کا کاروبارہ تھا مگر سفید پوشی سے گزارا ہو رہا تھا لیکن اب تو وہ بھی مشکل ہو گیا۔ ایک دفعہ تنگ آ کر اسد کو لکھا تھا کہ کچھ پیسے ہر مہینے بھیج دیا کرو تو اس کا بھی معذوری کا جواب آ گیا۔ ہاں بیٹی میں نے مانا کہ تم بڑے گھر کی بیٹی ہو، تمھارا ہاتھ کھلا ہے، تمھارے اخراجات زیادہ ہیں مگر کیا ہمارا اسد کے پیسے پر کوئی حق نہیں۔''

''مگر میں... میں نے تو کبھی منع نہیں کیا۔'' وہ گھبراہٹ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''تم نے منع نہیں کیا ہوگا...'' وہ بے یقینی سے بولیں، ''پر اسد نے یہی لکھا...''

اس رات وہ بہت بے چین نیند سوئی۔ پہلے ساڑھے دس بجے تک ''غریب نواز'' ہوٹل میں ریڈیو بجا کیا۔ پھر رات گئے تک چھکڑوں اور تانگوں کی آوازوں نے ذہن پر تہلکہ مچائے رکھا۔ پھر جب بھی اس کی آنکھ لگی کبھی پھٹے چیتھڑوں والی کوئی چڑیل آنکھیں پھاڑے اس سے لپٹ گئی، کبھی دنیا بھر کے بچے اس کے چاروں طرف ناچنے لگے، کبھی زمانے بھر کے بوڑھے کمبلوں پر اکڑوں بیٹھے مراقبے میں کھوئے رہے اور وہ ان کے درمیان سے نکلنے کی کوشش میں چاروں طرف گھومتی رہی، ابھی پوری طرح اس کی آنکھ نہ لگنے پائی تھی کہ گلی بیدار ہو گئی، کھنکارنے، تھوکنے کی آوازیں، گاڑی کے پہیوں، من چلوں کے گانوں کی آوازوں نے بیداری کا پیغام سنایا۔ پھر بھی وہ بنی پڑی رہی تو غریب نواز ہوٹل کا ریڈیو ایک دم ہی کراہ کر چلا اٹھا... گھر کی چہل پہل اور اٹھک بیٹھک شروع ہوئے

Marfat.com

بھی دیر ہو چکی تھی، اس لیے وہ بھی اٹھ بیٹھی... صبح کے کام اوپر کی منزل سے شروع ہو کر نچلی منزل میں جا کر ختم ہوتے تھے۔ نچلی منزل میں ایک نل تھا جس میں شبنم کی طرح پانی ٹپکا کرتا تھا۔ جو لوگ نالی پر منہ دھونا پسند نہ کرتے تھے، اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر وہاں ہاتھ منہ دھولیا کرتے تھے۔ چناں چہ کمر کس کر سب سے پہلے تو صبا نے رات کے کپڑے تبدیل کیے کہ ڈریسنگ گاؤن میں گھر بھر میں گھومنا دوبھر معلوم ہوا۔ پھر بکھرے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا اور ہر چہ بادا باد کہہ کر دوسروں میں آن ملی، باورچی خانے میں گئی تو ''اے یہاں کہاں آگئیں دھویں میں'' کہہ کر نکالی گئی۔ اوپر جانے میں تائی اماں کے خوف سے جان نکل رہی تھی، اب کے اگر ٹیٹوا ہی دبا دیا تو وہ کیا کرے گی۔ حالاں کہ سب اسے یقین دلا چکے تھے کہ وہ مارتی پیٹتی نہیں صرف زبان چلایا کرتی ہیں۔

خدا خدا کر کے یہ سارے مرحلے طے ہوئے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر تائی اماں کو اتارا گیا تا کہ ان کا حلیہ درست کیا جائے۔ ایک باقاعدہ جنگ کے بعد ان کے کپڑے بدلے گئے اور کھینچ کھینچ کر بال گوندھے گئے۔ عورتوں کے ہاتھوں سے نکلتے ہی وہ تیر کی طرح اوپر لپکیں اور لگیں چلا چلا کر ہر ایک کو کوسنے، سب سے پہلے انھوں نے اپنا دوپٹا ہوا میں اڑا دیا جو پتنگ کی طرح تیرتا ہوا نچلی منزل میں جا گرا۔ پھر انھوں نے اللہ میاں سے لے کر اپنے خداوندِ مجازی کی شان میں وہ باتیں کہیں کہ سب نے اپنے کان بند کر لیے... یک بارگی ہی مراقبے میں کھوئے ہوئے تایا اپنے چپل تلاش کر کے زینے کی طرف جھپٹے۔ بہ مشکل تمام ان کی دیورانی اور بہوؤں نے انھیں پکڑا کہ وہ تو پاگل ہیں، آپ کیوں ان کے ساتھ دیوانے بنے جاتے ہیں... صبا جو اٹھ کر وہاں سے بھاگی تو سیدھی اسی کمرے میں رکی جہاں وہ پکچر کے سین کی طرح سڑک کے مناظر دیکھتی تھی۔ غریب نواز ہوٹل میں وہی چہل پہل تھی۔ گڑ اور گنڈیریوں پر وہی مکھیوں کی دعوت، وہی ٹھیلے اور تانگے والوں کا شور، وہی میلے کچیلے ننگے پاؤں بچے، چھوٹی چھوٹی لڑکیاں تقریباً اپنے برابر کے بچوں کو کولھے پر ٹکائے اِدھر سے اُدھر پھر رہی تھیں۔ مرد بد رنگ شلواروں اور چادروں میں ہاتھ دیے مچھروں اور پسوؤں کی جائے شرارت کو کھجانے اور گپیں ہانکنے میں مصروف تھے۔ بوڑھے چارپائیوں پر بیٹھے حقے کے دم لگا رہے تھے۔ ''ان لوگوں کو کتنی فرصت ہے۔ ابھی صبح ہوئی ہے مگر جیسے انھیں کوئی کام ہی نہیں۔ تبھی تو اتنی غلاظت اور غربت ہمارے ملک میں ہے۔''

اس نے سوچا اور پھر اس کے دل میں کوئی مچلا، ''تمھیں بھی تو کوئی کام نہیں ہے۔ تم نے اس ملک کی غلاظت اور غربت کو کم کرنے کے لیے کیا کیا ہے؟...'' وہ بہت کچھ کرنا چاہتی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ان سب لوگوں کے لیے کیا کرے۔ اس کے اپنے سسرال میں لوگ ذہنی اور جسمانی مریض تھے۔ حفظانِ صحت کے اصولوں کے عین برعکس زندگی گزار رہے تھے۔ بچے پرورش پانے کے بجائے مرغی کے بچوں کی طرح صرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی پرورش اور تربیت کرنے کی کسی کو فرصت ہی نہ تھی... چاروں طرف کے گھروں کے درمیان ایک بے چھت کا کمرہ تھا شاید اس کی چھت کسی زمانے میں گر گئی تھی۔ ہر روز سارے گھروں کا کوڑا، تمام باورچی خانوں کے انڈے اور ترکاریوں کے چھلکے اور ہر طرح کے چیتھڑے وہاں پھینک دیے جاتے تھے۔ پہلے دن سے لے کر آج تک کا کوڑا وہاں جوں کا توں محفوظ تھا۔ اس تمام غلاظت اور گندگی کے باوجود یہاں لوگ رہتے تھے، کھاتے پیتے تھے، زندہ تھے اور شاید خوش بھی ہوں... پھر غریب نواز ہوٹل کی صبح سے شام تک نکوٹین میں پکتی ہوئی چائے، کبھی نہ دھلنے والی دیگوں میں پکا ہوا سالن پکا کر زمین یا زمین سے بھی میلی دری پر رکھی جانے والی تندور کی روٹیاں، مردہ جانوروں کے سڑے گوشت کی بو چھپانے کے لیے ڈھیروں مصالحے والے کباب، وہ ان سب کا کیا کرے...

یہی سوچتے ہوئے اس کی نظر کار پر پڑی جو نہایت آہستہ روی سے گلی کے نکڑ پر کھڑی ہوگئی۔ پلک جھپکتے میں چاروں طرف سے بچے شہد میں چمٹنے والی مکھیوں کی طرح اس کو گھیر کر کھڑے ہوگئے۔ ڈرائیور اتر کر گھر کی طرف بڑھا۔ تب اس نے سوچا کہ وہ ان سب سے رخصت ہوکر چلی جائے یا یہاں ٹھہرے۔ اسے یقین تھا کہ وہ سب اور چند دن رکنے پر اصرار کریں گے مگر جب اس نے جانے کا ذکر چھیڑا تو کسی کی طرف سے کوئی اصرار نہ ہوا۔ شاید وہ ان سب کے ذہنوں اور جیبوں پر ایسا بوجھ تھی جسے وہ ایک دن سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتے تھے۔

چلنے سے پہلے صبا نے پرس میں جتنے نوٹ تھے، بغیر گنے اپنی ساس کے حوالے کر دیے۔ ایک بھانجی نے خوشی خوشی اس کا سوٹ کیس اٹھا لیا، جٹھانی ایسے گلے ملیں جیسے اس کی بیماری مدت ہوئی ختم ہوگئی ہو۔ ساس نے اسے گلے لگانے کے بہانے اپنے موٹے گدے دار جسم سے بھینچ کر جدا کیا اور سب عورتیں بھی اسے دروازے تک چھوڑنے آئیں۔

Marfat.com

محلے کے بچے پھر اسی طرح گھر کے بچوں میں گھل مل گئے کہ پہچان مشکل ہوگئی اور اس وقت اس نے دیکھا کہ تائی اماں غصے میں بھری، کپڑے اسی طرح چندی چندی کیے، بال بکھیرے آئیں اور زور سے چلائیں، ''خبردار جو ایک قدم بھی آگے نکالا، قطامہ، تیرا برقع کہاں ہے۔'' بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بھابیوں نے مارے شرم کے منھ پر ہاتھ رکھ لیے۔ ساس نے انھیں اوپر لے جانا چاہا تو وہ ان کے ساتھ الجھ گئیں اور صبا سلام کر کے تیزی سے قدم بڑھاتی کار کی طرف چل دی۔ اس وقت عذرا کے ڈرائیور کے چہرے پر ایسی خوف ناک مسکراہٹ تھی جیسے اس نے صبا کو ننگا دیکھ لیا ہو، اسے بڑے آدمیوں کے گھر کی حالت بالکل اس چوبارے کی سی لگی جس میں اس کا اپنا کنبہ رہتا تھا۔

OOO

Marfat.com

۹

جس وقت صبا کوئٹہ جانے کے لیے عذرا کے ساتھ گھر سے روانہ ہوئی باقی لوگ برج کھیل رہے تھے۔ شاہد اور عذرا کی آپا پارٹنر تھیں، ان کے میاں اور کوئی دوست۔ اس عرصے میں صبا یہ دیکھ چکی تھی کہ یہ لوگ برج کے کسی قدر دھنی تھے۔ اس وقت بھی کھیل بہت ہی ایکسائٹنگ قسم کا تھا۔ صبا کو خدا حافظ کہنے کے لیے وہ ذرا کی ذرا بے دلی سے کھڑے ہوئے، ''ارے اتنی جلدی کیوں جا رہی ہو؟'' آپا نے پتوں سے نظر ہٹا کر کہا۔

''ذرا بازار ہوتے ہوئے جائیں گے۔'' عذرا نے کہا۔

ابھی وہ سلام اور خدا حافظ کے بعد بہ مشکل کمرے سے نکلی ہوں گی کہ وہ اپنے پتوں میں دنیا ومافیہا کو بھول چکے تھے۔

''تم برج نہیں کھیلتیں؟'' صبا نے عذرا سے پوچھا۔

''نہیں... اگر میں اور آپا دونوں ہی کھیلنے لگیں تو گھر کا کباڑا ہوجائے اور پھر مجھے ایسی چیزوں کا شوق بھی نہیں۔''

''تمھارے ان کو تو ہے۔''

''ان کو میں کبھی منع بھی نہیں کرتی۔ اب تو میں اس کی اتنی عادی ہوگئی ہوں کہ ان لوگوں کو خالی بیٹھے دیکھ کر دل چاہتا ہے تاش سامنے لا کر رکھ دوں۔''

یوں ہی ذرا کی ذرا بازار کا چکر لگا کر جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئیں تو اس کے چلنے میں ابھی خاصی دیر تھی۔ کمپارٹمنٹ میں کوئی اور نہیں تھا، عذرا اس وقت ہمیشہ سے زیادہ سنجیدہ تھی۔ وہ بولی، ''صبی، اسد کی اور اپنی شخصیت کے اختلاف کے بارے میں جو کچھ تم

Marfat.com

نے کہا تھا کیا تم اس کی وضاحت کرسکو گی، میں اسے پوری طرح نہیں سمجھ پائی۔"
"یوں سمجھو عذرا کہ شادی کے فوراً بعد سے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم دونوں کے درمیان کوئی غیر مرئی پردہ ضرور ہے۔ میں اسے شروع میں نہ سمجھ سکی مگر رفتہ رفتہ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ میری اور اسد کی شخصیت کا بنیادی فرق ہے۔ میں میاں بیوی کے درمیان قطعی بے تکلفی کی قائل ہوں اور وہ کچھ باتیں چھپانا ضروری سمجھتے ہیں۔ میں اپنے ماضی کو، پرانے تعلقات کو خواہ وہ اچھے ہوں یا برے، ظاہر کرنے میں عیب نہیں سمجھتی، وہ اسے دنیا کا سب سے بڑا عیب خیال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں کئی دفعہ ہماری بحث ہوئی جس کا نتیجہ سوائے اسد کے موڈ خراب ہونے کے کچھ اور نہیں نکلا۔ وہ اپنی تہذیب اور کلچر سے زیادہ مغربی کلچر کے دل دادہ ہیں اور بچوں کی اسی ڈھنگ پر پرورش کرنا چاہتے ہیں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن کو انسان صرف محسوس کرسکتا ہے، بیان نہیں کرسکتا۔"
"ہاں اکثر ایسا ہوتا ہے صبی۔ دو الگ شخصیتیں، مختلف حالات کی پیدا کردہ ہستیاں آکر ساتھ مل جاتی ہیں اور دریا میں بہنے والی لکڑیوں کی طرح ساتھ بہنے لگتی ہیں۔ صرف دو سہارے ہیں صبی، وقت اور محبت۔ وقت گزرتا جائے گا اور اگر ایک دوسرے سے محبت ہے تو آپس کے یہ اختلافات کم ہوتے جائیں گے۔"
"تم نہیں جانتیں عذرا... اور نہ مجھے اب تک یہ اندازہ تھا کہ وہ مجھ سے اس حد تک پردہ داری برتیں گے... اجی، تم اندازہ نہیں کرسکتیں کہ اسد کے گھر والوں کو دیکھ کر مجھے کتنا دکھ ہوا۔ اسد نے کبھی مجھے ہلکا سا اشارہ بھی نہیں دیا کہ انھیں کوئی پریشانی ہے، بلکہ دوسروں کے ساتھ اس کی باتوں سے ہمیشہ یہی اندازہ ہوا کہ وہ خوب فارغ البال ہیں۔"
"کیوں کیا ہوا؟" عذرا نے پوچھا۔
"اجی.. وہ ہم لوگوں سے بالکل مختلف ماحول میں، بڑی تکلیف سے زندگی گزار رہے ہیں۔"
"اچھا؟... یہ سن کر بڑا افسوس ہوا..." عذرا نے دھیرے سے کہا۔
"اس دن سے میں ایک رات بھی چین کی نیند نہیں سوئی۔ میں خود کو مجرم سا محسوس کرتی ہوں..."
"وہ اس ماحول کے عادی ہوں گے، انھیں احساس بھی نہ ہوگا، تم خواہ مخواہ اتنا

Marfat.com

دل کو لگا رہی ہو...'' عذرا نے کہا۔

''جو جس ماحول میں رہتا ہے اس کا عادی ضرور ہوتا ہے مگر... یہ کوئی معقول جواز نہیں ہے...'' دفعتاً وہ تیزی سے کہنے لگی، ''اجی میں کچھ کرنا چاہتی ہوں، کیا کروں سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ہم اس ملک کی غربت، غلاظت، بچوں کی تربیت اور عام لوگوں کی حالت سدھارنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ بولو نا...''

''کیوں نہیں کر سکتے مگر اس کے لیے مخلص لوگوں کی ضرورت ہے۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھونک سکتا... مگر تم اکیلے بھی بہت کچھ کر سکتی ہو۔''

دفعتاً عذرا نے اپنے سنجیدہ موڈ کی کینچلی اپنے مخصوص شگفتہ انداز سے بدل کر کہا، ''ایک ایسا سپوت پیدا کرو جو تمھارے ملک کے سارے دلدر دور کر دے۔ ہم زیادہ سے زیادہ دس پانچ بچیوں کو پڑھائیں گے، بدنامِ زمانہ ''اپوا'' میں شامل ہو کر ویلفیئر کا ذرا سا کام کر دیں گے یا کسی اسکول میں کھپ جائیں گے مگر یہ تو اور بھی بہت لوگ پہلے ہی کر چکے ہیں، بنیادی چیزوں کو تو کوئی نیا خون ہی بدل سکتا ہے۔ تم ان کی تخلیق کی فکر کرو۔''

عذرا کے موڈ کی یہ شگفتگی بھی صبا کو خوش نہ کر سکی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولی، ''عذرا لوگ کہتے ہیں ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد ملک کی حالت سدھر رہی ہے۔ کیا یہ بات ٹھیک ہے، دیکھنے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔''

عذرا نے سنجیدگی سے جواب دیا، ''اگر زخم اندر سے بھرنا شروع ہو جائے تو سمجھ لو وہ ٹھیک ہو رہا ہے، ایک نہ ایک دن اس پر نئی کھال بھی چڑھ جائے گی۔ برسوں کے پرانے سڑتے ہوئے ناسور پر ایک دم نئی جلد دیکھنے کی تمنا مت کرو، صبی۔''

''کئی دفعہ میں سوچتی ہوں اجی کہ میں نے آرٹ پڑھ کر وقت ضائع کیا۔ اگر میں سائنس پڑھ کر میڈیسن کر لیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ آج کل ڈاکٹروں کے نخرے اور ان کی حالت دیکھ کر میری جان جلتی ہے۔ اب بھی موقع ملا تو میں میڈیسن ضرور کروں گی۔''

اس کے لیے تمھیں میٹرک کے بعد کی پڑھائی پھر سے کرنی ہوگی، میڈیسن کے پانچ سال علاحدہ اور بوڑھے طوطوں والی مثل تو تم نے سنی ہی ہوگی۔

''میں اس مثل کو نہیں مانتی۔ سچی طلب ہو تو بوڑھے طوطے بھی پڑھ سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتے۔ ایسی صورت میں کچھ بھی کرنا

Marfat.com

ناممکن ہے۔ تم البتہ کرسکتی ہو۔"

"میڈیسن ویڈیسن تو بابا میرے بس کا نہیں، ہاں ایک زمانے میں ویلفیئر ورک میں نے بھی شروع کیا تھا مگر عورتوں کے آپس کے جھگڑوں اور شو آف سے تنگ آ کر چھوڑ دیا اور اب تو مجھے اپنے اور آپا کے بچوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔"

"تمھاری آپا کو ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں۔"

"ان کی قسم ہی دوسری ہے۔" عذرا نے کہا۔ پھر برتھ پر سر پیچھے ٹکا کر یک لخت وہ بولی، "صبی کیا تم نے ہمارے گھر میں کوئی چیز محسوس نہیں کی؟"

یہ سوال اتنا اچانک تھا کہ صبا گھبرا گئی، "نہیں تو... کیا چیز؟"

"کوئی نئی بات، دوسرے گھروں سے مختلف۔"

"ہاں کی تو ہے۔ تم لوگ دوسروں کے مقابلے میں آپس میں زیادہ بے تکلف ہو، ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہو، اسی لیے تمھارے گھر میں زیادہ سکون اور اطمینان اور خوشی ہے۔"

"اچھا... بس تم نے یہی محسوس کیا ہے اور کچھ؟"

"اور کچھ نہیں..."

"کیا تمھیں یہ بات انوکھی نہیں لگی کہ میں آپا کے بچوں کو پالتی ہوں، وہ ہر وقت بنی ٹھنی رہتی ہیں اور میں چڑیل کی سی شکل بنائے رکھتی ہوں۔ میں اپنے میاں سے زیادہ سے زیادہ دیر الگ رہتی ہوں اور وہ تینوں زیادہ سے زیادہ دیر ساتھ رہتے ہیں...؟"

صبا بھونچکی سی رہ گئی۔ "ہاں یہ بات میں نے محسوس کی تھی مگر اس کو میں تم دونوں کی محبت اور طبیعت سمجھی۔ میاں سے الگ رہنے کی وجہ میں خود کو سمجھتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ میں چلی جاؤں گی تو تم بھی اسی طرح ان میں گھل مل جاؤ گی..."

"یوں نہیں ہوتا صبی۔ میں ہمیشہ ان لوگوں سے دور رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اس لیے میں خود کو ایسے کاموں میں الجھائے رکھتی ہوں جن سے بہ ظاہر مفر ہی نہ ہو... صبی! میں نے تم سے کہا تھا کہ دل کی بات ایک شخص کو ضرور بتا دینی چاہیے، میں یہ تمھیں بتا رہی ہوں... یہ باتیں خط میں لکھنے کی نہیں ہوتیں، اس لیے میں نے تمھیں کبھی نہیں لکھا، نہ آئندہ لکھوں گی مگر ایک مرتبہ میں تمھیں سب کچھ بتا کر اپنا دل ضرور ہلکا کروں گی۔"

Marfat.com

''ہاں ہاں ضرور کہو عذرا۔ تمھاری بات میرے دل میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔''

''بات یہ ہے کہ آپا اور شاہد ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے بلکہ اب بھی کرتے ہیں۔''

''ہیں...'' صبا منھ پھاڑ کر رہ گئی۔

''یہ بہت دنوں کی بات ہے صبی، جب تمھارے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ شاہد ہمارے ہاں آیا جایا کرتے تھے، پھر وہ لندن چلے گئے مجھے آج تک نہیں معلوم کہ ان دونوں کی شادی کیوں نہ ہوسکی، نہ ہی میں نے کبھی پوچھنے کی ہمت کی... ہم دونوں بہنوں کی منگنی بچپن میں ہوگئی تھی، ممکن ہے آپا اس شادی کے خلاف جہاد کرنے کی ہمت نہ رکھتی ہوں یا انھوں نے کچھ کہا ہو تو اس کی شنوائی نہ ہوئی ہو۔ بہرحال اگر کچھ ہوا تو بڑے چپ چپاتے ہوا۔ کسی کو معلوم نہیں ہوسکا۔ شاہد لندن چلے گئے، جانے سے پہلے میں نے اپنی کھڑکی سے دو سایوں کو آخری بار لپٹتے اور جدا ہوتے دیکھا۔ آپا کی شادی ان کے منگیتر سے ہوگئی۔ پھر جیسا کہ تمھیں معلوم ہے میرے منگیتر نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کردیا۔ ہمارے ہاں مردوں کو تو یہ حق حاصل ہے نا... اب میرے رشتے کا چکر چلا۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے صبی! عورتیں آتی رہیں، دیکھ کر جاتی رہیں۔ آپا کے مقابلے میں میری صورت شاید انھیں اور بھی کریہہ نظر آتی۔ اتنے لوگ دیکھنے آئے اور لوٹ کر سانس بھی نہ لیا کہ کنبے بھر میں باتیں بننے لگیں۔ لڑکیاں مجھے دیکھ کر چپکے چپکے ہنستیں۔ وہ تو میں بے شرم تھی جو بے حیائی کا لبادہ اوڑھے خود اپنی ہی حالت پر ہنستی رہی اور مذاق اڑاتی تھی لیکن اندر سے یہ غم مجھے بھی کھانے لگا۔ کچھ دن بعد میں نے دیکھنے والوں کے سامنے جانے سے صاف انکار کردیا۔ اس پر اور فضیحتا ہوا کوئی اور سمجھے نہ سمجھے آپا میرے دل کی حالت سمجھتی تھیں اور اکثر مجھے تسلی دیتی تھیں۔ صبی یہ تو میں کہوں گی کہ بچپن سے لے کر آج تک آپا نے ہر آڑے وقت میں مجھے پناہ دی ہے، وہ میری طرف سے اوروں سے لڑتی تھیں اور میری حرکتوں کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتی تھیں... وقت گزرتا رہا، اسی دوران شاہد لوٹ آئے اور ایک دن یہ خوش خبری کان میں پڑی کہ شاہد سے میرا بیاہ ہو رہا تھا۔ یہ خبر سن کر سارے کنبے میں جیسے بم پھٹ پڑا۔ ہر کوئی حیرت سے پریشان ہو اٹھا۔ مجھ پر ہنسنے والی لڑکیاں رشک سے جل اٹھیں۔ اس وقت مجھے... اندازہ ہوا کہ اس میں ضرور آپا کا کچھ

Marfat.com

ہاتھ ہے، ورنہ میں اچھی طرح جانتی تھی، شاہد مجھے اتنا پسند نہیں کرتے تھے، میری اور ان کی کبھی رسمی سی دو ایک باتیں ہوئی ہوں تو ہوئی ہوں، میں ان دنوں کم عمر تھی، ناسمجھ تھی۔ خوب صورت سے دولھا کا نام سن کر پھولی نہ سمائی۔ یہ سوچ کر کہ وہ تمام لوگ جو مجھ پر ہنستے تھے، اب کس طرح پیچ و تاب کھا رہے ہوں گے، میں دل ہی دل میں ہنستی اور خوش ہوتی۔ واقعی کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ مجھے اتنا خوش شکل، قابل اور امیر دولھا مل جائے گا۔

شادی کے بعد آہستہ آہستہ میں نے محسوس کیا کہ شاہد ابھی تک آپا کو بھولے نہیں ہیں۔ وہ ابھی تک ان کے دل و دماغ پر راج کرتی ہیں۔ انسان لاکھ چھپائے مگر اس کی نظریں اور غیر شعوری حرکتیں بہت کچھ کہہ جاتی ہیں، تب میں نے غور کیا کہ میری شادی جگ ہنسائی سے کچھ کم نہیں اور مجھ پر باجی کا وہ قرض ہے جو مجھے چکانا ہے۔ میں نے سر ہوکر آپا اور منے بھائی کو اپنے گھر رکھ لیا۔ میں ان کے بچوں کی اور ان کے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہوں، شاہد اور منے بھائی دونوں آپا کو چاہتے ہیں اور میں دور سے دیکھا کرتی ہوں۔ میں نے آپا کو اپنی باتوں سے اپنی حرکتوں سے بہت بلند کردیا ہے۔ انھیں دیوی کے مقام پر بٹھا دیا ہے۔ جس کی ہر کوئی پوجا کرتا ہے۔ وہ اوروں کی نظروں میں بھی بلند ہوگئی ہیں۔ منے بھائی کبھی ان پر کسی قسم کا شک نہیں کرتے کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ واقعی اس قابل ہیں کہ سب ان کا دل یوں ہاتھوں میں رکھیں اور ان کی بات پتھر کی لکیر بن جائے۔ اس بات نے آپا کو ذرا سا خود سر اور مغرور ضرور بنا دیا ہے مگر شاید میرے سوا کوئی یہ بات محسوس نہیں کرتا۔ سو بچپن سے اب تک اپنی پناہ میں رکھنے کا جو قرض میرے ذمے ہے، میں اس صورت میں اتار رہی ہوں، ہنس ہنس کر کسی کو ذرا سا شبہ بھی نہیں ہوتا کہ میرے دل میں کون سے ناسور پل رہے ہیں، صبیحی مگر میں بھی عورت ہوں، کبھی کبھی میرا دل ایک دم تڑپ اٹھتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی ویرانے میں بھاگ جاؤں۔ شاید کسی ایسے ہی لمحے میں تم سے میں نے وہ سوال کیا تھا۔"

"کون سا؟"

"وہ باغ کے پھلوں والا..."

"اچھا... اب میں سمجھی۔"

Marfat.com

''ہاں صبی... مجھے صرف یہی اندیشہ ہے کہ صورتِ حال کہیں زیادہ پیچیدگی اختیار نہ کرلے، کہیں دبے شعلے بھڑک نہ اٹھیں۔ کہیں اَن جانے میں کچھ ایسا نہ ہوجائے جس کی سزا ہم سب کو اور ہمارے بچوں کو بھی بھگتنا پڑے لیکن جو کچھ میں کرچکی ہوں، اب اس کا کوئی علاج میرے پاس نہیں، حالات کو اب میں وہاں نہیں لے جاسکتی جہاں سے وہ شروع ہوئے تھے، میں اکثر سوچتی ہوں اور سوچتی رہتی ہوں اور وقت یوں ہی گزرتا رہتا ہے اور مجھے صرف ایک یہی تسلی ہے کہ وقت گزر رہا ہے، اسی طرح گزر جائے گا۔''

''مگر یہ کسی مسئلے کا منطقی حل نہیں ہے عذرا۔'' صبا نے دھیرے سے کہا۔

''یہ منطقی حل نہیں ہے، میں جانتی ہوں مگر ساتھ ہی میں ہر غیر فطری چیز کے مر جانے پر، ختم ہوجانے پر یقین رکھتی ہوں صبی، اس قسم کی نفرت ہو یا محبت ہر چیز آخرکار طبعی موت مرجاتی ہے۔'' صبا خاموش بیٹھی انگلیاں چٹخاتی رہی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' عذرا نے پوچھا۔

''سوچ رہی ہوں کہ جو کچھ تم کررہی ہو، ہر ایک نہیں کرسکتا، میں بھی نہیں کرسکتی۔ تم بہت ہمت والی ہو۔''

''کسی کا قرض چکانا ہمت کی بات نہیں صبی، میری سمجھ میں اور کوئی ترکیب نہیں آئی۔ جب کبھی منے بھائی نہیں ہوتے، وہ دونوں باغ میں گھنٹوں بیٹھے باتوں میں مشغول رہتے ہیں اور میں گھر کی کسی کھڑکی سے دیکھا کرتی ہوں۔ اس وقت شاہد کی آنکھوں میں جو ہیرے کی سی دمک ہوتی ہے، میرے ساتھ باتوں میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ میں آپا کی بے بی کو اپنے پاس سلاتی ہوں۔ رات کو کبھی وہ اٹھ جاتی ہے تو شاہد اسے بہلاتے ہیں، چمکارتے ہیں، پیار کرتے ہیں، اس وقت مجھے کیا محسوس ہوتا ہے صبی، تم کبھی نہیں سمجھ سکو گی مگر میں اپنے دل کو مضبوط کرلیتی ہوں۔ جو راہ میں نے دوسروں کے لیے خود بنائی اور وہ اس پر چل پڑے، اب میں کیا کہہ کر انھیں واپس بلاؤں۔ صرف وقت آخری اور قطعی مرہم ہے...''

انجن نے سیٹی دی۔ اتنی دیر سے وہ مدہوش بیٹھی تھی، گرد و پیش سے لاتعلق... عذرا چونک کر کھڑی ہوگئی۔ صبا بھی اٹھ کھڑی ہوئی، خدا حافظ کہنے کے بجائے وہ ایک دوسرے سے لپٹ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ جو ہنستی کھلکھلاتی ملی تھیں،

Marfat.com

ایک دوسرے کے غموں کو سینے سے لگائے روتی ہوئی جدا ہوگئیں۔ عذرا نے رومال سے رگڑ کر اپنی آنکھیں اور گال صاف کیے اور نیچے اتر گئی۔ پلیٹ فارم پر وہ اپنی بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرانے کی کوشش میں دھوپ چھاؤں کا سا سماں پیش کر رہی تھی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو سیٹ پر بیٹھتے ہوئے صبا نے اپنے آپ سے کہا، "کاش مجھ میں بھی عذرا جتنی ہمت ہوتی۔"

OOO

Marfat.com

۱۰

اسٹیشن پر اسد، روبینہ اور بوبی اسے لینے آئے تھے۔ صبا کو اسد پہلے سے زیادہ سنجیدہ، روبینہ پہلے سے زیادہ فیشن ایبل اور بوبی ہمیشہ سے زیادہ پیارا لگا۔ اسد اور بوبی دونوں نئے سوٹ میں تھے، بوبی صبا کو دیکھتے ہی اس کے گلے میں جھول گیا۔ صبا نے پیار کیا، پھر اس نے اکڑ کر سیدھے کھڑے ہو کر فخریہ انداز میں کہا، ''ممی، میرا سوٹ؟''

''بڑا خوب صورت ہے۔'' صبا نے جھک کر ایک مرتبہ اور اسے پیار کیا۔

اسد نے بتایا کہ ہیرڈز لندن کے پاس سے کل ہی ان کا گفٹ پارسل پہنچا ہے۔

''تم تو لاہور سے خوب شاپنگ کر کے لائی ہو گی نا؟'' روبینہ نے کار میں بیٹھتے ہی سوال کیا۔

''نہیں، کوئی خاص نہیں۔ وہاں کیا ہے جو یہاں نہیں ہے۔'' صبا نے کہا۔

''یہاں کیا رکھا ہے، خاک...'' روبینہ نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا، ''کل میں اور اسد تمھارے لیے گھنٹوں ایک پریزنٹ ڈھونڈتے پھرے، کوئی ڈھنگ کی چیز ہے ہی نہیں۔ جیولری ہے تو گندی، پرس ہیں تو پرانے سڑے ہوئے، کپڑوں میں ذرا بھی ورائٹی نہیں ہے۔''

''ارے بھئی دکانیں بھری پڑی ہیں یہاں بھی۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے۔'' صبا نے کہا۔

''دکانیں تو کباڑی بازار کی بھی بھری ہوتی ہیں، اس سے کیا ہوتا ہے۔'' اسد نے کہا۔

Marfat.com

روبینہ اسد کی اس بات سے اتنی محظوظ ہوئی کہ دیر تک اپنے قہقہے کی پھوار برساتی رہی۔ ہوٹل چمنستان پہنچے تو وہ ہمیشہ کی طرح پرانا ہوتے ہوئے بھی نیا تھا۔ پرانے لوگ چلے گئے تھے، نئے نئے لوگ آ گئے تھے۔

''آج تمھارے آنے کی خوشی میں سارے گھر کی صفائی میں نے خود کی ہے۔''

روبینہ نے بتایا۔

''واقعی؟ شکریہ۔'' صبا نے کہا۔ غور سے دیکھنے پر اسے صفائی کے نام پر صرف نئے پردے اور چند جدید وضع کے گل دانوں میں پھول نظر آئے۔

''یہ سب تمھاری کارستانی ہوگی؟'' صبا نے کہا۔

''اور کیا...'' روبینہ ہنسی۔ ''پرانے پردے دیکھ دیکھ کر دل بھر گیا تھا۔ میں نے اسد سے کہا، بدلو انھیں اللہ، کوئی کہاں تک ایک ہی چیز دیکھے جائے۔''

''وہ اتنے پرانے بھی نہیں تھے۔'' صبا نے آہستہ سے کہا۔

صبا خاصے دن بعد گھر آئی تھی۔ وہ اسد اور بوبی سے کھل کر بات کرنا چاہتی تھی مگر روبینہ کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ رات کے کھانے کے بعد بھی وہ ان سب کے ساتھ لان میں آ کر بیٹھ گئی۔

''روبینہ آؤ تمھیں گھر چھوڑ آئیں، آنٹی فکر کر رہی ہوں گی۔'' آخر اسد نے کہا۔

''انھیں معلوم ہے، میں کہاں ہوں، فکر کی کیا بات ہے۔'' اس نے کہا مگر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر وہ سب روبینہ کو گھر چھوڑنے گئے جہاں رات گئے تک انھیں بیٹھنا پڑا۔

تیسرے دن صبا نے مہمان نوازی کے شکریے کا ایک خط عذرا کو اور ایک اپنی ساس کو لکھا۔ اس نے یہ دونوں خطوط اسد کو دکھائے۔ ساس کے نام خط دیکھ کر وہ چونکا۔

''کیا تم وہاں بھی گئی تھیں؟''

''ہاں...''

''کیوں؟''

''مجھے اچھا نہ لگا کہ اسی شہر میں رہتے ہوئے، ان لوگوں سے ملنے نہ جاؤں۔''

''ہونہہ...'' خاصی دیر تک وہ کسی سوچ میں گم خاموش بیٹھا رہا۔

''کیسے تھے سب؟'' آخر کار اس نے پوچھا۔

Marfat.com

''ٹھیک تھے۔'' صبا نے کہا، ''امی کچھ مالی پریشانیوں کا ذکر کر رہی تھیں اور یہ بھی کہ اگر تم کچھ روپیہ ہر مہینے بھیج دیا کرو...''

''بس یہ امی کا حال ہے۔ سارے جہاں کو سمیٹ کر اپنے گھر رکھ لیا ہے، کیا ہم نے ان سب کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟''

''مگر ان کا انتظام نہ ہوسکتا ہوگا اسد؟''

''انتظام کوئی کرنا چاہے تو ہو، جب مفت میں پکا پکایا کھانا عیش کرنے کو مل جائے تو کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے تکلیف اٹھاتا پھرے۔''

''اس گھر اور اتنے آدمیوں میں کوئی عیش بھی کرسکتا ہے؟'' صبا نے گویا برا مان کر کہا۔

''کیوں نہیں۔ وہ سب جو بھیا کی کمائی پر پل رہے ہیں، عیش نہیں کر رہے تو کیا کر رہے ہیں؟''

''آخر بھیا بھی تو سب کی مدد کرتے ہیں، تم کیوں نہیں کرتے۔''

''میرے اصول دوسرے ہیں، ان کے دوسرے... میں اپنا اور اپنے بچوں کا اسٹینڈرڈ اونچا کرنا چاہتا ہوں۔ کب تک ہم دوسروں کے لیے گندی نالی کے کیڑوں کی طرح پلتے رہیں۔ ہمارے باپ دادا اپنے ماں باپ کو دیتے رہے اور خود آخری وقت میں اپنے بچوں کے لیے بوجھ بنتے رہے۔ میں اس چکر کو توڑنا چاہتا ہوں، ہمارے پاس آخری وقت میں اتنا تو ہو کہ ہم اپنے بچوں کے محتاج نہ رہیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم پیسا دوسروں پر پھینکنے کے بجائے بچا کر رکھیں۔''

''یہ خودغرضی ہے اسد۔'' صبا نے دھیرے سے کہا۔

''تم اسے خودغرضی کہہ لو، میں اسے سماجی بھلائی سمجھتا ہوں۔ بچوں پر بوجھ بننے کی لعنت ہمارے ملک سے ختم ہونی ہی چاہیے۔''

''جہاں اور بہت سی لعنتیں ہیں، اس ایک لعنت کو بھی برداشت کرلو۔''

اسد نے بگڑ کر اپنی سیاہ گہری آنکھوں سے صبا کو دیکھا۔ ان آنکھوں کی تاب نہ لاکر صبا نے نظریں جھکالیں۔

''تمھیں معلوم ہے صبی، ہماری تنخواہ سے بہت زیادہ نہیں بچتا، تمھیں امی سے

Marfat.com

کہہ دینا چاہیے تھا کہ ہم ہمیشہ اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں، اس لیے ہمارا اپنا گزارا مشکل سے ہوتا ہے۔''

''میں ان سب کی حالت دیکھتے ہوئے یہ کیسے کہہ دیتی۔''

''تو تم خود بھگتو، میں کچھ نہیں کرسکتا۔''

''تم کہو تو میں ہر مہینے ان پیسوں میں سے بھیج دیا کروں جو ابا نے مجھے دیے ہیں۔''

''تم اپنے پیسے کی مالک ہو، جس کو چاہو دو۔ میں منع کرسکتا ہوں بھلا مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میاں بیوی کے خیالات ایک نہ ہوں تو... زندگی بڑی مشکل ہوجاتی ہے۔''

''سو تو ہے...'' صبا نے دل میں کہا مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

''اس دن روبینہ سے... اس دن احمد صاحب کے ہاں یہی بات نکلی تو سب نے میرے خیال سے اتفاق کیا کہ اب اس سسٹم کو ختم ہوجانا چاہیے مگر تم ہر بات میں میری مخالفت کرتی ہو۔''

''اسد... میں مخالفت نہیں کرتی... اگر چچا احمد کے گھر والوں نے ان کا ماحول اور رہن سہن دیکھا ہوتا تو وہ بھی یہی کہتے...''

''دیکھنے نہ دیکھنے سے فرق نہیں پڑتا... اپنے اپنے خیالات کا فرق ہوتا ہے۔''

''ہوسکتا ہے...'' صبا نے دھیرے سے کہا، اور دفعتاً وہ بولی، ''کیا روبینہ میرے پیچھے بھی یہاں آتی تھی...؟''

''ہاں... کبھی کبھی... کلب سے... بوبی کو دیکھنے...'' اسد نے رک رک کر کہا اور خط میز پر ڈال دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

رفتہ رفتہ ہوٹل کے نئے مکینوں سے ان کا تعارف ہوگیا۔ عراقی، ایرانی اور بیگم گراموفون بھی جاچکی تھیں مگر بیگم گراموفون اور میڈم ڈبل روٹی کا بدل ایک بیگم موصل خان کی صورت میں موجود تھا۔ وہ بیگم گراموفون کی طرح قد آور اور میڈم ڈبل روٹی کی طرح موٹی تھیں۔ اپنے تھمبے جیسے وجود کو تیز تیز رنگوں کے کپڑوں میں لپیٹے یوں نظر آتیں جیسے کسی بڑے آدمی کی آمد کے سلسلے میں بنائے گئے دروازے کے ستونوں کو ریشمی کپڑوں سے ڈھانپ دیا گیا ہو۔ ''اے بھائی، اے بہن'' ان کا تکیہ کلام تھا اور زندگی میں ان کا ایک ہی مشن تھا، ہر قسم کے مشورے مفت اور بے طلب دینا۔ مگر اس مہنگائی اور خود غرضی کے دور

Marfat.com

میں بھی جب کوئی چیز مفت اور بے مانگے نہیں ملتی، لوگ ان کے مشوروں کی قدر نہیں کرتے تھے، ایک اسی دکھ کو اگر وہ سینے سے لگا لیتیں تو شاید ان کی چربی گھلانے میں معاون ہوتا مگر دل کو لگانے کے بجائے وہ اپنی ہمتوں کو دو سے ضرب دے ڈالتی تھیں اور اس وقت تک مشورہ دینا نہ چھوڑتی تھیں جب تک دوسرا اس سے فیض یاب ہونے کا پکا وعدہ نہ کر لے۔

ان کے میاں دوسری قابلِ دید ہستی تھے۔ ان کا نام موصل خان تھا مگر مونچھوں کی رعایت سے لوگ غائبانہ طور پر انھیں مونچھل خان کہا کرتے تھے۔ خود بھاری بھرکم، چال جیسے کڑی کمان کا تیر، یہ بڑی بڑی مونچھیں شرق تا غرب پھیلی ہوئی جیسے چھانگا مانگا کا جنگل، بڑے بڑے بال جن پر ویزلین ہیئر ٹانک کا کثرت سے استعمال، گول گول متجسس آنکھیں ان پر موٹی موٹی سیاہ ایک دوسرے میں الجھی ہوئی بھنوؤں کا سایہ، لباس قمیص پتلون اور صاف ستھرا ہونے کے باوجود ان کو دیکھ کر مجموعی تاثر کچھ ایسا ہوتا جیسے ڈھیلے ڈھالے چغے اور شلوار میں کوئی کابلی پٹھان، اپنی بیوی کی طرح زود گو تھے۔ اپنی تھیوریاں بنا کر واقعات کو سختی سے ان پر ڈھالا کرتے تھے، اگر کوئی ان سے اختلاف کرتا تو یہ ہرگز اس کی بات تسلیم نہ کرتے۔ اگر کبھی قائل ہو ہی جاتے تو دو چار دن بعد اس شخص کو اسی کی دلیل و براہین سنا سنا کر دوبارہ قائل کرتے، اس کو اتنا موقع بھی نہ دیتے کہ وہ کہہ سکے کہ مجھے اس بات سے اختلاف ہی نہیں ہے۔ غالباً اس سے ذہنی طور پر انھیں یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ وہ کسی سے ہارے نہیں ہیں۔

اکثر شام کو وہ جمگھٹا سا بنائے لان پر بیٹھے اپنے بیتے ہوئے واقعات گھڑ گھڑ کر سناتے رہتے، جو کمرے سے نہ نکلتا، ان کا قاصد اسے بلانے پہنچ جاتا۔ لوگ پکچر یا بازار جاتے ہوئے ان سے چھپ کر نکلتے، ورنہ وہ کہاں کسی کو جانے دیتے۔ ''ارے چھوڑو بھی، ارے بیٹھو بھی'' کہہ کر ٹانگ لے لیتے۔ اِدھر بیوی فوراً اے بھائی یا اے بہن کی تمہید کے بعد کوئی طویل مختصر افسانہ شروع کر دیتیں یا اپنے مشوروں کی پوٹ کھول کر بیٹھ جاتیں۔

اس دن جو ایک ٹورسٹ کی گھڑی غائب ہوگئی تو موصل خان نے سیکڑوں ہی تھیوریاں بنا کر حالات کو ان پر ڈھالا۔ اوّل تو یہ کہ روم بیرے نے ہاتھ صاف کیا ہے کیوں کہ جیسے ہی کوئی آتا ہے، وہ سب سے پہلے کمرے میں جاتا ہے اور بعد میں بھی اکثر

Marfat.com

ٹورسٹ کمرے کی چابی اسی کے پاس چھوڑ جاتے ہیں مگر جلد ہی نہ جانے کیسے انھیں بیرے کی بے گناہی کا یقین ہوگیا اور انھوں نے پڑوس کی آیا کو چور مان لیا، جو ایک بیرے کے بیان کے مطابق اسی ٹورسٹ کے کمرے سے آتی ہوئی پکڑی گئی تھی۔ وہ سامنے بیٹھی بچی کو کھلا رہی تھی، جیسے ہی ٹورسٹ کمرے سے نکل کر ڈائننگ ہال کی طرف گئے، اس نے میدان صاف دیکھ کر گھڑی پار کردی۔ پھر ایک عورت کی اتنی ہمت نہ دیکھ کر انھوں نے اس تھیوری کو بھی غلط ثابت کردیا اور بتایا کہ یہ ساری شرارت مہتر کی ہے جو کبھی شام کو جھاڑو نہیں دیتا۔ لیکن اس دن ٹورسٹ کے کمرے میں شام کو جا پہنچا۔ جب انھیں بتایا گیا کہ ٹورسٹ نے اسے خاص طور پر بلوایا تھا اور وہ ان کے ہوتے ہوئے ہی کام ختم کر کے چلا گیا تھا تو انھوں نے پھر روم بیرے کو چور ثابت کر ڈالا۔ مگر جب دوسرے دن ٹورسٹ بغیر ایک لفظ اس گھڑی کے متعلق کہے چلے گئے تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ یہ سب فراڈ تھا۔ چوری ووری قطعی نہیں ہوئی تھی۔ بیرا اس آیا سے چند پرائیویٹ باتوں پر خفا تھا۔ اس نے آیا پر الزام لگایا کہ اس نے اس کو ٹورسٹ کے کمرے سے نکلتے دیکھا ہے۔ جب منیجر نے ان سے اپنا سامان چیک کرنے کو کہا تو انھوں نے یوں ہی تفریحاً کہہ دیا کہ ان کی ایک گھڑی گم ہوگئی ہے۔ جب پولیس میں اطلاع دینے کو کہا گیا تو انھوں نے منع کر دیا۔ اگر گھڑی سچ مچ چوری ہوئی ہوتی تو وہ پولیس بلانے کو کیوں منع کرتے... پھر بات بہک کر اس موضوع پر جا نکلی کہ آج کل اس قسم کی چھوٹی اور قیمتی چیزوں کی چوری بہت بڑھ گئی ہے، موصل خان نے فوراً تھیوری پیش کی۔

''اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی چیزیں آسانی سے چرائی جاسکتی ہیں اور آسانی سے بیچی جاسکتی ہیں۔'' پھر وضاحتاً انھوں نے فوراً ایک قصہ سنایا۔

''پشاور میں ہمارے کوارٹر میں ایک لڑکا رہتا ہے جو امریکیوں کے ہاں کام کرتا تھا۔ اسے میں ہمیشہ گھر پر بہترین ٹی شرٹ اور سفید براق پتلونوں میں دیکھتا تھا، ایک دن میں نے اس کے پاس ایک بڑا خوب صورت سفری بیگ دیکھا جس میں کئی عدد جوتے اور پالش وغیرہ تھیں۔ وہ باہر بیٹھا اپنے سارے جوتوں کو چمکا رہا تھا۔ پھر ایک دن میں نے اسے کسی دوست کے ساتھ کمپاؤنڈ میں ٹینس کھیلتے دیکھا۔ دونوں کے پاس نئے ریکٹ تھے، میرے پوچھنے پر وہ ہمیشہ یہی جواب دیتا کہ ہمارے صاحب نے نئی چیز خرید لی ہے اور یہ

Marfat.com

مجھے دے دی ہے۔ وہ اپنے صاحب لوگوں کے گن کچھ اس طرح گاتا کہ مجھے ان کی سخاوت کا یقین ہو جاتا۔ پھر ایک دفعہ اس نے مجھ سے کہا کہ صاحب کی کینٹین میں امریکن چیزیں بہت سستی ملتی ہیں، آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں صاحب سے کہہ کر دلوا دوں گا۔ میں سمجھا شاید میرے کوارٹر دینے کا احسان مان رہا ہے اور بدلہ چکانا چاہتا ہے۔ اس زمانے میں بازار میں ولایتی مال بالکل ناپید تھا، اس لیے میں نے کہا ٹھیک ہے مجھے ایک عدد دھوپ کا چشمہ، ایک اچھی سی گھڑی، سگریٹ کیس اور لائٹر چاہیے۔ وہ ایک ایک کر کے یہ ساری چیزیں مجھے لا کر دیتا رہا، خاصے سستے داموں، ان کے علاوہ بھی وہ بہت سی چیزیں لایا تھا جو اب مجھے یاد نہیں۔ پھر ایک دن اچانک اس کا باپ میرے پاس روتا ہوا آیا کہ اس کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ چھ ماہ کی ملازمت کے دوران میں اس نے اپنے مالک کی آدھی چیزیں غائب کر دی تھیں۔ اس وقت اس کے مالک کی سخاوت کا حال کھلا۔ ویسے شبہ تو مجھے دو ایک بار پہلے بھی ہوا تھا۔''

''اے بھائی، یہ نیچ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' بیگم موصل خان نے کسی ایک کو مخاطب کر کے کہا، ''میں آپ کو ایک قصہ سناؤں۔''

''لاہور میں ہمارے برابر میں ایک انگریز افسر رہا کرتا تھا۔ ان کے ہاں بے تحاشا مکھن، جام، شربت کی بوتلیں اور الا بلا آیا کرتا تھا اور ان کا نوکر خدا جھوٹ نہ بلوائے تو آدھی چیزیں میرے ہاتھ آدھی قیمت پر بیچ جاتا تھا... اور ان کی مالکن کو کبھی شبہ تک نہ ہوا۔ اے بہن یہاں تک ہوتا تھا کہ میرے ہاں کبھی بے وقت کوئی مہمان آ گیا۔ میں نے اس خانساماں کو کہلوا دیا اور جناب وہاں سے سینڈوچ، آملیٹ یا کوئی اور چیز بن کر آ گئی...'' سب لوگ انھیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

یہ سارا قصہ سنا کر وہ اپنے مخصوص انداز میں میٹھی سی ہنسی ہنسیں اور بولیں، ''سچ بھائی، دو سال تک تو مجھے اتنا آرام رہا کہ حد نہیں۔''

''پھر کیا ہوا؟'' کسی نے پوچھا۔

''پھر ہمارا تبادلہ ہو گیا۔ مجھے تو سچ پوچھو بہن اس بات کا بڑا ہی افسوس ہوا، کافی خرچہ بچ جاتا تھا میرا...''

''لیکن...'' صبا ہچکچاتے ہوئے بولی، ''آپ وہ چیزیں واقعی خرید لیتی تھیں۔''

Marfat.com

"لو بہن دیکھو..." وہ ہنستے ہوئے بولیں گویا بہن نے سخت احمق پن کیا ہو، "میں نہ خریدتی تو کوئی اور خرید لیتا... میں نے کیا برا کیا بھائی..." وہ اسد کی طرف مخاطب ہوگئیں، "میں نے تو ایک چیز منھ مانگے دام پر خریدی جس شخص نے بیچی اب اس کا دین و ایمان جانے..."

"بالکل ٹھیک ہے..." ان کے میاں نے ہاں میں ہاں ملائی، "میرا خیال ہے کہ آج کل چھوٹی اور قیمتی چیزوں کی چوری اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ نچلے طبقے میں دکھاوے کا شوق بڑھتا جارہا ہے۔ آج کل تانگے والے، گھریلو ملازم اور مزدور تک گھڑیاں لگائے، بوشرٹ پہنے اور لمبے لمبے بال رکھے نظر آتے ہیں۔" انھوں نے اپنی پہلی تھیوری میں تھوڑی سی ترمیم کی، "آپ نے وہ خبر تو پڑھی ہوگی کہ ایک فقیر جس کے بدن پر چیتھڑے لگے ہوئے تھے، ڈھائی تین سو روپے کی ایک قیمتی شال اوڑھے ایک دکان کے پیچھے سو رہا تھا۔"

"اچھا! کہاں کا ذکر ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"یہیں کا... پچھلی سردیوں کی بات ہے۔" انھوں نے کہا۔

صبا کا رنگ ایک دم زرد ہوگیا۔ اس کا دل بہت کچھ پوچھنے کو چاہا مگر زبان نے ساتھ نہ دیا۔

"بڑا بیوقوف تھا..." اسد نے کہا، "اسے چاہیے تھا کہ چوری کی شال بیچ کر اپنے لیے نیا لحاف، گدا اور کپڑے بنوا لیتا۔ پکڑا بھی نہیں جاتا..."

"اس کو کہتے ہیں شوقِ نمائش۔" موصل خان نے فوراً کہا، "اگر وہ شال بیچ کر اپنی حیثیت کے مطابق یہ چیزیں خرید لیتا تو اس کو یہ تسکین کہاں سے ہوتی کہ میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جو صرف بڑے آدمیوں کے پاس ہوتی ہے... جس وقت اس نے وہ شال چرائی ہوگی، اس کا مقصد بیچنا ہوگا مگر بعد میں شوقِ نمائش غالب آگیا اور اس نے وہ شال نہیں بیچی اور اس طرح پکڑا گیا۔"

صبا اتنی دیر میں سوچتے سوچتے جانے کہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ پکڑا گیا، جانے اس کا کیا حشر ہوا اور اچانک بغیر سوچے سمجھے، اس کے منھ سے نکل گیا، "مگر وہ شال تو میں نے ہی اسے دی تھی..."

ایک دم سب نے پلٹ کر دیکھا... لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس بات پر ہنسیں یا

Marfat.com

روئیں۔ بیگم موصل خان یک لخت ہی تڑپ کر بولیں۔

''سچ کہو بہن... تم نے دی تھی... اللہ قسم مذاق کررہی ہو...'' وہ ہنسیں گویا آخر بات کی تہ پا ہی گئیں مگر صبا کا چہرہ بے حد، سنجیدہ اور زرد ہورہا تھا۔

''تم... تم نے دی تھی... کب؟'' اسد اپنے تعجب اور غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''جس رات کلب میں مینا بازار تھا، واپسی پر یہ فقیر مجھے سردی سے ٹھٹھرتا ہوا ملا۔ میرے پاس کچھ نہیں تھا، میں نے وہ شال اتار کر دے دی۔''

''ونڈرفل، ونڈرفل... میں آپ کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا بیگم اسد۔'' اسد کا ردِعمل نظر انداز کر کے موصل خان چلائے... اتنی قیمتی چیز یوں دے دینا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ ممکن ہے آپ نے ایک لمحے کے لیے جذباتی ہوکر دے دی ہو اور بعد میں آپ کو افسوس بھی ہوا ہو، میرے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے، پھر بھی میں اس ہمت کی داد دوں گا...'' انھوں نے داد طلب نگاہوں سے یوں سب کی طرف دیکھا جیسے شال صبا نے نہیں انھوں نے ہی دی ہو... ''مگر بیگم اسد، افسوس ہے کہ آپ کی یہ نیکی غارت گئی کیوں کہ پولیس اس بے چارے فقیر کو پکڑ کر لے گئی اور جیل میں ڈال دیا مگر اس سے آپ کے نیک کام پر حرف نہیں آتا، آپ نے جو کچھ کیا...''

قبل اس کے کہ کوئی نئی تھیوری اس حرکت پر گھڑیں، صبا نے بات کاٹ کر کہا، ''اب... اب کچھ نہیں ہوسکتا، اس فقیر کو بچانے کے لیے؟''

''ایک انسان کی بیوقوفی کی سزا کسی نہ کسی کو ضرور بھگتنی پڑتی ہے۔'' اسد ابھی تک اپنے غصے کو پینے میں کامیاب نہ ہوسکا تھا، ''یہی شکر کرو کہ بیوقوفی تم نے کی اور سزا اس بے چارے فقیر کو ملی۔''

''اب تو اس بات کو کئی ماہ ہونے کو آئے، اتنی سزا وہ غریب کاٹ بھی چکا ہوگا۔''

موصل خان بہت زور سے ہنسے جیسے کوئی نادر لطیفہ ہاتھ لگا ہو۔

''لیکن، اس شال کی رسید بھی میرے پاس ہوگی۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے۔'' اسد بیزاری سے بولا۔

''میں آپ کو بتاتا ہوں بیگم اسد، کسی کیس کا فیصلہ ہوجانے کے بعد ایک مقررہ

Marfat.com

میعاد تک اس کی اپیل ہوسکتی ہے، اس کے بعد نہیں۔" موصل خان نے کہا۔

"جب یہ ثابت ہوجائے گا کہ قیدی بے گناہ ہے تو کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کی سزا برقرار رہے۔ یہ تو سمجھ میں نہیں آتا۔" صبا نے آہستہ سے کہا۔

"قانون کومن سینس (common sense) کے ماتحت تھوڑی ہوتا ہے بیگم اسد۔ لا از سپریم (law is supreme)۔" یہ کہہ کر وہ پھر زور سے ہنسے۔

"اے بہن، تم نے آج تک وہ خبر اخبار میں نہیں پڑھی تھی؟" بیگم موصل خان جو اس واقعے پر بے حد پرجوش نظر آ رہی تھیں، گھبرا کر بول اٹھیں مگر صبا اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے ان کی بات سنی اَن سنی کردی۔

"انھوں نے کہاں یہ خبر دیکھی ہوگی۔" موصل خان نے جواب فوراً اپنے ذمے لے لیا، "وہ تو لوکل اخبار میں تھی۔ اردو کے اخبار میں، اردو کے اخبار ہی ایسی چٹ پٹی خبریں دیتے ہیں، ورنہ انگریزی کے اخبار میں کیا رکھا ہے، روکھی پھیکی سیاست... میں تو اسی لیے انگریزی کا اخبار پڑھنے کے بعد منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے اردو اخبار ضرور پڑھ لیتا ہوں..." وہ ہنسے۔

"اب دیکھیے کہ اگر میں وہ اخبار نہ پڑھتا تو آج یہ اتنا بڑا انکشاف کیسے ہوتا کہ..." پھر یکایک ہاتھ پر ہاتھ مار کر وہ بولے، "ارے بھائی یہ اسٹوری تو اخبار میں ضرور جانی چاہیے۔ میں کہتا ہوں مزہ آجائے گا۔ کتنی دلچسپی کی بات ہے کہ ملزم کے مجرم بننے کے بعد، سزا مل جانے کے بعد اچانک یہ حقیقت کھلتی ہے کہ شال اسے دھرماتما بیگم نے دی تھی... ہاہا۔" وہ پھر زور سے ہنسے، "بھئی پولیس والے بھی کمال کرتے ہیں، ایک شخص کو پکڑ کر سارا کیس مکمل کرلیتے ہیں، میں آپ کو بتاتا ہوں، اس سلسلے میں ایسے گواہ ہوں گے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اسے شال چراتے دیکھا ہوگا... واقعی یہ اسٹوری اخبار میں ضرور جانی چاہیے..." وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسے، اور بھی کئی لوگ ان کی خاطر مسکرانے لگے، سوائے اسد اور صبا کے۔

"میرا خیال ہے کہ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوسکتا ہوگا" وہ آہستہ سے بڑبڑائی اور اسد سے مخاطب ہوکر بولی، "اسد اگر تم فون کرکے پوچھ لیتے..."

ابھی فقرہ اس کے منھ میں ہی تھا کہ اسد جھلا کر بولا، "فون کس کو کروں،

Marfat.com

چیف جسٹس کو یا کمشنر کوئٹہ ڈویژن کو۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی اس بات پر بہت سے لوگ ہنس پڑے، موصل خان کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔ صبا سن ہوگئی۔ اتنے آدمیوں میں آج پہلی مرتبہ یوں اس کی سبکی ہوئی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ جتنا وہ اس بات کو اہم سمجھتی تھی، اسد اتنا ہی فضول اور ناقابلِ التفات جان رہا تھا۔ ایک بے گناہ آدمی کا جیل میں سڑتے رہنا، ان لوگوں کے نزدیک کوئی خاص بات ہی نہیں، ذرا دور پہنچ کر اس نے اسد کو کہتے سنا، "خدا کسی کو اتنی جذباتی اور بے سمجھ بیوی نہ دے..." شاید یہ بات اس نے خود ہی سے کہی تھی، دوسروں کو سنانا نہ چاہتا تھا مگر جب صبا نے سن لی تو وہیں بیٹھے ہوئے بیش تر لوگوں کے کان تک پہنچ گئی ہوگی، تیزی سے چلتا ہوا وہ اپنی کار میں بیٹھا اور روانہ ہوگیا... صبا جو اس جذباتی صدمے کے بعد کبھی سرخ اور کبھی زرد ہو رہی تھی، ہمت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس کے خاصی دور نکل جانے کے بعد بیگم موصل جو بہ مشکل اپنی زبان کو تالو سے لگائے تھیں، بے چین ہوکر بول اٹھیں..."ہائے کتنی عجیب بات ہے، پتا نہیں ٹھیک ہے یا غلط۔"

"بالکل غلط۔" موصل خان نے اطمینان سے جواب دیا اور سب کو اپنی طرف دیکھتے پا کر ان کو اپنی بات کی اہمیت کا احساس ہوا۔ کھنکار کر بولے، "میں عرصے سے یہ اندازہ لگا رہا ہوں کہ یہ لڑکی نارمل نہیں ہے۔ اب دیکھیے نا، کس کے ذہن میں یہ بات آسکتی تھی کہ ایک قصے کو سن کر جھٹ خود کو اس کا ایک کردار بنالیا۔ یہ سیلف اسرشن (self assertion) کی ایک قسم ہے یا شاید اسے آبسیشن (obbsession) کہتے ہیں یعنی جب میں نے یہ قصہ سنایا تو فوراً اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ممکن ہے کسی نے یہ شال دے دی ہو پھر فوراً ہی اسے یقین ہوگیا کہ یہ شال اسے خیرات دی گئی تھی اور خود اس نے ہی دی تھی اور جناب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اس کے ذہن سے یہ بات نہیں نکال سکتی۔ اگر اسے سولی پر بھی لٹکا دیا جائے تو بھی کہے گی کہ شال اسی نے دی ہے۔"

"اچھا!" کچھ لوگوں نے زبان سے اور چند نے عالمِ حیرت میں منہ پھاڑ کر کہا۔

"ہاں اور اب یہ بات ثابت کرنے کے لیے وہ پورا قصہ گھڑ لے گی، ہوسکتا ہے وہ خود ہی شال کی رسید بھی بنالے۔"

Marfat.com

''اس نے میاں کو دن اور وقت تو بتایا تھا کہ کلب سے واپسی پر دی تھی۔'' ایک صاحبہ نے کہا۔

''لیجیے یہیں پتا چل گیا۔ مینا بازار سے واپسی پر ظاہر ہے اکیلی تو نہیں ہوں گی، میاں بھی ہوں گے اور دو چار اور بھی ہوں گے، کسی نے اسے دیتے نہیں دیکھا، کمال ہے بھئی۔'' انھوں نے کہا۔

صبا اندر آ کر سوچنے لگی، کیا واقعی اس نے کوئی ایسی حرکت کی ہے، جس پر اس کو احمق سمجھا جائے اور دنیا اس پر ہنسے۔ وہ بہت دیر تک سوچتی رہی مگر فیصلہ نہ کر پائی۔ آخر بوبی نے آ کر اس کے ساتھ کھیلنے کی فرمائش کی اور وہ اس سارے قصے کو بھلانے کے لیے اس کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہوگئی گو اس کا ذہن بار بار بھٹک کر اسی نقطے پر جا پہنچتا تھا۔

OOO

۱۱

بہت رات گئے اسد اس نامعلوم جگہ سے لوٹا جہاں شام کو گیا تھا۔ صبا ابھی تک بستر پر پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔ بوبی کب کا سو چکا تھا۔ اسد خاصی دیر تک ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھا رہا۔ پھر اچانک بڑے گمبھیر انداز میں ہاتھ باندھے صبا کے پلنگ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور بھاری آواز میں بولا، ''کیا تم اس آدمی کو جانتی تھیں؟''

صبا نے آنکھیں کھول کر تعجب سے اسے دیکھا۔ وہ جواب دینا نہ چاہتی تھی مگر اسد کی آنکھوں اور اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں کچھ ایسا تحکم تھا کہ وہ خاموش نہ رہ سکی... ''کس آدمی کو؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''جس کو تم نے شال کا تحفہ دیا تھا...'' اسد نے چبا چبا کر کہا مگر اپنے لہجے کے طنز کو چھپانے کی شعوری کوشش نہیں کی۔

''اسد!...'' صبا نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے تنبیہی لہجے میں کہا، ''میں نے اسے تحفہ نہیں دیا، نہ میں اسے جانتی تھی۔ میں نے رات کو سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے آدمی کو خیرات دی تھی...

''خیرات!'' وہ ہونٹ ترچھے کر کے حقارت سے مسکرایا۔ آج وہ صبا کو ہمیشہ سے بہت مختلف نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ پی کر آیا ہے۔ صبا نے سوچا...

''خیرات میں اتنی قیمتی شال دیتے میں نے نہیں سنا...'' اس نے اپنا جملہ پورا کیا۔

''میں نے بھی وہسکی کی بوتل ڈھائی سو میں بکتی نہیں دیکھی تھی...'' صبا نے کہا اور

Marfat.com

وہ خود اپنی ہمت پر حیران رہ گئی... پھر چند لمحے ٹھہر کر جیسے اس نے فیصلہ کیا کہ آج اسے ترکی بہ ترکی جواب دینا ہی ہوگا۔ ''اگر شراب کی ایک بوتل پر اتنے روپے خرچ کیے جاسکتے ہیں تو ایک انسان کا تن ڈھانکنے میں کون سا گناہ ہے۔''

صبا کی طرف سے یہ جوب سن کر اسد ایک لمحے کے لیے سن رہ گیا۔ پھر جیسے اس کا غصہ دوبارہ راہ پانے لگا۔ کٹیلی آواز میں بولا۔

''اچھا... تو یہ خیرات ضد میں کی گئی تھی۔ اب تک میں اسے صرف جذباتی پن اور بیوقوفی یا زیادہ سے زیادہ ہم دردی سمجھ رہا تھا۔''

''میں نے تو ہم دردی ہی میں دی تھی۔'' صبا نے آہستہ سے کہا مگر جیسے اسد نے سنا ہی نہیں... ''میں نے ڈھائی سو کی بولی لگائی تھی مگر ڈھائی سو روپے دیے نہیں تھے۔ زیادہ سے زیادہ بیس پچیس روپے خرچ کیے ہوں گے۔ تم بھی اسے دس بیس روپے دے سکتی تھیں۔''

''اس وقت میرے پاس پیسے نہیں تھے۔'' صبا نے صفائی پیش کی۔

''اگر تمھارے پاس شال بھی نہ ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ تم اپنا بلاؤز اور ساری اتار کر دے دیتیں۔''

''اسد...'' وہ زور سے چلائی جیسے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو... ''تم... تم کتنے نیچ...'' نامعلوم کب کا غبار اس ایک جملے میں تھا جو ابھی پورا ادا بھی نہ ہوا تھا کہ ایک تھپڑ اس کے منھ پر پڑا... پھر ایک کے بعد دوسرا۔ دروازہ دھڑ دھڑاہٹ کے ساتھ بند ہوتا گیا اور سیڑھیوں پر کسی کے اترنے کی بھد بھد آواز اس کے کانوں میں گونجتی رہی... دونوں ہاتھوں سے منھ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسد کے مضبوط ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اس کے نرم گال پر ابھر آئی تھیں۔ ان میں جلن ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسد نے اسے مارا ہے۔ اسد نے، جس سے وہ محبت کرتی تھی... جس نے مرتے دم تک اس سے محبت کرتے رہنے کی قسم کھائی تھی اور اس نے اپنے بابا سے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ اسد کو چاہے گی۔ ہر حالت میں، ہر قیمت پر... اس اسد نے اسے مارا تھا، اس خطا پر کہ اس نے اپنے جہیز کی شال ایک فقیر کو کیوں دے دی، وہ تو اپنا اور اپنے بچوں کا اسٹینڈرڈ اونچا کرنا چاہتا تھا۔ اس کا اور صبا کا سارا روپیہ صرف ان کی ظاہری

Marfat.com

ٹیپ ٹاپ پر خرچ ہونا چاہیے تھا تاکہ دوسرے دیکھیں اور سمجھیں کہ وہ پشتوں کے رئیس ہیں۔ وہ یہ کبھی نہ سمجھ پائے گا کہ اصلی ریاست دل کی ریاست ہے... پھر اسے ایک اور خیال آیا جو کانٹے کی طرح اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ کیا اسد کو واقعی اس سے محبت تھی، کہیں اسے اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے اس کے روپے کی ضرورت تو نہ تھی؟ اور تب وہاں بیٹھے بیٹھے اور روتے ہوئے شادی اور رفاقت پر آج تک پڑھے سارے مضامین اس کی نظروں کے سامنے ناچنے لگے... یہی وہ رشتہ ہے جس کے تقدس کی قسمیں کھائی جاتی ہیں؟ جس پر ہر ملک میں، ہر مذہب میں، ہمیشہ سے لاکھوں صفحے کالے کیے جا رہے ہیں اور کالے کیے جاتے رہیں گے۔

You may be sure that there is at least one person in the world to whom you can always go and open your heart with out fear or hesitation.

ایسے ہی مضمون کا یہ ایک جملہ اسے کتنا پسند آیا تھا۔ اس کے دل پر نقش ہوگیا تھا۔ سب تھیوریاں ہیں، سب باتیں ہیں، سب بکواس ہے۔

پھر ان کی شادی ہوگئی اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے... ہر کہانی کا یہ انجام... اس سے زیادہ جہالت اور کون سی ہوگی بھلا... روتے روتے وہ جانے کب سوگئی...

صبح جس وقت اس کی آنکھ کھلی کھڑکی میں سے دھوپ سارے کمرے میں پھیل چکی تھی۔ اسد اگر رات کو آیا تھا تو اس وقت پھر جاچکا تھا۔ صبا کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اٹھ کر اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو حیران رہ گئی۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا، پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ گو اس وقت بھوک لگ رہی تھی لیکن ایسی حالت میں ناشتے کے لیے جانا مشکل تھا۔ کوئی اندھا بھی دیکھ کر بتا دیتا کہ وہ رات بھر روتی رہی ہے، خواہ مخواہ تماشا بن جاتا۔ کل ہی سب کے سامنے اس کی خاصی سبکی ہوچکی تھی۔ چاہتی تو اپنے ملازم یا روم بیرے کے ہاتھ ناشتہ منگا سکتی تھی لیکن وہ دونوں تو ضرور اس کی حالت دیکھتے۔ اس نے بوبی کو خود تیار کرکے نیچے بھیج دیا اور پھر کپڑے اٹھا کر غسل خانے چلی گئی۔ ٹب میں گرم پانی ملا کر وہ اس میں لیٹ گئی... نیم گرم پانی اس کے جسم اور اعصاب کو آرام پہنچانے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ صرف اس کی گردن پانی سے باہر نکلی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوا

Marfat.com

جیسے یوں ہی اسے نیند آجائے گی، اور ایک دم ایک عجیب سی خواہش نے اس کے دل میں سر اٹھایا۔ کتنا اچھا ہو کہ وہ اس گرم پانی کے ٹب میں آرام کی نیند سو جائے اور پھر کبھی نہ اٹھے۔ اسد آکر دیکھے اور اسے پانی کے پردوں میں جل پری کی طرح سویا ہوا پائے۔ وہ اس کی جلتی ہوئی آنکھیں اور سرخ پپوٹے دیکھے، وہ اس کے گال پر ابھرے ہوئے اپنی انگلیوں کے نشان دیکھے اور کہے "مجھے معاف کردو صبی..." لیکن وہ اپنی زبان سے کچھ بھی نہ کہہ سکے صرف اس کی روح دور کھڑی مسکرا رہی ہو کہ وہ اپنے خدا، ڈیڈی اور خداوندِ مجازی کے سامنے سرخ رُو رہی۔ یہ سوچتے سوچتے پھر آنسو نکل کر گرم پانی میں ملنے لگے اور وہ سوچنے لگی۔ میں کتنی بیوقوفی کی باتیں سوچ رہی ہوں، یوں تخیل کے سہارے بھی کبھی زندگی سے فرار حاصل ہوا ہے۔ رات کو سوتے ہوئے بھی یوں ہی کسی تخیلی آہٹ پر وہ چونک اٹھتی تھی۔ شاید اسے منانے آرہا ہو مگر وہ نہیں آیا۔ پھر بھی اسے امید تھی کہ صبح کو وہ ضرور اس کے پاس آئے گا اور کہے گا، "مجھے معاف کردو۔" لیکن اگر وہ رات کو آیا تھا تو صبح کو اس کے اٹھنے سے پہلے اسی لیے چلا گیا تھا کہ وہ صبا کو اپنی شکل دکھانا نہ چاہتا تھا۔ گرم پانی کا پیدا کردہ سکون درہم برہم ہونے لگا، وہ پانی سے نکل آئی۔ کپڑے تبدیل کرکے وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں، ایک دریچے سے دوسرے دریچے تک بلامقصد یوں ہی پھرتی رہی جیسے شیشے کے حوض میں بند مچھلیاں... لیکن کیا کبھی انھیں ایسے شدید ذہنی کرب سے واسطہ پڑتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ مچھلی ہوتی۔ چند سال پانی کی خاموش، محدود دنیا میں رہنے کے بعد طبعی موت مرجاتی لیکن وہ مچھلی نہیں تھی۔ اسے ناشتا کرنے کے لیے ڈائننگ ہال میں جانا چاہیے تھا مگر آج وہ ہر چیز سے اس طرح بے نیاز تھی جیسے وہ ان روزمرہ کی ضرورتوں کی طرف اب کبھی نہیں لوٹے گی، کبھی بالوں میں کنگھی نہیں کرے گی، کبھی کمروں میں صفائی نہیں کروائے گی، کبھی اپنے کمرے میں کسی کو آنے نہیں دے گی اور شاید کبھی کھانا نہیں کھائے گی۔

پھر یہ کرب ناک لمحے طویل ہوکر گھڑیوں میں ڈھل گئے۔ دوپہر کو اسد کام سے واپس آیا تو اوپر آنے کے بجائے سیدھا ڈائننگ ہال میں چلا گیا۔ وہ سوچتی رہی کہ شاید وہ ابھی تک آیا نہیں۔ آئے گا تو اشرف ضرور اطلاع دے گا کہ بیگم صاحب اب تک نیچے نہیں اتری ہیں۔ انھوں نے ناشتا بھی نہیں کیا ہے، تب اسد اس کا ہاتھ پکڑ کر کھانا کھلانے لے

Marfat.com

جائے گا لیکن اشرف نے دروازہ کھٹکھٹا کر صرف اتنا کہا، ''صاحب کھانا کھانے چلے گئے ہیں۔'' اب اس کا دل نہ چاہا کہ وہ کھانا کھانے جائے، وہ اسی طرح بھوکی پیاسی پڑی رہی۔ شام تک اس کی آنتیں بے تحاشا قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اسے کم زوری محسوس ہو رہی تھی اور آنسوؤں کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ صرف اپنی خودی کو تسکین دینے کے لیے یا اسد کو آزمانے کے لیے اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا اور یہ رات بڑے کرب میں گزاری۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ زندگی کے سارے نظریے، سارے اختلافات ایک طرف ہیں اور پیٹ کی بھوک ایک طرف۔ اس وقت اسے ان مرن برت رکھنے والوں کا خیال آیا جو اپنے آئیڈیل کے پیچھے بھوکے مرجانے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اس کا یہ مرن برت کس آئیڈیل، کس نظریے کے تحت ہے۔ صرف شوہر کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے اس سے نیچ حرکت اور کیا ہوگی پھر تمھاری بھوک تمھاری اپنی تکلیف ہے، اس سے دوسرے کو کیا غرض۔ ممکن ہے، وہ اس وقت سمجھوتے کا خیال کرے جب اسے خود کوئی تکلیف ہو۔ فی الحال تو وہ اپنی خوداری کا سر بلند کیے، صبا کی طرف دیکھے بغیر سر سے گزر گیا اور بوبی کے کمرے میں جا کر لیٹ رہا۔ دوسرے دن شام سے پہلے اسے یقین ہو چکا تھا کہ آپس کے جھگڑوں میں بھوک ہڑتال بالکل بے معنی سی چیز ہے۔ اس نے بے تاب ہو کر شام کی چائے پی اور بسکٹ کھائے اور روزمرہ سے پہلے کھانے کے لیے اتر گئی... باوجود اپنی زبردست قوتِ ارادی کے جس کے سہارے وہ چاہتی تو ابھی اور بھوکی رہ سکتی تھی، اسے کم زوری محسوس ہو رہی تھی اور آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے...

○○○

Marfat.com

۱۲

اور یہ تیسرا روز تھا کہ اسد کی اور اس کی آپس میں بات چیت بند تھی اور ان کا اٹھنا بیٹھنا اور سونا الگ کمروں میں تھا اور یہ تیسرے دن کا ذکر ہے کہ ہوٹل میں اور پیچھے کوارٹروں میں دو باتیں صبح ہی صبح بڑی سنسنی پھیلا رہی تھیں۔ ایک تو ہوٹل کے بائیں ونگ کے پیچھے لوہے کے گول زینے کے عین نیچے ایک آدمی مرا پڑا تھا... اور اسی روز علی الصبح ہی چوٹی والی بیگم کے اوپر جن آ گیا تھا... اتفاق یہ تھا کہ چوٹی والی بیگم کا کمرہ بھی اسی ونگ میں تھا۔ ان پر جن بہت سویرے آیا جس وقت ابھی کوئی سو کر بھی نہیں اٹھا تھا اور مردہ آدمی کو روم بیرے نے ذرا دن چڑھے دیکھا جب وہ بارہ سال سے رہنے والی میم کے پاس بیڈ ٹی لے کر جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ صبح کی ملگجی روشنی میں کوئی شخص سیڑھیوں کے نیچے لیٹا ہے۔ اس نے چائے تو وہیں زمین پر رکھی اور جا کر اسے نزدیک سے دیکھا، وہ پتھروں پر منہ کے بل پڑا تھا اور بالکل مردہ تھا، سانس کا نام بھی اس میں نہ تھا۔ بیرے کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ منیجر اور کلرک ابھی نہ آئے تھے۔ وہ بھاگا بھاگا سیدھا پروپرائٹر کے بنگلے پر پہنچا اور چند ہی منٹ بعد اس مردہ آدمی کے آس پاس بھیڑ لگ گئی... کمرے سے صاحب اور بیگم صاحبیں نکل نکل کر جمع ہوئیں تو ادھر کوارٹر سے مردوں اور بچوں کا قافلہ چلا آیا۔ میں اور چند ہمت والی عورتیں ان کے پیچھے پیچھے چلیں۔ ادھر بیگم موصل خان نے اپنی آیا کو بھیجا کہ بیگم اسد کو بلا لاؤ تا کہ ہم دونوں بھی ذرا دیکھیں کیا ماجرا ہے، دروازہ کھٹکھٹانے پر صاحب نے دروازہ کھولا اور صرف اتنا ہی کہا، ''بیگم صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے'' لیکن اتنی دیر میں اس نے سن لیا کہ بیگم صاحبہ عجیب ڈراؤنی سی آواز میں رو چلا رہی ہیں، اور منہ

Marfat.com

ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی ہیں، ان کے بال گھوڑے کے ایال کی طرح تکیے پر کھڑے ہیں اور آنکھیں یہ بڑی بڑی اور سرخ ہیں اور کوئی ڈاکٹر ان پر جھکا ہوا ہے۔ اس نے واپس آ کر پہلے یہ خبر اپنی بیگم کو سنائی اور پھر اس کے ساتھ مرے ہوئے آدمی کو دیکھتے آس پاس کھڑی عورتوں کو جس تیزی سے آدمی کے مرنے کی خبر پھیلی تھی، اس تیزی سے یہ بھی پھیلی، پہلی خبر میں مردوں نے زیادہ دلچسپی لی، دوسری میں عورتوں نے، کوارٹر والیاں اس نازک وقت میں بھی یہ کہنے سے نہ چوکیں کہ یہ جنوں کا مذاق اڑانے کا نتیجہ ہے۔ ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ برے وقت سے ڈرنا چاہیے۔ ضرور کسی جن نے سن لیا ہوگا اور اب تو پورا بدلا نکالے گا۔

ادھر مرنے والے آدمی کو پورے ہوٹل میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ نہ کسی نے اسے آس پاس پھرتے دیکھا تھا۔ لیکن پولیس آئی تو فوراً پہچان لیا گیا۔ وہ مفرور قیدی تھا جو کئی دن ہوئے جیل سے بھاگ نکلا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ اس کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں ہے۔ مفرور قیدی بھوک سے مرا ہے اور اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ اس آدمی کے یہاں آنے کے بارے میں جتنے منہ اتنی باتیں تھیں لیکن عام قیاس یہی تھا کہ وہ رات کو کسی وقت باغ سے گزر کر پیچھے آیا، شاید کھانے کی تلاش میں وہ باورچی خانے اور پینٹری میں جانا چاہتا تھا مگر موقع نہ ملا، رات بھر وہ کہیں چھپا رہا، صبح کو جب وہ بھاگ کر جانے لگا تو بھوک، تھکن اور سردی سے نڈھال ہو کر ختم ہو گیا۔ موصل خان حسبِ عادت اس معاملے میں بھی ہر گھنٹے ایک نئی تھیوری بنا کر خود ہی اسے رد کر دیتے تھے، بیگم موصل خان صبا پر جن آجانے کی وجہ سے بھی اتنی ہی پریشان تھیں، ان پر دوہری مار پڑی تھی...

تین دن تک صبا ایسی ہی رہی جیسے اسے اپنے گرد و پیش کی کچھ خبر ہی نہیں۔ ہوش میں آتی تو کبھی روتی، کبھی بڑبڑاتی اور پھر دورہ سا پڑ جاتا۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی بھی تو ہوں ہاں سے زیادہ کچھ نہ بولی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کوئی بات غور سے نہیں سنتی یا سوچ نہیں سکتی۔ اس کی آنکھیں خلا میں بھٹکتی رہتیں جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں یا کوئی ایسا منظر دیکھ رہی ہوں جو دوسروں کو نظر نہیں آتا۔ یہی وہ آثار تھے جن پر کوارٹر کی عورتوں نے جن آنے کا فتویٰ دے دیا تھا۔ وہ مارے ہمدردی اور تجسس کے قافلے سے بنا کر اسے دیکھنے بھی آئیں لیکن اسد نے سب کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ صرف بیگم موصل کی آیا گھڑی بھر کو اسے

Marfat.com

دیکھ سکی یا مہتر۔ مگر ان دونوں نے سوفی صد تصدیق کی کہ بیگم صاحبہ پر مکمل طور پر جن آ گیا ہے۔ مہتر نے بڑی راز داری سے اسد کو ان ملا جی کا پتا بھی بتایا کہ جو جن کو شیشے میں اتارتے ہیں اور صلے میں ایسی زوردار ڈانٹ پائی کہ ساری عمر کو ان صاحب لوگوں کی جہالت کا داغ بن کر دل میں بیٹھ گئی۔

روبینہ صبا کو دیکھنے آئی اور دوسرے کمرے میں بیٹھ کر بہت دیر تک اسد سے تبادلۂ خیال کرتی رہی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نروس بریک ڈاؤن ہے، بیگم موصل خان بھی آئیں اور انھوں نے کوارٹر والیوں سے پوری طرح متفق ہوکر کہا، ''بھائی میں آپ کو پتا بتاتی ہوں، یہاں ایک پہنچے ہوئے پیر ہیں، گدڑی خان یا پیوند خان ایسا ہی کوئی بھلا سا نام ہے۔ خیر نام تو بھلا نہیں ذرا یوں ہی سا ہے، پر آدمی بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کو آپ جا کر لایئے میں کہتی ہوں، ان کا تو نام سن کر ہی جن بھاگ جائے گا...''

اسد نے ایسا منھ بنایا جیسے کوئی کڑوی دوا زبردستی اس کے منھ میں ڈالی جا رہی ہو۔ روبینہ منھ ٹیڑھا کر کے حقارت سے مسکراتی رہی۔ آخر جب یہ تمہید طویل ہونے لگی تو اسد نے کہا، ''میں نے ڈاکٹر کو دکھا دیا ہے، وہ کہتا ہے دو ایک دن میں ٹھیک ہو جائیں گی، فکر کی کوئی بات نہیں۔''

''مگر بھائی، ڈاکٹر نے کیا مرض بتایا، یہ بتائیں نا آپ۔''

''مرض نہ اس نے بتایا، نہ میں نے پوچھا۔'' اسد نے کہا۔

''دیکھا...'' وہ فخر سے مسکرائیں، ''اے بھائی بڑے بھولے ہیں آپ خدا کی قسم۔ مرض اس کی سمجھ میں آتا تب بتاتا نا۔ یوں ہی کچھ گھول گھال کر دے گیا ہوگا۔ میری مانو تو بھائی وہ دوا بالکل نہ پلانا بہن کو، میں کہتی ہوں کہ آپ اسی پیر کو بلائیں، ہاں نام آ گیا... اے لو پھر نکل گیا دماغ سے، ہاں بھائی تو میں نے کہا...''

''چھوڑیے بھی ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔'' اسد نے بیزاری سے کہا۔

''کمال کرتے ہیں آپ۔ کیا آپ جنوں پر یقین نہیں رکھتے؟ نعوذ باللہ میرا مطلب ہے اب آپ، اتنے دہریے تو نظر نہیں آتے بھائی۔''

''جنوں پر یقین نہ رکھنے سے آدمی دہریہ نہیں ہوتا۔''

''نہیں بھائی... آپ مانیں نہ مانیں جن تو ہوتے ہیں۔ سیکڑوں آدمیوں نے

Marfat.com

دیکھے ہیں، میرے نانا تو جنوں کو پڑھاتے تھے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔''

''آپ نے خود دیکھے ہیں، اللہ بتایئے ذرا کیسے ہوتے ہیں جن؟'' روبینہ حقارت آمیز مسکراہٹ سمیٹ کر تعجب سے بولی۔

''ہاں... بہن، اپنی آنکھوں سے... ہمارے نانا بڑے عالم تھے، بہت لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے... میں تو چھوٹی سی تھی، اکثر وہاں چلی جاتی تھی۔ پر نانا ڈانٹ کر بھگا دیتے تھے۔''

''اچھا آپ دونوں باتیں کیجیے، میں ذرا صبیحی کے پاس بیٹھتا ہوں۔''

اسد تنگ آ کر اٹھ گیا مگر بیگم موصل خان کی روانی میں کوئی فرق نہیں آیا...''ہاں بہن، تو میں کہہ رہی تھی کہ جن...''

''مگر یہ تو بتایئے، جن تھے کس شکل میں؟'' روبینہ نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

''جن! اے بہن لڑکے تھے بالکل۔ جیسے اور لڑکے تھے، ویسے ہی وہ بھی لڑکے تھے، ارے بہن وہ شکل بدل کر آتے تھے نا اپنی۔''

''تو پھر آپ انھیں کیسے پہچانتی تھیں؟''

''کوئی بھی نہیں پہچان سکتا، نہ کسی کو پتا تھا پورے شہر میں سوائے نانا کے یا ہماری نانی کو خدا بخشے کچھ شبہ تھا۔ مگر وہ پوچھتیں تو نانا صاف ٹال جاتے۔''

''اللہ۔ لیکن جب کوئی فرق ہی نہیں تھا ان میں اور لڑکوں میں تو نانی کو شبہ کیسے ہو گیا۔''

''پتا نہیں، کوئی بات ہوگی جس سے شبہ ہو گیا ہوگا۔ کہتے ہیں جن پلک نہیں جھپکتے، شاید انھوں نے یہی دیکھ لیا ہو...''

''پھر تو کبھی بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جن تھے یا لڑکے...''

روبینہ ایک دم مایوس ہو گئی۔ اسے بالکل یوں لگا جیسے کوئی زوردار عنوان دیکھ کر کہانی شروع کرے اور کہانی بالکل پھسپھسی نکلے...

''ارے بہن، کیا بات کرتی ہیں۔ یقین کیوں نہ تھا۔ بعد میں ایک دن یہ ہوا کہ ہمارے نانا پڑھا رہے تھے، چراغ ذرا دور تھا۔ نانا نے ایک لڑکے سے کہا، ''ذرا وہ چراغ اٹھا لانا...لڑکا اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں اور چراغ اٹھ کر نانا کے پاس آ گیا۔ بس سب لڑکے

Marfat.com

اسی وقت ڈر کر بھاگ گئے۔ اسی وقت نانا نے جنوں سے کہہ دیا کہ اب لوگوں کو معلوم ہوگیا ہے کہ تم جن ہو تو میں تمھیں پڑھا نہیں سکتا، بس بے چارے چلے گئے۔
''ہاؤ ونڈرفل...'' روبینہ نے کہا، ''کچھ بھی ہو پھسپھسی کہانی کا انجام زور دار نکلا۔''

''اچھا اب میں تو چلوں گی، ذرا صبا کو ایک نظر اور دیکھ لوں...'' وہ اندر چلی گئی، جب وہ خاصی دیر تک باہر نہ نکلی اور بیگم موصل خان خاموشی سے اکتا کر بولنے کے لیے تڑپنے لگیں تو وہ بھی بیڈ روم میں آگئیں۔ صبا سو رہی تھی، نزدیک کے پلنگ پر اسد بیٹھا تھا اور بالکل لگی ہوئی روبینہ بیٹھی ہاتھ چلا چلا کر سرگوشی میں بات کر رہی تھی۔ بیگم موصل خان کو دیکھ کر وہ کھڑی ہوگئی...

''بہت دیر ہوگئی ہے اب میں تو چلوں گی...'' روبینہ نے کہا۔ اسد اسے نیچے چھوڑنے گیا۔ بیگم موصل خان بھی ساتھ ہی اتر گئیں۔ ہوٹل کے دروازے تک وہ ان کے ساتھ ساتھ گئیں۔ واپسی پر جب اسد نے انھیں پھر اپنے ساتھ آتے دیکھا تو بڑی نرمی سے بولا۔

''اب آپ بھی آرام کریں بیگم موصل، صبی تو آرام سے سو رہی ہے۔''
''میں یہ کہہ رہی تھی کہ ان پیر کا پتا مجھے بالکل ٹھیک تو معلوم نہیں مگر اندازہ بتائے دیتی ہوں، دیکھیے جب آپ قندھاری بازار...''
''آپ فکر نہ کریں، میں کسی سے معلوم کروالوں گا...'' اسد جلدی سے بولا۔
''ہاں ضرور کیجیے، بھائی... یہ کام ضروری ہے۔ باقی ڈاکٹروں واکٹروں کی دوائی کی تو میں اس معاملے میں قائل ہی نہیں ہوں۔''
''اچھا... صبا اکیلی ہیں۔ میں جاتا ہوں، خدا حافظ...''
اسد تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مبادا ان کو پیر کا پتا یاد آجائے اور وہ اسے پھر پکڑ لیں یا اس کے پیچھے لگ جائیں۔
رفتہ رفتہ صبا چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی۔ اسد اس کی مناسب ناز برداری کرتا رہا۔ دوست احباب مزاج پرسی کو آتے رہے، روبینہ نے سب سے زیادہ چکر لگا کر دوستی کا حق ادا کر دیا۔ لیکن صبا جس چیز سے زیادہ بھڑکتی تھی، وہ اس کی بیماری کا ذکر تھا۔ جیسے ہی

Marfat.com

کوئی یہ ذکر چھیڑتا، وہ کوئی اور بات نکال لیتی۔ یہ بات سب سے زیادہ بیگم موصل خان کو عجیب لگی، اپنی بیماری ایک ایسا موضوع تھا جس پر وہ گھنٹوں بے تکان بول سکتی تھیں اور مارے ہم دردی کے نہ کوئی ان کی بات کاٹ سکتا تھا، نہ کوئی اور ذکر چھیڑ سکتا تھا۔ ان کو خود اپنی آواز سے محبت تھی، ذکر بیماری کا اور پھر بیاں اپنا...اس موضوع پر انھیں اپنی آواز کی روانی خود اپنے کانوں کو بہت بھلی لگتی تھی۔ انھیں تعجب تھا تو یہی کہ خدا کسی کو بولنے کا موقع یوں چھپر پھاڑ کر دے اور وہ اس سے فائدہ نہ اٹھائے، بھلا اس سے زیادہ ناشکرا اور کون ہوگا، ایسے وقت میں صبا کے بجائے وہ خود اس کی بیماری کا آنکھوں دیکھا حال شروع کردیتیں۔ جس کو وہ واضح طور پر ناپسند کرتی، یہاں تک کہ کئی مرتبہ بیگم موصل خان کی پوری کوشش کے باوجود اس نے نہایت بے دردی سے موضوع بدل دیا۔

اسد اور صبا کی شادی کی سال گرہ نزدیک تھی۔ معلوم نہیں اسد کا پہلے ہی سے ارادہ تھا یا صبا کو خوش کرنے اور اس کا دھیان بٹانے کے لیے نہایت زوردار پارٹی دینے کا ارادہ کیا۔ صبا کی کم زوری کی وجہ سے اس کا زیادہ تر انتظام اسد اور روبینہ نے مل کر کیا۔

○○○

Marfat.com

حصّہ سوم

Marfat.com

ا

ایک ہفتہ گزر گیا اور وہ نہیں آئی... کئی مرتبہ دل چاہا، اسے چمنستان ہوٹل فون کروں مگر کس نام سے؟ کیا یہ کہوں کہ ایک پیاری سی شکل کی کھوئی کھوئی آنکھوں والی لڑکی کو فون پر بلوا دو یا یہ کہ جس کے پاس ہلکی فیروزی رنگ کی فوکس ویگن ہے اور جو بڑی خوداعتمادی سے اسے ڈرائیو کرتی ہے، یا یہ کہ جو ایک عدد موٹی اور بڑی سی چوٹی کی مالک ہے... اور پھر وکیل موکلوں کے پیچھے پیچھے تو نہیں پھرا کرتے۔ پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے یا کنواں پیاسے کے پاس۔ میرا دل وہ کنواں بن گیا تھا جو پیاسے کے پاس جانے کو تڑپ رہا تھا۔ یہی حال رہا تو ہوچکی وکالت میاں عامر! میں نے خود سے کہا... ابھی تک میں ابا کے ایک دوست کے ساتھ کام کرتا تھا اور حال ہی میں انھوں نے مجھے آزادانہ پریکٹس کرنے کی اجازت دی تھی۔ جہاں میرے استاد اپنے موکلوں سے یوں بات کرتے تھے جیسے وہ پتھر کے بنے ہوئے ہوں۔ ہر موکل کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگتا تھا، ان کی مشکلات سن کر میرے دل کی کچھ ایسی کیفیت ہوتی تھی جیسے کوئی ڈاکٹر اپنے مریض کی حالت دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو رونا شروع کر دے۔ معاملے کی بات میری زبان پر آتی ہی نہ تھی۔ سوچ رہا تھا، اس کام کے لیے کوئی اور آدمی رکھ لوں مگر بے بس تھا۔ کب میں اپنے آفس کی حالت سدھاروں، کب کیا کروں، یہ سب میرے نہیں میرے استاد کے ہاتھ میں تھا۔ اتنے دن ان کے ساتھ رہ کر بھی شاید میں نے ان سے کچھ نہ سیکھا تھا۔ وہ موکل کو اس طرح پھانستے تھے جیسے مکڑی مکھی کو اپنے جال میں پھانستی ہے اور یہاں الٹا موکل یہی سوچتا ہوگا کہ آج تو وکیل صاحب کو پھانس ہی لیا... سب سے زیادہ دکھ مجھے اس بات کا تھا کہ

Marfat.com

اکثر لوگ ایک بار جھانک کر جاتے تو دوبارہ نہ آتے، خیر کسی اور کے نہ آنے کا مجھے کبھی اتنا غم نہ ہوا جتنا اس لڑکی کے نہ آنے کا۔ عجیب پگلی سی لڑکی تھی، جانے آئی ہی کیوں تھی...

ابھی چند روز ہی کی بات تو ہے، شاید ہفتے کا دن تھا۔ میں یہیں اپنے دفتر میں حسبِ معمول مشغول دکھائی دینے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میز پر میں نے قانون کی موٹی موٹی کتابیں بکھیر رکھی تھیں۔ اسی وقت چپڑاسی نے ایک خاتون کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے اسے اندر بلانے کو کہا جس وقت وہ اندر داخل ہوئی، خالص پیشہ ورانہ انداز میں نگہِ غلط انداز ڈال کر میں نے کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنے کام پر جھکنے کی سوچ رہا تھا... لیکن ایک اس نظر میں جانے میں نے کیا دیکھا کہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہ مشکل سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ جسم نہایت سڈول، چست قمیص میں کمر خصوصاً بہت پتلی نظر آ رہی تھی۔ سفید دوپٹا شانے پر پھیلا ہوا تھا۔ بال سنہری مائل سیاہ تھے جو نرم لانبی سی چوٹی میں اس طرح گوندھے گئے تھے کہ منھ پر جگہ جگہ لٹیں آ پڑی تھیں۔ چہرے پر وہ گندمی سنولاہٹ تھی جسے میں آج تک بہترین رنگ سمجھتا ہوں، اس میں جلد کے اندر سے ایک گلابی سفیدی، ایک تازگی سی جھانکتی ہے جو صرف اسی رنگ کا حصہ ہے، گال قدرے ابھرے ہوئے اور گلابی مائل، آنکھیں روشن، پلکیں لانبی، ہونٹ گلابی، نیچے کا ہونٹ قدرے موٹا، آنکھوں میں پیشانی کی طرف دیکھنے سے ذہانت اور ساتھ ہی ساتھ معصومیت کا غیر معمولی امتزاج نظر آتا تھا۔ میک اپ نہیں تھا اور اگر تھا تو اتنا ہلکا کہ مجھے دکھائی نہ دیا۔ کپڑے سادہ تھے اور سوائے چند چوڑیوں کے کوئی زیور نہ تھا۔ میں پہلی نظر میں اسے اسکول میں پڑھنے والی لڑکی سمجھا۔ پھر اس کی خود اعتمادی دیکھ کر، اس کے بیٹھنے کے انداز اور دوسری نظر اس کے چہرے پر ڈالنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ شاید کالج میں پڑھتی ہے، اس فیصلے پر دل ہی دل میں کچھ خوش اور مطمئن بھی ہوا۔ آخر میں نے اس سے کہا، ''فرمایئے، کیسے آنا ہوا۔''

وہ ایک دم کچھ سی پریشان ہوگئی جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کہے۔

میں نے آواز کو نرم، ہم درد اور ساتھ ہی نہایت بردبار بنا کر قدرے آگے جھک کر کہا، ''ڈریے نہیں، آپ کو جو کچھ کہنا ہے، بے دھڑک کہیے یہاں آپ کا ایک ایک لفظ محفوظ رہے گا۔''

Marfat.com

وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ کو طنزیہ بھی کہہ سکتے ہیں اور نہیں بھی، پھر وہ نہایت صاف اور خود اعتماد لہجے میں بولی، ''میں ڈرتی نہیں کچھ سوچ رہی تھی... اصل میں مجھے ایک چھوٹی سی بات پوچھنی ہے۔''

''کہیے...'' میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''میں یہ پوچھنا چاہتی تھی۔'' اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا، ''کہ کوئی آدمی کسی کو کوئی چیز تحفے میں یا... خیرات دے پھر وہ اس شہر سے چلا جائے اور پولیس اُس آدمی کو پکڑ کے سزا دلوا دے تو اس سلسلے میں کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں...؟''

''مگر دیکھیے...'' میں نے بے حد تجربہ کار وکیل کی طرح کہا، ''وکیلوں کو اس طرح گول مول بات بتانے سے کام نہیں چلتا، اگر آپ کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے تو ذرا تفصیل سے بتائیے...''

وہ جھینپ کر گلابی ہو گئی... پھر خود پر قابو پا کر اس نے کہا، ''بات یہ ہے کہ چند مہینے ہوئے ایک رات کلب سے واپسی پر میں نے ایک فقیر کو سردی سے ٹھٹھرتے دیکھا۔ اپنی شال اتار کر میں نے اسے دے دی، وہ شال خاصی قیمتی تھی...'' یہ کہتے ہوئے وہ سرخ ہو گئی جیسے اسے کسی بے حد غیر معمولی بات کا اقرار کرنا پڑ رہا ہو۔

''اب مجھے پتا چلا ہے کہ اس فقیر کو چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے اور وہ سزا کاٹ رہا ہے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تاریخ اس وقت تو مجھے یاد نہیں مگر معلوم کی جا سکتی ہے، آپ یہ بتا دیں کہ اس سلسلے میں کچھ کرنا ممکن ہے تو میں ساری تفصیلات بعد میں آپ کو بتا دوں گی...''

''جی ہاں، شال کہاں سے خریدی گئی تھی۔ ہو سکے تو اس کی رسید بھی لائیے۔ کیا کوئی اس وقت موجود تھا جب شال آپ نے اسے دی، تاریخ اور یہ کہ کیا آپ اس فقیر کو پہچان لیں گی یا وہ فقیر آپ کو پہچان لے گا، اس قسم کی باتوں کا مکمل جواب آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔''

''اچھا... میں کل... کل تو نہیں پرسوں حاضر ہوں گی۔'' اس نے کہا۔

''آپ کہاں رہتی ہیں؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

Marfat.com

''چمنستان ہوٹل میں۔'' اس نے کہا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھوں، وہ جلدی سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ شاید اسے واپسی کی جلدی تھی، اپنی عادت کے خلاف میں نے کھڑکی میں سے دیکھا اور... وہ ایک ہلکی فیروزی رنگ کی فوکس ویگن میں جابیٹھی اور بڑے وقار سے اسے چلاتی ہوئی نکل گئی... کار کے شیشے کے پیچھے اس کا خوب صورت تصویر سا چہرہ میرے ذہن پر چپک گیا اور میں کچھ حیران و پریشان سا کھڑا رہ گیا۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ یہ قصہ سچ ہے... یہ قصہ میرے تھوڑے سے تجربے میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل انوکھا تھا، مگر وہ تنِ تنہا میرے پاس کیوں آئی۔ کیا اس کا باپ، بھائی یا شوہر (خیر شادی شدہ تو معلوم نہیں ہوتی تھی) اس کے ساتھ نہیں آسکتے تھے۔ ممکن ہے اس نے یہ بات کسی کو بھی نہ بتائی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قصہ من گھڑت ہو اور اصل واقعہ کچھ اور ہو... شاید اس نے اپنے گھر کی کوئی قیمتی چیز یا زیور وغیرہ کسی... لڑکے کو دے دیا ہو اور وہ مصیبت میں پھنس گیا ہو مگر اس بات پر میرا دل نہ ٹھکا، شکل سے وہ کسی قدر بھولی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ تیسرے دن جب وہ آئے گی تو یہ ساری تفصیل اس سے پوچھوں گا مگر وہ نہ تیسرے دن اور نہ اس کے بعد آئی... آفس میں بیٹھے بیٹھے کئی مرتبہ میں اس کے خیال میں کھو جاتا... کار کی آواز پر چونک کر دیکھتا، شاید وہ ہو، پھر خود ہی اپنی بیوقوفی پر لعنت بھیجتا۔ رفتہ رفتہ اس کی آمد سے مایوس ہوگیا... پھر دل نے ایک اور چال چلی، کیوں نہ اس ہوٹل کا ایک چکر لگایا جائے، ایک چھوٹا سا بہانہ میرے پاس تھا۔ میری بہن شمسہ باجی نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ ہمارے پرانے جاننے والوں میں سے کوئی (نام خط میں دیکھنا پڑے گا) چمنستان ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں تم جاکر ان سے مل لینا۔ مجھے پرانے جاننے والوں سے ملنے کی تڑپ کبھی نہیں ہوتی۔ اس لیے میں اس بات کو ٹال گیا تھا۔ آپ کے بچپن میں کوئی آپ کے گھر کے برابر رہا تھا یا غلطی سے آپ کے ابا اور ان کی دوستی تھی مگر اب آپ ان کو پہچانتے ہیں نہ وہ آپ کو، ان سے ملنے اور خواہ مخواہ کی بے تکلفی جتانے کو میں حماقت سمجھتا ہوں۔ شمسہ باجی کا کیا ہے، وہ تو اتنے آدمیوں سے ملتی ہیں کہ ہر کسی سے فوراً بے تکلف ہوجاتی ہیں... یہ خیالات اس وقت میرے ذہن میں آئے تھے جب میں نے شمسہ باجی کا خط پڑھا تھا مگر اب میں سوچ رہا تھا کہ چلو چل کر تو دیکھیں شاید اچھے لوگ ہوں، حرج ہی کیا ہے، پھر دل نے ڈرتے ڈرتے

Marfat.com

کہا، ''اس بہانے ممکن ہے اس سے بھی ملاقات ہو جائے۔'' اگر ممکن ہوتا تو اس بات پر میں دل کو یوں گھور کر دیکھتا جیسے بزرگ نالائق بچوں کو دیکھا کرتے ہیں مگر یوں بس نہ چلا تو صرف دل سے بغاوت کرنے کے لیے میں نے وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

پھر ایک دن وہ صاحب خود ہی چلے آئے۔ خوش شکل و خوش لباس سے ایک شخص ایک شام میرے گھر آئے اور اسد کہہ کر اپنا تعارف کروایا۔ (تعجب ہے وہ لڑکی پہلے بھی یہاں آئی تھی اور یہاں سے پتا پوچھ کر آفس پہنچی تھی) اسد نے سب سے پہلے یہی بات کہی کہ شمسہ باجی نے مجھے تم سے مل لینے کو کہا تھا۔ وہ مجھ سے اسی بے تکلفی سے بات کرنے کی کوشش کرتے رہے جس کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے اور شاید وہ اس میں حق بہ جانب ہوں کیوں کہ نام سے مجھے جانتے تھے، شکلاً پہچانتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس زمانے میں بہت چھوٹا ہونے کی وجہ سے میں انھیں نہیں جانتا تھا، بہرحال شمسہ باجی کی وساطت سے ہماری جان پہچان ہوگئی۔ دوسرے دن اس کی شادی کی سال گرہ تھی۔ اس تقریب میں دیے جانے والے ڈنر میں انھوں نے مجھے چمنستان ہوٹل میں مدعو کیا۔ باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ ہوٹل میں رہنے والے تقریباً سب شریک ہوں گے، اس کے علاوہ باہر سے بھی بہت لوگ مدعو ہیں۔ میں بھی راضی ہوگیا کیوں کہ دل نے کسی کی دعوت ٹھکرا دینے کو بداخلاقی کہہ کر مجھے قائل کر دیا تھا۔

دوسرے دن جب میں چمنستان ہوٹل پہنچا، بڑا سا لان روشنی کی تازہ لگائی گئی لڑیوں سے جگمگا رہا تھا۔ کرسیوں پر بے شمار لوگ بیٹھے تھے اور ان سے زیادہ گروپ میں اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔ نو وارد لوگوں کا اسد اور بیگم اسد آگے بڑھ کر استقبال کر رہے تھے۔ میں نے لان کی سیڑھیوں پر قدم رکھا تو دوسرے مہمانوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر وہ میری طرف بڑھے اور میرے قدم سیڑھی پر یوں جم گئے جیسے وہاں منوں شہد پڑا ہو۔ اسد کے ساتھ وہی لڑکی تھی جو میرے پاس مشورے کے لیے آئی تھی۔ وہ اس دن سے زیادہ کم زور سی مگر کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ سفید بروکیڈ کے غرارے، سفید تار پروئے ہوئے کسی جگمگاتے کپڑے کی قمیص اور تاروں کی طرح چھٹکی ہوئی کامدانی والے سفید دوپٹے اور سفید کرن کے درمیان اس کا بھولا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی اور میری نظریں جھک گئیں۔ اسد نے میرا تعارف شمسہ باجی کے بھائی کی حیثیت سے

Marfat.com

کرایا۔ تب میں نے سلام کیا اور اس نے جواب دے کر مترنم آواز میں کہا، ''آیئے...'' میں اوپر چڑھ گیا۔ وہاں میرے اور بھی جاننے والے تھے، میں ان سے باتیں کرنے لگا اور وہ دونوں نئے آنے والوں کا استقبال کرنے کے لیے لوٹ گئے۔ اس وقت مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ کھانے تک اور کھانے کے بعد بھی میں یوں ہی کھویا کھویا رہا۔ جب ذرا رات بڑھی تو سب لوگ ایک بڑے سے نصف دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے اور سامنے تخت پر چند اڈے کچے آرٹسٹ اپنے بے تکے فن کا مظاہرہ کرنے لگے، چند سازوں اور چند گانوں کے بعد ایک ''سی'' قسم کی لڑکی شلوار قمیص میں آکر بدتمیزی سے ناچنے لگی اور اسی وقت میرے پاس کی خالی کرسی پر کوئی آکر بیٹھا۔ میں نے دیکھا کہ یہ وہی لڑکی تھی جسے میرا دل بیگم اسد مانتے ہوئے جانے کیوں خون ہو رہا تھا۔

''پھر تو آپ آئی ہی نہیں...'' میں نے لہجے کو شکایت کے عنصر سے بچانے کی کوشش کی تھی...''

''بات یہ تھی کہ اب سب کچھ ختم ہو چکا... میں آپ کو بتا نہ سکی کیوں کہ میں بیمار ہو گئی تھی...''

''سب کچھ ختم ہو گیا، وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اتفاق سے ہمارے دونوں طرف غیر ملکی لوگ بیٹھے ہوئے تھے جنھیں نہ ہماری باتوں سے دلچسپی تھی نہ ہی ان کی سمجھ میں آسکتی تھیں۔

''وہ آدمی جس کا میں نے ذکر کیا تھا جیل سے بھاگ گیا تھا اور... وہ مر چکا ہے۔ آپ نے اخبار میں پڑھا ہوگا...'' میں نے حافظے پر زور دیا تو مجھے یاد آیا کہ چند دن ہوئے میں نے اخبار میں اس قسم کی ایک خبر پڑھی تھی۔''

''یہ آدمی وہی تھا جسے آپ نے شال دی تھی؟''

''جی ہاں۔''

''کیا آپ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی؟ مجھے یاد ہے کہ وہ اسی ہوٹل کے پچھواڑے مرا ہوا پایا گیا تھا...'' یہ سن کر اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ میرا جذبۂ تجسس بڑھنے لگا۔

''اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے پورا قصہ سنا دیجیے۔'' میں نے کہا۔

اس نے اپنی لمبی لمبی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا، جیسے میری اس جرأت پر وہ کچھ

Marfat.com

جھنجھلا گئی ہو۔ آہستہ آہستہ کہنے لگی، ''یہ بات یہاں کسی کو معلوم نہیں ہے۔''

''بہتر ہے، میں کسی سے نہ کہوں گا۔'' میں نے کہا۔

وہ پھر خاموش ہوگئی۔ شاید وہ دل ہی دل میں اس لمحے کو کوس رہی تھی جب وہ مشورہ لینے میرے آفس آئی تھی۔ وہ ضرور یہ سوچ رہی ہوگی کہ میں اس بات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہوں... آخرکار وہ بولی، ''میں مفرور آدمیوں کے لوگوں کے گھروں میں گھس جانے کے بہت سے قصے پڑھ چکی تھی، ان پر یقین نہیں آیا تھا مگر اس دن یہ سب کچھ ایسے ہوا جیسے کسی ناول کا حصہ ہو...''

''اچھا...'' میں نے اظہارِ تعجب کر کے اس کو بات جاری رکھنے پر اکسایا...

''جس دن میں آپ کے پاس آئی تھی یہ اسی رات کی بات ہے۔ اسد کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ میں نے رات کے کھانے کے بعد اوپر پہنچ کر ریڈیو لگایا اور اپنی کڑھائی لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ ہمارے کمروں میں باہر آنے جانے کے صرف دو دروازے ہیں ایک سامنے سے ایک پیچھے سے۔ ڈرائنگ روم سے ایک دروازہ بالکنی میں بھی کھلتا ہے مگر اس طرف سے نیچے اترنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ پچھلا دروازہ میں پہلے ہی بند کر گئی تھی۔ سامنے والے دروازے میں بھی احتیاطاً کنجی گھما دی، تھوڑی دیر میں اچانک کھٹکا ہوا اور میں نے دیکھا کہ ڈرائنگ اور بیڈ روم کے درمیانی دروازے میں ایک آدمی کھڑا ہے۔ میں نے چیخ ماری۔ اوّل تو تمام دروازے بند تھے، دوسرے اس آدمی کے کھڑے ہونے کے انداز اور اس کی شکل وصورت میں کچھ ایسی مسکینی تھی کہ چیخ بھی گھٹ کر رہ گئی۔ اس نے مجھے رحم طلب نگاہوں سے دیکھا اور ہاتھ جوڑ دیے، جیسے مجھ سے خاموش رہنے کی استدعا کر رہا ہو۔ میں نے دیکھا، اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ پھر عجب پُرحسرت لہجے میں اس نے کہا، ''میں چار دن کا بھوکا ہوں۔'' عام طور پر فقیر ایسے جملے کہا کرتے ہیں مگر اس کی ظاہری حالت سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ واقعی بھوکا ہے، اس کی آواز میں نقاہت تھی۔ وہ دروازے کو اس طرح پکڑے کھڑا تھا جیسے اس کا سہارا لے رہا ہو۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، داڑھی بڑھی ہوئی تھی، کپڑوں کے اندر اس کا پیٹ چپاتی سا نظر آتا تھا اس کی گدلی آنکھوں میں حسرت تھی اور بھوک بالکل واضح اور صاف۔

میں بہت زیادہ بہادر تو نہیں ہوں مگر چوہے اور چھپکلیوں سے ڈرنے والی لڑکیوں

میں سے بھی نہیں ہوں، میں نے ہمت کر کے پوچھا، ''تم آئے کدھر سے۔''

اس نے ایک انگلی سے بالکنی کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے یہ بات بہت عجیب لگی، مارے نقاہت کے جو شخص کھڑا نہ ہوسکتا ہو، وہ چھت پر چڑھ کر کمرے کے اندر کیسے چلا آیا۔ اگر وہ چور تھا تو اب تک ساری چیزیں چرا کر بھاگ سکتا تھا۔ اسے یوں میرے سامنے آکر گڑگڑانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے ماتھے پر ایک بڑا سا سیاہ نشان تھا جس سے مجھے شک ہوا کہ میں نے پہلے بھی اسے کبھی دیکھا ہے۔

''تم باہر بیٹھو میں تمھیں کچھ پیسے دیتی ہوں۔'' یہ کہہ کر باہر کے دروازے کو کھولنے بڑھی۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور لجاجت سے بولا۔

''میں... میں قیدی ہوں... پولیس میرا تعاقب کر رہی ہے...'' ابھی تک میں اسے فقیر سمجھ رہی تھی، قیدی کا نام سن کر ڈر گئی شاید اس نے یہ دیکھ لیا۔ جلدی سے بولا، ''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے، میں تو صرف تمھاری جیسی ایک نیک عورت کی نیکی کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔'' میں نے اس سے اس جملے کا مطلب پوچھا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جسے میں نے شال دی تھی۔ اب مجھے یاد آیا کہ اس کے ماتھے پر یہ نشان میں نے اس دن چاندنی میں چمکتے دیکھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بے گناہ تھا، اس لیے جیل سے بھاگ جانے میں کوئی برائی نہیں سمجھتا تھا۔ ایک دفعہ پہلے بھی اس نے کوشش کی تھی مگر پکڑا گیا تھا۔ وہ خود کو جیل کے دوسرے باسی، چوروں، ڈاکوؤں اور مجرموں سے بھی بلند سمجھتا تھا۔ جب وہ اسے اپنا جیسا سمجھ کر اس قسم کی باتیں کرتے تو وہ ان سے لڑ پڑتا، انھیں مار بیٹھتا اور نتیجے کے طور پر اس کی سزا دو چار ماہ اور بڑھ جاتی۔

میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس طرح کوئی مفرور قیدی میرے گھر آگیا تو اس کے ساتھ کیا سلوک کروں گی۔ مگر اس وقت میں اس سے ہم دردی کیے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ میری غلطی کا خمیازہ بھگت رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔ میں نے اسے کھانا کھلانے کا ارادہ کرلیا ویسے بھی مجھے اندازہ تھا کہ بھوک کتنی موذی چیز ہے۔''

''کیا آپ کبھی بھوکی رہی ہیں؟'' میں نے یوں ہی تفریحاً پوچھ لیا۔

''جی ہاں...'' اس نے سنجیدگی سے کہا، ''اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا تھا جب

Marfat.com

ہم بٹوارے میں ہندوستان سے بھاگے تھے۔ آج تک میں بھوک کی وہ شدت نہیں بھولی تھی کہ جب انسان کا دل واقعی چاہتا ہے کہ وہ کواڑ پاپڑ سمجھ کر چبا جائے، کچھ کھا لے، کہیں سے کچھ مل جائے جو وہ منھ میں رکھ سکے، چاہے وہ زہر ہی کیوں نہ ہو، مگر کچھ نہیں ملتا...''
اس وقت اس کی آنکھوں میں سائے تھے جیسے وہ ماضی کے کھنڈروں میں گھوم رہی ہو، پھر یکایک وہ ماضی سے حال میں در آئی، ''میں نے اس سے کہا اگر تم وعدہ کرو کہ کھانا کھاتے ہی یہاں سے چلے جاؤ گے تو میں تمھیں کچھ کھانے کو دے سکتی ہوں مگر پناہ نہیں دے سکتی، اس نے اس بات کا وعدہ کرلیا اور میں سوچنے لگی کہ اسے کہاں بٹھاؤں۔ میں اسے خود سے بھی دور رکھنا چاہتی تھی اور گھر سے بھی الگ، باہر وہ جا نہیں سکتا تھا۔ بوبی، ہمارا بچہ ہے، اس وقت وہ میرے بستر پر سو رہا تھا، اس کا کمرہ خالی تھا، میں نے اس آدمی کو بوبی کے چھوٹے کمرے میں بٹھا دیا۔ جب میں دروازہ بند کرنے لگی تو اس نے جھپٹ کر پکڑ لیا، ''کیا تم مجھے بند کر کے پکڑوانا چاہتی ہو...'' میں صرف اپنی حفاظت کے لیے اسے بند کرنا چاہتی تھی مگر اس کا شبہ بھی ٹھیک تھا۔ میں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا۔ پینٹری میں جا کر ہیٹر پر ایک پیالہ دودھ گرم کیا، چار انڈے ابالے، میں یہ سب سامان بوبی کے لیے ہر وقت گھر میں رکھتی ہوں، ایک پلیٹ میں چند توس اور بسکٹ رکھے اور اس سے یہ کہنے چلی کہ وہ کھانا کھا کر پچھلے دروازے سے چلا جائے۔ ابھی میں وہاں پہنچی بھی نہ تھی کہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ پہلے آہستہ پھر زور زور سے۔ اس وقت میں ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگی۔ یہ خیال کہ میں ایک قیدی کے ساتھ مکان میں تنہا تھی، کنکھجورے کی طرح میرے دماغ پر ڈنک مارنے لگا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ گھبراہٹ میں جا کر میں نے اس سے کہا کہ، ''میرے شوہر آگئے ہیں، خدا کے لیے چلے جاؤ، اس سامنے والے دروازے سے نکل جاؤ... دستک کی آواز وہ بھی سن رہا تھا۔ اس نے مجھے حسرت سے دیکھا مگر شاید میری مجبوری سمجھ گیا۔ لرزتے ہوئے قدموں سے وہ اُدھر چلا اور جالی کا دروازہ کھول کر پچھلے برآمدے میں نکل گیا۔ میں نے لپک کر دروازہ بند کیا، اس کے بعد دوسرا لکڑی کا دروازہ بھی بند کیا اور جا کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔''
''مگر آپ نے یہ ساری بات اسد صاحب کو کیوں نہیں بتا دی۔ آخر انھیں بھی اندازہ ہوگا کہ اس نے آپ کی وجہ سے اتنی تکلیف اٹھائی۔ اس کے علاوہ ان کے ہوتے

Marfat.com

ہوئے آپ بھی زیادہ محفوظ ہوتیں...''

وہ چند لمحے خاموشی سے میرے چہرے کو تکتی رہی۔ جیسے پھر اسے میری اس نازیبا حرکت پر الجھن سی ہو رہی ہو... آخر دانت بھینچ کر وہ بولی۔

''میں اسد سے کبھی کوئی بات نہیں چھپاتی مگر یہ ایسی بات تھی جسے وہ کبھی نہیں سمجھتے۔ کسی مفرور قیدی کو کھانا کھلانے یا پناہ دینے پر شاید وہ اس کے بھوکے مر جانے کو ترجیح دیتے۔'' یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی مگر میں خاموش ہو گیا، ظاہر ہے وہ اپنے میاں کو مجھ سے زیادہ جانتی ہو گی۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر ہم سونے کے لیے لیٹ گئے مگر رات بھر مجھے عجب بے چینی رہی۔ رات بھر میں نیند اور بیداری کی کسی درمیانی منزل پر کھڑی عجیب وغریب خواب دیکھتی رہی۔ کبھی دیکھتی مچھلیوں کی طرح ٹھنسے ہوئے کمپارٹمنٹ میں جس کی کھڑکیوں اور دروازے کے آگے بڑے بڑے صندوق رکھے ہوئے ہیں اور سانس لینے تک کو جگہ نہیں ہے، میں بھوک سے نڈھال ہوئی جا رہی ہوں۔ باہر گولیوں کی سنسناہٹ کی آواز آ رہی ہے اور میں کہتی ہوں، بلا سے گولی لگ جائے لیکن یہ بھوک، یہ گھٹن مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ آخر میں ایک کھڑکی کھول دیتی ہوں۔ کئی ہاتھ مجھے پکڑنے کے لیے لپکتے ہیں اور پھر ایک گولی سیدھی آ کر میرے سینے میں پیوست ہو جاتی ہے۔ گھبرا کر میں اٹھ بیٹھی۔ پھر آنکھ لگی تو دیکھا کہ کوئی اَن جان مسافر بھوک سے سر سینے پر ڈالے، لق و دق صحرا میں چلچلاتی دھوپ میں تپتا، قدم قدم گھسٹ رہا ہے۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی ہیں، وہ آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے، ''میں چار دن کا بھوکا ہوں۔'' اور پھر وہ گھٹنوں میں سر ڈال کر جلتی ریت پر بیٹھ جاتا ہے اور میں چلا اٹھتی ہوں، ''یہاں نہ بیٹھو، خدا کے لیے چلے جاؤ۔'' اور ذرا دیر میں پھر سسکیاں۔ رات بھر ایسی بے چین نیند آئی کہ جیسے واقعی کسی بھوکے کو جلتی ریت پر آتی۔

صبح اٹھی تو جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ آنکھیں بوجھل تھیں، پپوٹے یوں کھٹک رہے تھے جیسے کسی نے مٹھی بھر بھر کر خاک آنکھوں میں جھونکی ہو اور پلکیں کھلتی ہی نہ تھیں جیسے کسی نے گوند سے چپکا دی ہوں۔ اسد اس وقت تک گہری نیند سو رہے تھے۔ ہلکی ہلکی روشنی پھیلی تو دل میں تھوڑا سا حوصلہ پیدا ہوا اور میں نے سوچا کہ ذرا اٹھ کر تو دیکھوں کہ کہیں وہ شخص

Marfat.com

یہیں کہیں دبکا ہوا تو نہیں ہے۔ سب سے پہلے پینٹری میں جا کر جھانکا جہاں چیزیں جوں کی توں پڑی تھیں، غسل خانہ بھی خالی تھا۔ تب آہستہ سے میں نے پچھلی طرف کا دروازہ کھولا اور برآمدے میں نکل آئی۔ اس برآمدے میں ایک اسٹور تھا جو خالی پڑا ہوا تھا۔ ممکن ہے، وہ اب تک وہاں چھپا ہوا بیٹھا ہو۔ مجھے خیال آیا۔ یوں ہی غیرارادی طور پر میں کمر تک آنے والی منڈیر سے لگ کر کھڑی ہوگئی اور نیچے جھانکا۔ اس وقت نہ اجالا تھا نہ اندھیرا۔ ملگجی سی روشنی تھی، اس روشنی میں میں نے دیکھا کہ کوئی شخص لوہے کے زینے کے عین نیچے اوندھے منہ بے سدھ پڑا ہے۔ غور سے دیکھنے کے لیے میں ذرا آگے بڑھ آئی۔ یہ وہی شخص تھا، اس وقت میں پھر گھبرا گئی۔ بڑی مشکل سے حواس مجتمع کر کے میں نیچے اتری یہ دیکھنے کے لیے کہ اس میں زندگی کی کوئی رمق ہے یا نہیں، وہ مر چکا تھا۔

ایکا ایکی میرا دل امنڈ آیا، مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرا کوئی بہت نزدیکی عزیز مر گیا ہے، میں ڈگمگاتے قدموں سے لوٹی، دروازہ بند کیا اور پھر اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی، اسی وقت مجھے دورہ پڑ گیا اور میں کئی دن سخت بیمار رہی...''

''اس شخص کی موت سے آپ اتنی متاثر کیوں ہوئیں، شاید اس لیے کہ اس کی حالت کی ذمہ دار آپ خود کو سمجھتی تھیں...'' میں نے کہا۔

''جی ہاں، مجھے بار بار یہی خیال آتا ہے کہ اسے میں نے مارا ہے۔ یہ بات میرے ذہن سے کسی طرح نہیں نکلتی کہ میری وجہ سے وہ جیل گیا جہاں اس نے کوڑے کھائے، گالیاں سنیں، چکی پیسی اور لڑلڑ کر اپنی سزا میں اضافہ کراتا رہا، پھر وہ بچ کر نکلا تو نہ جانے کون سی کھوہ میں چار دن بھوکا پڑا رہا۔ نامعلوم کون سے گندے نالے کا پانی پیا یا پانی بھی نہ ملا۔ پھر وہ اتفاق سے یا شاید قدرت کی طرف سے میرے دروازے تک پہنچا، میں سمجھتی ہوں کہ یہ قدرت کی طرف سے اس کی امداد تھی کہ وہ میرے گھر آیا، ورنہ کسی اور کے گھر جاتا تو لازمی طور پر دھتکار دیا جاتا یا پکڑا جاتا۔ قدرت کی طرف سے اتنی مدد کے ہوتے ہوئے بھی محض اپنی بیوقوفی سے میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکی۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ ابلے ہوئے انڈے، توس اور بسکٹ تو میں لمحے بھر میں اس کی جھولی میں ڈال سکتی تھی مگر میں اتنی گھبرا گئی تھی کہ اس وقت سوائے اس کے کہ جلد سے جلد اسے یہاں سے نکال دوں، اور کوئی خیال ہی نہ آیا۔ اب میں اکثر سوچتی ہوں، کاش میں نے اسے ٹھنڈا

Marfat.com

دودھ ہی دے دیا ہوتا اور انڈے ابالنے کی تکلیف نہ اٹھائی ہوتی...''

''واقعی آپ نے کچھ زیادہ تکلف کیا...'' میں نے کہا، ''حالاں کہ ایسی صورت میں آپ کی کوشش یہی ہونی چاہیے تھی کہ وہ جلد سے جلد کھا کر یہاں سے ٹل جائے...''

''آپ نہیں سمجھ سکتے۔'' اس نے دھیرے سے کہا، ''شاید میں اس صورت میں اپنے کیے کا زیادہ سے زیادہ کفارہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ اسد کئی راتوں سے دیر میں آرہے تھے اور مجھے یہ امید نہیں تھی کہ آج وہ اتنی جلدی آجائیں گے۔''

پھر وہ خاموش ہوگئی، میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے رومال سے آنکھیں صاف کیں اور کپڑے بدل بدل کر کیے جانے والے چوتھے بے ہنگم ناچ کو غور سے دیکھنے لگی۔ میں خیالات کی دنیا میں کھو گیا۔ جس وقت چونکا تو اسد اور وہ ہنس ہنس کر لوگوں کو رخصت کر رہے تھے۔ جانے وہ کب میرے برابر کی کرسی سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔

میں رخصت ہونے پہنچا تو لڑکیوں کا ایک جمِ غفیر ان کے نزدیک کھڑا چاؤں چاؤں کر رہا تھا۔ اس نقار خانے میں ایک قہقہہ بار بار ابھر کر خود کو نمایاں کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس قہقہے کی مالکہ بھی اس مجمعے میں خاصی نمایاں تھیں۔ گہرے نارنجی رنگ کے کپڑوں پر وہ تیز نیلے رنگ کا دوپٹا اوڑھے ہوئے تھیں۔ بال کھوپڑی پر کئی انچ اوپر اٹھ کر آبشار کی طرح ماتھے پر آن گرے تھے۔ بھنوؤں کی روایتی کمانیں کھنچی ہوئی تھیں اور نظروں کے تیر کبھی اِدھر کبھی اُدھر گر رہے تھے۔ باقی سب لڑکیاں بھی ان کی طرح ہک لگی موریوں کی شلواروں، منڈھی ہوئی قمیصوں اور قمیص کے بند میں پروئے ہوئے موٹے دوپٹوں میں ملبوس تھیں۔

''ارے بھئی، تم ان لوگوں سے نہیں ملے؟'' اسد نے مجھے دیکھ کر دور ہی سے ہانک لگائی۔ شاید وہ سمجھے کہ ان سے تعارف حاصل کرنے کے لیے میں مرا جا رہا ہوں۔

''میں ٹڈی دَل سے بہت گھبراتا ہوں۔'' آہستہ سے میں نے کہا مگر اس نے سن لیا، جس کا نام اس وقت تک مجھے پتا چل گیا تھا کہ صبا ہے، وہ مسکرانے لگی اور ایک اسمِ بامسمّٰی نے جن کا تعارف موصل خان کہہ کر کرایا گیا تھا، زور کا قہقہہ لگایا اور بے تکلفی سے میری پیٹھ پر دھپ مار کر بولے، ''سچ کہا ہے، ٹڈی دَل اور ٹیڈی گرل ہمارے ملک کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔'' لڑکیاں ان کے ساتھ مجھے بھی کڑوی کڑوی نظروں سے

دیکھنے لگیں، قہقہے کی مالکہ حسبِ عادت پہلے تو ہنس پڑیں پھر کچھ سوچ کر پنسل سے بنائی گئی آنکھوں سے مجھ پر خفگی کے تیر برسانے لگیں۔ میں معذرت کیے بغیر، اپنی پیٹھ کا ''زخم'' سہلاتا اسد و صبا کے ساتھ چلتا اپنے اسکوٹر پر آن بیٹھا۔

''آجایا کرو کبھی کبھی۔'' اسد نے کہا۔ میں نے صبا کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا، ''شمسہ باجی کو خط لکھیں تو ہمارا سلام لکھ دیں۔''

میں کچھ مایوس ہوا مگر حامی بھرلی اور دونوں کو خداحافظ کہہ کر بساطِ محفل پوری الٹنے سے پہلے ہی گھر چلا آیا اور اپنے ساتھ کیا دکھ لایا، یہ پوری طرح کبھی بیان نہ کرسکوں گا۔ کچھ چیزوں کو محسوس کیا جاسکتا ہے، بیان نہیں کیا جاسکتا... کرن کے ہالے میں وہ چاند سا چہرہ، وہ موٹی موٹی آنکھیں، وہ میٹھی اور رواں آواز جسے سننے میں چمنستان ہوٹل گیا تھا۔ یہ تمام چیزیں مجھے دوبارہ دیکھنے اور سننے کا موقع دینے کے باوجود کوئی سکھ نہ دے سکیں، سوائے ایک کسک اور خلش کے کہ جس کا کوئی نام نہیں...

○○○

Marfat.com

۲

اس کے باوجود کہ اسد نے اپنے ہاں آتے رہنے کو کہہ دیا تھا، میں کئی دن تک وہاں نہیں گیا۔ ہمت ہی نہیں پڑتی تھی۔ دل یوں بجھ گیا تھا جیسے کوئی قطب مینار کی بلندی پر چڑھنے کا ارادہ کرلے اور پہلے ہی قدم پر اوندھے منہ گر پڑے۔ پھر ایک دن اسد نے مجھے فون کیا اور اپنے ہاں آنے کو کہا۔ شاید پرانے تعلقات یا شمسہ باجی کے ناتے وہ مجھ سے ملتے رہنا چاہتے تھے۔ اس دن بیٹھ کر میں نے اپنے دل سے معاملہ صاف کیا۔

''تمھیں اس لڑکی سے محبت نہیں ہے، کہو ہاں۔'' دل نے بے دلی سے کہا ہاں... پھر میں نے دل کو اچھی طرح سمجھایا کہ پہلی نظر میں کسی کی ظاہری شخصیت سے متاثر ہوکر ذرا کی ذرا اسے پسند کرلینے، یا دوبارہ ملنے کی خواہش نہ کسی قوی تر جذبے کے تحت ہے، نہ گناہ ہے نہ جرم ہے، صرف ایک فطری چیز ہے، جب وقت گزر جائے گا اور ہم بار بار ملیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اکثر پہلی بار کا سحر بار بار ملنے اور دیکھنے سے اُتر جاتا ہے جس طرح اندھیرے سے روشنی میں آؤ تو پہلی چندھیاہٹ کے بعد آنکھیں اصلی حالت پر آجاتی ہیں، پھر میں نے اپنی وہ نوٹ بک نکالی جس میں کالج کے زمانے سے جہاں کہیں بھی محبت کی تعریف مجھے نظر آئی تھی اس میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اس میں عشقِ حقیقی سے لے کر میراجی تک کی محبت کی ساری قسمیں اور شیکسپیئر سے لے کر میرے دوستوں تک کے ہر قسم کے خیالات موجود تھے، اس میں مولانا روم کی مثنوی کا اقتباس تھا۔

از محبت تلخہا شیریں شود
از محبت مسہار زریں شود

Marfat.com

از محبت دُرد ہاصافی شود
از محبت درد ہاشافی شود
از محبت دار تختے می شود!
از محبت بار بختے می شود

اور

Love is Life's end (an end but never ending) All joys all sweets, all happiness arronding Love is Life's wealth (never spent but ever spending) more rich by giving, taking by discarding.

اور شیفتہ کا وہ مشہور زمانہ شعر:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اور غالب کا اسی قسم کا شعر:

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اور وہ بدنامِ زمانہ مصرع:

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تھاس مور کا مقولہ:

There's nothing so sweet in life as Love's young dream.

کالرج کی نظم، محبت کا اقتباس:

All thoughts, all passion, all delights whatever stirs this mortal frame.

Are but the ministers of Love, And feed his sacred flame.

اور ان سب کے آگے میرے دوستوں نے اپنے اقوال تحریر کیے تھے جیسے ہمارے ہاں کی لائبریری کی کتابوں پر پڑھنے والے کی رائے اور اُس رائے پر رائے اور

Marfat.com

پھر اس رائے پر کسی اور صاحب کی رائے درج ہوتی ہے، جانے ان کم بختوں کے ہاتھ یہ نوٹ بک کیسے اور کب لگ گئی تھی۔ ایک نے اپنی شکستہ طرزِ تحریر میں لکھا تھا۔ ''محبت داڑھ کے درد کی طرح ہے کہ جب ہے تو سوائے اس کے کسی اور طرف دھیان ہی نہیں جاتا مگر جب ختم ہو جائے تو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ کبھی تھا بھی۔'' اسی انداز میں ان کے دستخط تھے۔ محمد جلیس یہ وہ صاحب تھے جو زمانۂ طالب علمی میں ہر چھ ماہ بعد نہایت شد و مد اور خلوص سے ایک نیا عشق کرتے تھے۔ ہر لڑکی کو سماج سے بغاوت کر کے اپنے ساتھ بھاگ جانے پر اُکساتے تھے اور جتنی دیر میں وہ ان کے خیال سے متفق ہو، ان کی اپنی رائے بدل جاتی تھی۔ دوسرے صاحب نے عین اس بیان کے نیچے لکھا تھا۔ ''نہیں یار... محبت داڑھ کے درد کی طرح نہیں سر کے درد کی طرح ہے جو آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، اس کا احساس سوتے جاگتے ہر وقت آپ پر مسلط رہتا ہے اور آپ کو کسی کام کے قابل نہیں چھوڑتا... آہستہ آہستہ کم ہوتا ہے اور ختم ہونے کے بعد بھی اس کے اثرات بہت دیر تک باقی رہتے ہیں۔''

میں نے یہ سب مختلف اور متضاد رائیں بطور خاص دل کو سنائیں کہ جہاں اتنا اختلاف ہو وہ مسئلہ سرے سے قابلِ غور ہی نہیں۔ اس کے بعد میں تیار ہو کر چمنستان ہوٹل چلا گیا۔ وہاں دو لڑکیوں سے میرا تعارف کرایا گیا۔ ایک روبینہ تھی دوسری اس کی بہن سہیلہ۔ یہ صبا کے ابا کے دوست کی لڑکیاں ہونے کے ناطے شاید صبا کی سہیلیاں تھیں ورنہ ان میں اور صبا میں کوئی چیز مشترک نہیں تھی۔ روبینہ وہی لڑکی تھی جسے شادی کی سال گرہ کے دن میں نے پے بہ پے قہقہے لگاتے سنا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ قہقہوں کا اسٹاک ابھی تک جوں کا توں موجود ہے میرا یہ خیال بھی کہ وہ قہقہے خاص خاص تقریب کے موقعے پر نکالے جاتے ہوں گے، غلط نکلا کیوں کہ آج معلوم ہوا کہ وہ تو روز کی دال روٹی ہو چکے تھے۔ اس وقت سب باہر کمروں کے آگے والے چھوٹے لان میں بیٹھے تھے اور سب کی دلچسپی اس ٹورسٹ بس کی طرف تھی جو شاید ابھی ابھی آ کر ٹھہری تھی۔ بس کا حلیہ ایسا تھا جیسے کوئی خوب صورت بچی دھول میں لت پت ہو اور بس پر کیچڑ کی تہیں جمی ہوئی تھیں مگر اوپر سے اس کا خوب صورت کریم رنگ اس کے نئے ہونے کی شہادت دے رہا تھا اور شیشے کی چوڑی چوڑی کھڑکیوں سے سُرخ مخمل کی آرام دہ سیٹیں جھانک رہی

تھیں۔ اس بس میں سے جو مرد اور عورتیں اُترنی شروع ہوئیں تو اُترتی ہی چلی گئیں۔ کل ملا کر کوئی تیس بتیس مسافر ہوں گے، اُترتے جاتے تھے اور وہیں گھاس پر بیٹھتے جاتے تھے۔ رنگ برنگے کپڑوں کی وجہ سے معلوم ہو رہا تھا جیسے رنگ برنگی تتلیاں آ کر گھاس پر جم گئی ہوں، اکثر مرد بھی سُرخ بیر بہوٹی ایسی قمیصیں اور پل اوور پہنے ہوئے تھے۔

''ٹورسٹ کی نئی کھیپ...'' اسد نے دلچسپی سے انھیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ ٹورسٹ اکثر آتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کبھی کبھی...'' اسد نے کہا۔ ''میں نے آج انھیں کی وجہ سے تو بلوایا ہے تمھیں۔ سوچا تم کہو گے ایسے موقعے پر بھی مجھے یاد نہیں کیا...'' خواتین کی نظر بچا کر انھوں نے مجھے آنکھ ماری۔

''شکریہ...'' میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔

''یہ ٹورسٹ اکثر آتے ہی رہتے ہیں۔'' صبا نے کہا، ''کبھی کسی کار میں کوئی جوڑا، کبھی چھوٹی سی بس میں چار چھ آدمی اور کبھی پوری بس بھری ہوئی، ابھی چند دن ہوئے ایک بس آئی تھی جو انگلینڈ سے بمبئی جا رہی تھی، یہ لوگ بمبئی پہنچ کر ہوائی جہاز سے انگلینڈ چلے جاتے ہیں اور بمبئی سے ایک اور قافلہ بس سے روانہ ہوتا ہے جو ہوائی جہاز سے واپس آتا ہے، اس طرح یہ سلسلہ قائم رہتا ہے۔''

''یہ تو بڑی عمدہ چیز ہے...'' میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ بس کی پیشانی پر انگلینڈ... سیلون... آسٹریلیا لکھا ہوا تھا۔

''گویا اب یہ آسٹریلیا تک جائے گی...'' میں نے کہا۔

''یہ بس پانی میں بھی چلتی ہے۔'' روبینہ نے کہہ کر مخصوص قہقہہ لگایا اور مجھے کچھ ایسی داد طلب نگاہوں سے دیکھا کہ میری نظریں جھک گئیں۔

چند پیر مرد آفس میں شاید کمروں کا بندوبست کرنے گئے تھے، وہ لوٹ کر آئے تو سب کپڑے جھاڑ کر اُٹھ بیٹھے۔ مردوں نے بس میں سے سامان اُتارنا شروع کیا۔ یہ بڑے بڑے جہاز کے جہاز سوٹ کیس ڈٹا ڈٹ بھرے، پھولے پیٹوں والے تھیلے یہ دھان پان سی لڑکیاں عورتیں اور سفید بالوں والی بڑھیاں ایک ایک کئی کئی عدد لادے مزے سے سیڑھیاں چڑھنے لگیں، ایک ایک کمرے میں چھ چھ عورتیں ٹھہر رہی تھیں۔ مردوں کو سنگل

Marfat.com

سیٹ میں جگہ ملی تھی۔ اپنا اپنا سامان رکھ کر وہ بھدر بھدر کرتی اُتریں اور چائے پینے چلی گئیں۔ ان لڑکیوں میں ایک چھوٹے سے قد کی سیاہ آنکھوں اور سیاہ بالوں والی جاپانی کٹ لڑکی تھی۔ وہ لڑکی برابر ہنس رہی تھی۔ اُس نے ہمیں وِش کیا اور روبینہ جا کر اسے پکڑ لائی۔

''ہوٹل پسند آیا؟'' اسد نے اخلاقاً پوچھا۔

''بہت... اس سے پہلی رات تو ہم نے اپنے خیموں میں سکڑ سکڑ کر گزار دی۔ یہ ہوٹل تو جنت معلوم ہو رہا ہے...'' اس کے چمکیلے دانت دکھائی دیے... وہ بڑی ہنس مکھ معلوم ہوتی تھی اور بہ مشکل پندرہ سولہ سال کی نظر آتی تھی، میں ذرا دور پڑی ہوئی ایک کرسی گھسیٹ لایا اور وہ مزے سے بیٹھ گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ تھائی لینڈ کی رہنے والی ہے اور اب وہیں جا رہی ہے۔ سیلون سے وہ بذریعہ جہاز جائے گی۔

''اکیلی ہو؟'' صبا نے حیرت سے پوچھا۔

''اور کیا...'' وہ ہنس پڑی۔ ہم میں صرف دو جوڑے ہیں۔ باقی اپنی اپنی ڈفلی، اپنا اپنا راگ۔''

اس نے بتایا کہ ان کے ساتھ زیادہ تر آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے باشندے ہیں جو اب تین تین چار چار سال بعد اپنے وطن لوٹ رہے ہیں، اس نے کہا کہ یہ لوگ باقی دنیا سے اتنے الگ ہوتے ہیں کہ بڑے ہوتے ہی ان کو انگلینڈ جا کر جسے اب تک یہ اپنا ہوم لینڈ سمجھتے ہیں کام کرنے کا شوق چراتا ہے، اب کچھ دن یہ لوگ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ رہیں گے اور جب دل گھبرائے گا تو پھر کسی ایسے ہی قافلے کے ساتھ واپس انگلینڈ چلے جائیں گے۔ راہ میں ان کو چار ماہ کا عرصہ لگتا تھا۔ مگر ان پر تھکن کا نام ونشان بھی نہیں تھا، ہنس رہے تھے۔ کھلکھلا رہے تھے وہ لڑکی بھی تھوڑی دیر باتیں کر کے ہنستی، بچوں کو اشارے کرتی، چھوٹے چھوٹے تیز قدم رکھتی چائے پینے چلی گئی۔

''ان لوگوں کی وجہ سے ہوٹل میں خوب رونق رہتی ہوگی؟'' میں نے کہا۔

''خوب...'' صبا بولی۔ ''علی الصبح یہ لوگ ناشتہ کرتے ہیں پھر پیدل کسی سے بازار کا پتا پوچھ کر چل دیتے ہیں۔ وہاں سے کچھ خریدا، کچھ دیکھا تصویریں لیں پھر کوئی پیدل چلا آ رہا ہے کوئی تانگے پر۔ ہوٹل میں تانگا کیا آتا ہے جیسے کوئی عجوبہ آ گیا۔ ہر ایک اپنا

Marfat.com

کیمرا لے کر دوڑتا ہے۔ تانگے سے اُترنے والوں کو روک دیا جاتا ہے اور تصویریں لی جاتی ہیں کوئی لڑکی گھوڑے کو تھپتھپا رہی ہے، تانگے والا بھی خوشی خوشی تصویر کھنچواتا ہے اور تو اور یہ لوگ تانگے والے کو پیسے دیتے ہوئے لڑتے جھگڑتے بھی ہیں، شاید کوئی بتا دیتا ہے کہ یہاں یوں ہی ہوتا ہے۔"

"جی ہاں۔ مڈل ایسٹ سے ہوتے ہوئے آتے ہیں نا۔" میں نے کہا۔

"کتنے دن ٹھہرتے ہیں یہ لوگ۔" روبینہ بولی۔

"مشکل سے دو دن۔ مگر کمال یہ ہے کہ جب ٹورسٹ آتے ہیں ہم ہوٹل میں رہنے والوں کو بعض دفعہ پتا نہیں چلتا مگر یہاں کے لڑکوں کو اور قالین اور کشمیری شال بیچنے والوں کو فوراً پتا چل جاتا ہے۔" صبا نے کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے کہا۔

"یہ تو پتا نہیں، مگر دوسرے دن ابھی بازار سے یہ لوگ نہیں لوٹتے کہ ہمارے ہاں کے لڑکے اپنی کاریں اور اسکوٹر دبائے حاضر ہو جاتے ہیں۔"

"دیدار کرنے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف دیدار نہیں بھئی..." اسد نے کہا۔ "شہر اور آس پاس کے علاقے دکھانے کے بہانے ساتھ بھی لے جاتے ہیں۔ رات کو کھانے پر واپسی ہوتی ہے... تم تو آج ہی سلیکٹ کر لینا۔"

"یہ تھائی لینڈ والی کیسی رہے گی، بے چاری بالکل اکیلی ہے۔" صبا نے شرارت سے کہا، اس کے سفید دانتوں کی لڑی اور مترنم ہنسی میرے حواس پر پھوار بن بن کر گرنے لگی۔

"جی نہیں، شکریہ... میں اڑتے پنچھیوں سے دل نہیں لگایا کرتا۔" میں نے کہا۔

"بڑے ہوشیار ہیں آپ..." روبینہ بولی۔

"آپ کی دُعا سے..." میں نے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کو ملتا کیا ہے، اگر ایسے ہی غیر ملک کے لوگوں سے ملنے، باتیں کرنے اور سیر کرانے کا شوق ہے تو مردوں میں سے کسی کو کیوں نہیں لے جاتے۔" روبینہ بولی۔

Marfat.com

''ان کے ہاں dates اسی طرح ہوتی ہیں اور اس میں برائی ہی کیا ہے۔'' اسد نے کہا۔

''میں نے تو آج تک کسی ٹورسٹ کو قالین، دری یا شال خریدتے نہیں دیکھا'' صبا نے یکایک موضوع پلٹ دیا۔ ''بس یہ ہے لان میں بیٹھے مال دیکھ لیتے ہیں اور کیمرے کھڑکھڑانے شروع کر دیتے ہیں۔''

''ہر شہر سے اتنی قیمتی چیزیں خریدیں تو پہلی ہی منزل پر کنگال ہو جائیں، غریب اور ہر ایک کے ساتھ سامان کا ڈھیر لگ جائے'' میں نے کہا۔

''یہاں سے ٹورسٹ ایک ہی چیز خریدتے ہیں، قراقلی ٹوپیاں۔'' اسد نے کہا۔

''مجھے تو ان پر بڑا رشک آتا ہے۔'' روبینہ بولی، ''چار مہینے تک روز ایک نئی جگہ دیکھنا، سیر اور سیر اور سیر...'' اس کے بعد اختتام کے طور پر اس نے وہی قہقہہ لگایا۔

''جی ہاں... بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہی لوگ ہیں جو نہ تھکتے ہیں نہ اکتاتے ہیں... نامعلوم ان کی آپس میں بنتی کیسے ہے۔'' صبا نے کہا۔

''کیوں بننے کو کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''اجی جناب... اس ہوٹل میں جہاں سب کے الگ الگ کمرے ہیں، کسی کو کسی سے کوئی واسطہ نہیں روز دنگے فساد ہوتے ہیں، عورتیں تو عورتیں مردوں کی کئی معرکہ آرا لڑائیاں میں دیکھ چکی ہوں۔

''واقعی؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''جی ہاں... ایک مرتبہ ہم سب مل کر اڑک کے چشموں تک چلے گئے تھے۔ اتنی ہی دیر میں سب کو ایک دوسرے سے اتنی شکایتیں پیدا ہوگئیں کہ ہفتوں تک اس کا اثر رہا...''

''ہمارے ہاں رواداری اور اخلاق کم ہو رہا ہے، خود غرضی بڑھ رہی ہے، یہی وجہ ہوسکتی ہے، کیوں اسد صاحب۔''

مگر اسد نے میری بات نہیں سنی۔ وہ چائے پی کر نکلنے والوں کے جمگھٹوں میں کھو گئے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے ایک ٹورسٹ بڑے میاں ادھر آنکلے کہ جن کے منھ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت۔ ان سے باتیں ہونے لگیں، وہ بھی اپنی راہ کی مشکلات ہنس ہنس کر بیان

Marfat.com

کرتے رہے، ان کے پوپلے منہ سے یہ قصے بہت اچھے لگے، پھر اسد کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ اس سارے سفر میں ان کے تقریباً تین سو پونڈ خرچ ہوتے ہیں۔

''تین سو پونڈ تو کچھ بھی نہیں ہیں...'' اسد اور روبینہ نے ایک ساتھ کہا۔

''کچھ بھی نہیں ہیں؟'' بڑے میاں نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ''ہم لوگوں کے لیے تو بہت کچھ ہیں، ان لڑکیوں نے تین چار سال میں یہ رقم بچائی ہے جیسے ہی یہ اپنے ملک پہنچیں گی بے چاریوں کو پھر کام ڈھونڈنا پڑے گا۔''

مجھے خوشی ہوئی کہ کس طرح صفائی سے اس ٹورسٹ نے اس بات کا اقرار کرلیا کہ تین سو پونڈ کی رقم ان کے لیے خاصی بڑی ہے۔ ہمارے ہاں کے لوگ یہ بتانا کتنا ضروری سمجھتے ہیں کہ روپیہ ہماری نظر میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا کیوں کہ ہم بڑے پشتوں کے رئیس زادے ہیں، شاید اسد اور روبینہ کو اس بات سے کچھ سبق ملا ہو۔

''آج رات تم سب ہمارے ساتھ کھانا کھا لینا۔ کھانے پر بڑا مزہ آتا ہے'' بڑے میاں کے جانے کے بعد اسد ہم سے مخاطب ہوئے، میں نے انکار کرنا چاہا مگر صبا کے ساتھ روبینہ اور سہیلہ بھی اصرار کرنے لگیں، ناچار میں راضی ہوگیا۔ مگر کھانے پر مجھے قطعی مزہ نہیں آیا۔ ساری میزیں ملا کر انھوں نے ایک لمبی میز بنادی تھی جو سارے حال کی چوڑائی کے برابر تھی۔ اس پر چاروں طرف ٹورسٹ براجمان تھے۔ ہوٹل کے مکین اپنی اپنی میزیں ڈھونڈتے پھرتے، دو ایک میزیں جو الگ رہ گئی تھیں، انھیں پر باری باری انھیں بٹھا دیا جاتا۔ بیرے مستقل ٹورسٹ لوگوں کو سرو کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ مار ہلڑ مچی ہوئی تھی، اس قدر زور سے بولنا، ہنسنا شور و شغب... کھانا روزمرہ سے خراب تھا جیسا کہ اسد اور صبا نے بتایا اور بیرے ایک کورس کے بعد آپ کو قطعی بھول کر پھر اسی بڑی میز میں جا کر پھنس جاتے تھے کافی پینے کے بعد ہم سب ٹہلنے کے لیے نکلے۔

روبینہ اور سہیلہ اسد کے دائیں بائیں چل رہی تھیں اور ان انگریزی ریکارڈوں کے متعلق روانی سے بتا رہی تھیں جو حال ہی میں خرید کر لائی تھیں۔ میں ان سے ذرا پیچھے صبا کے ساتھ چل رہا تھا۔

''اب تو کبھی آپ کو اس مفرور قیدی کا خیال نہیں آتا؟'' میں نے پوچھا۔

''آتا ہے۔'' صبا نے کہا، ''اب بھی اکثر مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی، ایسا معلوم

Marfat.com

ہوتا ہے جیسے وہ شخص اب بھی میرے ہاں کسی نامعلوم جگہ چھپا ہوا ہے، وہ کسی وقت بھی باہر نکل آئے گا اور کہے گا تم ایک بھوکے شخص کے گھر میں ہوتے ہوئے دن میں تین مرتبہ کس طرح کھانا کھا لیتی ہو۔ رات کو اسد باہر جانے لگتے ہیں تو مجھے ڈر لگتا ہے اور... میں نے اسد کو سارا قصہ بتا دیا ہے۔"

"بتا دیا ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اور کیا... میں ان سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتی۔"

مجھے یوں لگا جیسے ایک راز جو صرف مجھے اور اسے معلوم تھا اس نے کسی تیسرے شخص کو بتا کر میری حق تلفی کی ہے۔ کتنا بے ہودہ تھا یہ احساس اسد اس کا شوہر تھا اور اسے بتانا ہی چاہیے تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولی، "میں نے کہیں پڑھا تھا کہ کئی ملکوں میں پھانسی قطعی ممنوع ہے، کیا یہ بات ٹھیک ہے؟"

"جی ہاں... میں نے کہا۔"

"کیوں۔ وہ قتل کی سزا پھانسی کیوں نہیں دیتے؟" وہ تعجب سے بولی۔

"اس لیے کہ پھانسی سزا کے مقصد کو پورا نہیں کرتی۔"

"سزا کا مقصد یہی ہے نا کہ جو بُرا کام کرے اس کی سزا بھگتے۔" اُس نے بچوں کی طرح کہا۔

"سزا کا مقصد ہے اصلاح اور قانون کی وقعت منوانا۔"

"قانون کی وقعت بذاتِ خود تو کوئی چیز نہیں، قانون دوسروں کے تحفظ کے لیے ہے، جو کوئی قانون توڑتا ہے وہ کسی نہ کسی کے لیے خطرہ ہے اس لیے اسے سزا ملتی ہے۔"

"جی ہاں، اسے سزا اس لیے بھی ملتی ہے کہ وہ آئندہ ایسا نہ کرے اور اس کو دیکھ کر دوسرے بھی ایسا نہ کریں۔ یہ قانون کی وقعت و عظمت کا مسئلہ بھی ہے اور آئندہ ایسا نہ کرنے میں اصلاح کا پہلو بھی ہے۔ پھانسی سے قانون کی وقعت تو رہ جاتی ہے لیکن اصلاح کی گنجائش نہیں رہتی۔ پھانسی کے خلاف ایک اعتراض یہ ہے کہ قانون کسی کو قتل کرنے پر پھانسی کی سزا دیتا ہے تو وہ خود اُس جرم کا مرتکب ہو رہا ہے یعنی دوسرے کی جان لینے کا۔ اس میں انتقام کی بات آجاتی ہے، اور انصاف میں انتقام جائز نہیں۔"

Marfat.com

''انتقام تو وہ لیتا ہے جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو۔ قانون تو صرف انصاف کرتا ہے اور انصاف میں خون کا بدلہ خون ہے۔''

مگر اخلاقیات میں خون کا بدلہ خون نہیں ہے۔ اسی لیے روز بروز لوگ اس کے خلاف ہو رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ جان خدا کی امانت ہے اور کوئی فرد یا ادارہ اسے لوٹا نہیں سکتا اس لیے وہ کسی کی جان لے بھی نہیں سکتا۔ ممکن ہے ایک زمانہ ایسا آئے جب دنیا بھر میں پھانسی کی سزا کا وجود نہ ہو۔'' میں نے کہا۔

''یوں تو ممکن ہے ایک زمانہ ایسا بھی آئے جب سرے سے سزا کا وجود ہی نہ ہو مگر ایسا زمانہ مستقبل قریب میں تو نظر نہیں آتا، ابھی تو عالمی جنگوں اور مہلک ہتھیاروں ہی کا فیصلہ نہیں ہو پایا۔''

''پھانسی کی سزا نہ ہونے سے میرا مطلب یہ تھا کہ قتل کے جرم کے ہوتے ہوئے بھی پھانسی کی سزا نہیں ہوگی۔''

''پھر قتل کی سزا کیا ہوگی؟'' اس نے پوچھا۔

''قید... جس طرح اور جرموں کی سزا قید ہوتی ہے۔''

''آپ کے خیال میں قید کا مقصد کیا ہوتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجرم کو یہ بتانا کہ جو چیز اس کی نہیں ہے اس پر اس کا حق نہیں ہے اگر وہ اسے حاصل کرتا ہے تو قانون توڑتا ہے، سزا اسے اپنے جرم پر پچھتانا اور قانون کی وقعت کرنا سکھاتی ہے۔''

لیکن ایک آدمی چوری کے الزام میں جیل جانے کے بعد جب نکلتا ہے تو پھر چوری کرتا ہے اس کا مطلب ہے اس کی سزا بے کار ہوگئی کیوں کہ نہ تو وہ اپنے جرم پر پچھتایا اور نہ قانون کی وقعت اس کے دل میں پیدا ہوئی۔

''اس کا ذمہ دار ہمارے جیل کا ماحول ہے اور جیل سے نکلنے کے بعد وہی معاشرہ جس نے اسے چوری کرنے پر مجبور کیا تھا بلکہ اب وہ اس کے لیے پہلے سے بدتر ہے کیوں کہ اب وہ سند یافتہ قیدی ہے اور ہم لوگ اسے انسان نہیں صرف قیدی سمجھتے ہیں۔''

''آپ کی اصلاح کا مقصد جیل میں تو پورا نہیں ہوتا کیوں کہ وہاں اس قسم کا کوئی انتظام نہیں تو قیدی کی اصلاح کا سارا دار و مدار اس کے ضمیر پر ہے۔''

Marfat.com

''بدقسمتی سے ہمارے ملک میں یہی حال ہے۔ ویسے عام طور پر قیدیوں کی اصلاح پر بہت زور دیا جارہا ہے بلکہ نفسیات کی اس تھیوری نے کہ مجرم عموماً ذہنی مریض ہوتے ہیں، ان کے علاج کی طرف بھی توجہ کرا دی ہے۔''

''ہمارے ملک میں اچھے خاصے ذہنی مریضوں کو کوئی نہیں پوچھتا تو مجرموں کو کون پوچھے گا۔'' اس نے کہا، ''ہر شہر میں دسیوں پگلے ہمارے ہاں سڑکوں پر گھومتے نظر آتے ہیں جن میں تھوڑی بہت علامات پائی جاتی ہوں ان کی تعداد تو نہ جانے کتنی ہوگی۔'' اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ہمارے ہوٹل میں بھی اکثر ایک پاگل آیا کرتا ہے اور بچے اس کا وہ تماشہ بناتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔''

''یہ کام آہستہ آہستہ ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں... ہمارے ہاں ضرورت سے زیادہ آہستہ ہوتے ہیں یا ہوتے ہی نہیں کیوں کہ یہاں اجتماعی بہبودی اور ترقی کا تصور ہی نہیں ہے۔''

میں اس کی بات سے حیران سا ہوا۔ یہ سیدھی سادھی، موٹی چوٹی والی لڑکی جو اتنی کم عمر سی نظر آتی ہے کیا واقعی اجتماعی بہبودی اور ترقی کا صحیح شعور رکھتی ہے...؟

میں نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے آپ نے ان چیزوں پر خاصا غور کیا ہے۔''

''کوئی خاص نہیں... مگر نہ جانے کیوں مجھے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ہم لوگ کسی غلط راستے پر جا رہے ہیں۔ میں وکالت کے متعلق زیادہ نہیں جانتی، مجھے نہیں معلوم اس میں کتنی سچائی اور ایمان داری ہے لیکن دوسرے پیشے کے بہت سے آدمیوں کو میں نے دیکھا ہے اور انھیں دیکھ کر مجھے دُکھ ہوتا ہے۔''

''مثلاً؟'' میں نے کہا۔ اس کی وکالت کے پیشے میں سچائی اور ایمان داری کی بات نے شاید میری پیشانی پر چند قطرے پسینے کے پیدا کر دیے ہوں۔

''کارکردگی ہر محکمے میں بہت کم ہے۔ ذاتی فائدے کے لیے لوگ دوسروں کو، اپنے دوستوں تک کو نیچا دکھانے سے نہیں چوکتے آپ نے کبھی مغربی پاکستان کے دوسرے علاقوں میں جا کر دیکھا ہے کہ اٹھارہ سو کچھ کے پل جوں کے توں قائم ہیں اور چند سال پہلے کے بنائے ہوئے پُلوں پر آئے دن مرمت ہوتی رہتی ہے۔ بعض جگہ یہی پُل دوبارہ بنائے جا رہے ہیں۔ بڑی بڑی پبلک عمارتوں میں جنھیں لاکھوں روپے کے خرچ سے بنایا

Marfat.com

جاتا ہے، عمارت ختم ہونے سے پہلے دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ اس سب کے پیچھے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوگی۔"

"ضرور ہے۔" میں نے کہا۔

"کلیم کا مسئلہ حل ہو رہا ہے مگر اس میں بھی یہی ہوا کہ جن کے پاس کچھ نہیں تھا لاکھوں کے مالک بن گئے اور جن کے پاس تھا وہ کلیم کی کتابیں اونے پونے بیچ کر کھا رہے ہیں اور ڈاکٹروں کی ہوس دیکھ کر تو میرے ہوش اڑتے ہیں، میرا خیال ہے ہمارے ملک کے دشمن جتنے اسمگلر اور بلیک مارکٹنگ کرنے والے ہیں اتنے ہی یہ خود غرض ڈاکٹر بھی ہیں۔"

"جی ہاں، اسمگلر اور بلیک مارکیٹیے قومی معاشیات سے کھیلتے ہیں اور یہ لوگ انسانی جانوں سے کھیلتے ہیں۔" میں نے کہا، "مگر میرا خیال ہے جب ملک میں خوش حالی ہو جائے گی۔ ہر چیز افراط سے ملے گی۔ ڈاکٹر زیادہ ہو جائیں گے اور طبی امداد آسانی سے ملنے لگے گی تو یہ دھاندلیاں بھی خود بخود ختم ہو جائیں گی۔"

"اچھا..." اس نے یوں خوش ہو کر کہا جیسے میرے کہتے ہی یہ ساری دھاندلیاں ختم ہوگئی ہوں۔ آپ کا یہ خیال ہے۔"

"مجھے یقین ہے۔" میں نے اپنے لہجے کو اپنے یقین سے کہیں زیادہ پُر زور بنا کر کہا تاکہ وہ خوش ہو جائے۔

معلوم نہیں وہ خوش ہوئی یا نہیں مگر خاموش ہوگئی۔ آہستہ آہستہ ہم اسد اور دونوں لڑکیوں کے برابر پہنچ گئے... دُور سے چمنستان ہوٹل کا پچھلا حصہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا، "سامنے سے یہ ہوٹل جتنا شان دار ہے، پیچھے سے اتنا ہی بدنما نظر آتا ہے۔ یہ پچھلے کمرے اندھیرے اور کبوتروں کے کابکوں کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔"

"یہ ہوٹل ہماری قومی زندگی کا سمبل ہے" صبا نے کہا۔ آج اس پر قومیت بے طرح سوار تھی۔

"ہاؤ ونڈر فل۔" روبینہ نے صبا کے جملے کی داد دے کر قہقہہ لگایا مگر صبا نے اس کو نظر انداز کر کے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس ہوٹل کے آگے سرسبز لان اور رنگ برنگے

Marfat.com

پھول ہیں۔ ڈرائنگ روم کے جگمگاتے فانوس نما شیڈ ہیں۔ پیڑوں کے بیچ میں سے جھانکتی ہوئی رنگین روشنیاں ہیں اور یہاں سے وہاں تک لمبی لمبی کاریں ہیں اور پیچھے صرف پتھر اور دھول ہے، پندرہ واٹ کے ٹمٹماتے ہوئے بلبوں کی روشنی ہے اور ویرانی ہے۔''

''اٹ اِز ریئل پوئٹری۔'' روبینہ نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''اس میں اتنے جذباتی ہونے کی کیا بات ہے۔'' اسد بولا۔ ظاہر ہے ہر چیز کے اگاڑے پچھاڑے میں فرق ہوتا ہے۔''

ہم سب ہنس دیے اور بات آئی گئی ہو گئی۔

''میں آپ کی قوتِ تخیل کی داد ضرور دوں گا۔'' چند قدم آگے چل کر میں نے صبا سے کہا۔

''یہ تو ان کی ٹریجڈی ہے۔'' اسد نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

یکایک کسی پکچر کا پوسٹر سہیلہ کی نظر پڑ گیا۔ اُس نے روبینہ کو مطلع کیا اور روبینہ نے اسد کو۔ وہیں کھڑے کھڑے سیکنڈ شو دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ طے یہ ہوا کہ کار لے کر پہلے روبینہ، سہیلہ کے گھر جا کر اطلاع دی جائے اور پھر پکچر دیکھی جائے۔ میں سب کے ساتھ خاموشی سے چلتا رہا۔ مگر ہوٹل پہنچ کر میں نے کام کے بہانے پکچر سے معذرت چاہ لی اور اپنا اسکوٹر سنبھال واپس چلا آیا۔ گھر آ کر میں نے دل کو فخریہ مخاطب کیا کہ دیکھا کس طرح بیماری کی علامات پوری طرح ظاہر ہونے سے پہلے ہی میں نے اس پر قابو پا لیا۔ کس طرح دل جمعی سے میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، جرم و سزا کی بحث میں حصہ لیا اور کچھ بھی تو نہ ہوا۔ نہ زمین اپنی جگہ سے ہلی نہ آسمان زیر و زبر ہوا، دل نے کچھ بوجھل پن سے کہا، ''ہاں... ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔''

اور پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''مگر یہ تو کہو گے کہ غیر ملکیوں کے اتنے مجمعے میں ایک بھی تو ایسا چہرہ نہ تھا جس میں اتنی سادگی، اتنا حسن اور اتنا بانکپن ہو۔'' محض اس کا دل رکھنے کو میں نے جواباً ہاں کہہ دیا۔

OOO

Marfat.com

۳

پھر تو میں اکثر وہاں جانے لگا۔ بوبی میرا دوست بنتا جا رہا تھا۔ جیسے ہی میں وہاں پہنچتا وہ انکل انکل کرتا لپک کر میرے اسکوٹر پر آن بیٹھتا اور میں ایک چکر اسے دلاتا، پھر وہ مجھے لے کر جہاں اسد اور صبا بیٹھے ہوتے، پہنچتا کبھی کبھی مجھے ان کے ساتھ پکچر بھی ضرور دیکھنا پڑتا کیوں کہ اسد کو پکچرز کا جنون تھا کبھی یوں بھی ہوتا کہ میں پہنچتا اور اسد نہ ہوتا صبا اور میں مچھلیوں کے حوض کے کنارے کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے، نزدیک ہی سرخ جیرئیم کا دائرہ سبز سبز پتوں میں جگمگا رہا ہوتا، نارنجی مچھلیاں پانی میں ڈبکیاں لگاتی رہتیں، دیوار پار کے مزار کا دھواں ہوا کے ساتھ ادھر آتا رہتا۔ صبا کڑھائی یا بنائی کرتی رہتی اور ہم کبھی ادب، کبھی اخلاقیات اور کبھی قانون کی بحثوں میں اُلجھتے رہتے، ایک دن میں نے اس سے کہا۔ ''آپ لکھتی کیوں نہیں ہیں؟'' اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا اور کہا، ''آپ کیوں نہیں لکھتے؟''

اس لیے کہ مجھ میں لکھنے کی صلاحیت نہیں ہے اور آپ میں معلوم ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے ہمارے ہاں خدا کے فضل سے کئی لکھنے والے ہیں اور میں اس جراثیم کو فوراً پہچان لیتا ہوں۔''

''اچھا...'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''کیا آپ نے واقعی کبھی کچھ نہیں لکھا؟'' میں نے پوچھا۔

''یوں ہی... کبھی پریشانی میں کوئی خیالات آئے تو دل ہلکا کرنے کے لیے کاغذ

Marfat.com

پر گھسیٹ دیے یا کبھی کوئی خیال دل کو نیا سا لگا تو... مگر کبھی کوئی مربوط چیز نہیں لکھی۔'' اس نے کہا۔

''آپ کوشش تو کیجیے۔ بلکہ آپ یوں کیجیے کہ دوسری زبانوں کی چند اچھی چیزوں کے ترجمے کیجیے اس سے آپ میں طبع زاد چیزیں لکھنے کا شوق پیدا ہوگا اور قلم سے خود بخود مربوط چیز نکلے گی۔''

''آپ کو یہ خیال کیوں آیا کہ میں کچھ لکھ سکتی ہوں'' اس نے کہا۔

''اس لیے... کہ آپ جیسے حساس آدمی کے لیے اپنے جذبات کے اظہار کا کوئی وسیلہ ضرور ہونا چاہیے... آپ کو لکھنا ہی چاہیے ورنہ آپ کے حق میں اچھا نہیں ہوگا...'' میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہوں۔'' وہ ہنس پڑی۔

مگر اس نے میری نصیحت پر عمل کیا۔ اب کبھی کبھی وہ اپنے ترجمے مجھے بھی دکھا دیتی لیکن طبع زاد چیز دیکھنے کی فرمائش پر ''ابھی نہیں'' کہہ کر ٹال دیتی جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ وہ کچھ لکھ ضرور رہی ہے۔ چمنستان ہوٹل سے واپسی پر اکثر دل مجھ سے یوں کہا کرتا۔ کیا تم نوٹ نہیں کرتے کہ تمھارے ساتھ وہ دُنیا جہان کی باتوں میں کس طرح کھو جاتی ہے۔ مگر اسد کے آتے ہی وہ زیادہ بردبار، کم گو اور عمر رسیدہ نظر آتی ہے جس کا زیادہ وقت بوبی اور اُس کے نوکر کو ہدایات دینے میں گزرتا ہے۔''

''تو کیا؟'' ایسی خرافات پر میں دل کے ساتھ ہمیشہ سختی سے پیش آتا اصل میں دل جیسی چیزوں کو اپنے بارے میں یہ خوش فہمیاں ہوا ہی کرتی ہیں کہ لوگ جتنی لفٹ ہمیں دیتے ہیں دُوسروں کو نہیں دیتے...

دیکھتے دیکھتے وقت گزر جاتا ہے۔ تین مہینے میری اور چمنستان ہوٹل کے باسیوں کی ملاقات کو ہو چکے تھے۔ میں ان لوگوں میں خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ ایک طرح سے وہ دونوں مجھ سے بے تکلف تھے مگر الگ الگ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ہم تینوں آپس میں بے تکلف تھے... میں اب پوری طرح سمجھ گیا تھا کہ صبا نے مفرور قیدی کی بات اسد سے کیوں چھپائی تھی۔ اس کا یہ کہنا ٹھیک تھا کہ وہ یہ بات نہیں سمجھ پاتے۔ بعض لوگوں کا ذہن کسی اور ہی سانچے کا بنا ہوتا ہے اور کچھ ایسا کڈھب کہ سیدھی بات انھیں ٹیڑھی اور ٹیڑھی

Marfat.com

بات سیدھی نظر آتی ہے یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر آپ سے کہیں کہ خدا ہے تو کہیں گے کہ کیوں ہے اور اگر آپ کہیں کہ نہیں ہے تو بگڑیں گے کہ کیوں نہیں ہے، اس حلقے میں دو آدمی میری سمجھ سے بالاتر تھے۔ ایک روبینہ اور دوسرا اسد۔ روبینہ کبھی مجھ سے ایک دم بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی پھر ایک دم یوں کھنچتی جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہو۔ کبھی وہ بار بار مجھے اپنے گھر آنے کو کہتی اور کبھی اسد اور صبا کے ہاں مل جاتی تو ساری نشست کے دوران ایک بات بھی مجھ سے نہ کرتی۔ اس کے موڈ کے مد و جزر پر نہ میں نے کبھی بطورِ خاص غور کیا اور نہ اہمیت دی۔ اس کے اور سہیلہ کے ساتھ میرا سلوک شروع سے ایک سا رہا، شریفانہ اور سرد۔ کبھی اسد اور صبا ان کے گھر جا رہے ہوتے اور مجھ پر زور دیتے تو میں بھی چلا جاتا، جب کبھی کوئی پارٹی ہوتی اور مجھے بلایا جاتا تو میں چلا جاتا۔ بعض دفعہ معذرت بھی کر دیتا۔ دو ایک دعوتیں کھانے کے بعد میں نے اسد اور صبا کے ساتھ انھیں ''چائنیز'' میں بھی مدعو کیا مگر اس سے زیادہ نہ میں کچھ سوچتا تھا نہ ضرورت تھی... پھر ایک دن صبا نے تنہائی میں خاص طور سے روبینہ کا ذکر نکالا۔

''روبینہ کیسی لڑکی ہے؟'' بغیر کسی تمہید کے اس نے پوچھا۔

''اگر میں اس سلسلے میں اپنی رائے محفوظ رکھنا چاہوں۔'' میں نے کہا۔

''اس کی اجازت ہی نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تو سنیے... روبینہ کو دیکھ کر مجھے ان غیر ملکی گڑیوں کا خیال آتا ہے جو لوگوں کے ڈرائنگ روم میں سجی ہوتی ہیں۔ نک سک سے دُرست، بنی سنوری، مگر ان کا کوئی مصرف میری سمجھ میں نہیں آتا، اگر گھر کے بچوں کو ان سے کھیلنے کی ہی اجازت ہوتی تو...''

''مذاق نہیں، سنجیدگی سے بتایئے۔'' وہ بات کاٹ کر بولی۔

''سنجیدگی سے ہی بتا رہا ہوں'' میں نے کہا۔

''اور سہیلہ؟'' وہ بولی۔

''سہیلہ بے چاری گھر کی بنی ہوئی وہ گڑیا ہے جس کا منہ چپٹا ہوتا ہے، ناک تکونی، آنکھیں ڈراؤنی اور جسم بیڈول اور اس کو جتنا سجاؤ بناؤ اتنی ہی بھدی نظر آتی ہے۔''

''اُونھ ہوں...'' وہ ہنس پڑی۔ بھئی شکل و صورت کو چھوڑ کر بتایئے کہ ان لڑکیوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟''

''الٹرا ماڈرن ہیں۔'' میں نے کہا۔

Marfat.com

''تھوڑی سی ماڈرن تو ضرور ہیں مگر لڑکیاں بُری نہیں ہیں، شادی کے بعد اور سُدھر جائیں گی۔''

''ہوں۔'' میں جھک کر گھاس کا تنکا توڑنے لگا۔

''میں سوچ رہی تھی۔'' وہ خاص بڑی بوڑھیوں کے انداز میں بولی، جنھیں سوائے جوان لڑکیوں کی شادی کے کوئی اور موضوع ہی نہیں سوجھتا ''کہ کہیں جلدی سے روبینہ کی شادی ہو جاتی تو اچھا تھا۔''

''پہلی شرط کی کیا کوئی خاص ضرورت ہے؟'' میں نے مذاقاً کہا۔ میرا مطلب لفظ ''جلدی'' سے تھا۔

''جی ہاں...'' وہ بدستور سنجیدہ تھی۔ ''آپ کو معلوم نہیں نزدیکی ریاست کے نوابوں کے خاندان کے ایک صاحب زادے اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔''

''وہ صاحب زادے جن کے لیے سنا ہے کہ پتلون کی دونوں جیبوں میں بوتلیں رکھتے ہیں اور کار چلا رہے ہوں یا پیدل چل رہے ہوں، چسکیاں چلتی رہتی ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں وہی... اور اس کی عمر آپ کو معلوم ہے مشکل سے اٹھارہ انیس سال ہے۔''

''شکل سے بھی کم عمر نظر آتا ہے مگر لڑکا پلا ہوا ہے... روبینہ کے لیے برا نہیں، روز ایک سے ایک نئی اور جہازی کار میں گھومتا ہے۔''

صبا نے پلکیں اُٹھا کر دیر تک مجھے دیکھا۔ جب وہ کسی بات پر خفا ہوتی تو یوں دیکھتی۔ مجھے اس کی یہ ادا پسند تھی اس لیے جان بوجھ کر بھی اسے خفا کیا کرتا۔

''آپ کو معلوم ہے یہ کس قسم کے لوگ ہیں؟'' وہ ذرا تیزی سے بولی۔

''دونوں کا ایک ہی ڈیزائن نظر آتا ہے۔'' میں نے کہا، ''ممکن ہے رنگ الگ الگ ہوں۔''

وہ تھوڑی سی خفا ہوئی پھر مجھے مسکراتے دیکھ کر خود بھی مسکرا دی۔

''یہ وہ لوگ ہیں...'' اس نے زور دے کر کہا، ''جن کے کوئی مورلز نہیں ہیں... یہ شادیاں کرتے ہیں اور اپنی بیویوں کو ان محلوں میں بند کر دیتے ہیں جن کی دیواریں سو سو فٹ اُونچی ہوتی ہیں، جن کے دروازوں پر پہرہ ہوتا ہے اور جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا

Marfat.com

اور خود گلچھرے اڑاتے ہیں۔'' مارے جوش کے اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور چہرہ سرخ ہوگیا۔

''یہ آپ مجھے بتانے کے بجائے روبینہ کو بتائیے'' میں نے دھیمے لہجے میں نیک صلاح دی۔ وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ پھر بولی، ''روبینہ بے حد بیوقوف ہے۔ اگر کوئی اوندھی بات اس کے دماغ میں آگئی تو پھر وہ کچھ نہیں سوچے گی اور کر ڈالے گی، میں سوچ رہی تھی کہ اس سے پہلے کہ وہ اس لڑکے کے پھندے میں پھنس جائے اس کی شادی کسی اچھی جگہ ہوجاتی...''

''اشتہار دلوا دیجیے...اوپر لکھ دیجیے ''ارجنٹ۔''

اُس نے مجھے گھور کر دیکھا اور شاید وہ سمجھ گئی کہ جو اشارہ وہ مجھے دے رہی ہے میں اسے سمجھ لینے کو قطعی تیار نہیں ہوں۔ ہار کر وہ آہستہ سے بولی، ''روبینہ بیوقوف ضرور ہے مگر... بری نہیں ہے...''

میں منھ اُٹھا کر آسمان پر اُڑنے والی چیلوں کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی ہوں... اس کے بعد صبا نے پھر کبھی میرے سامنے روبینہ کی تعریف میں قصیدے نہیں پڑھے مگر یہ ذکر ضرور افسوس سے کرتی رہی کہ روبینہ جب بھی ملتی ہے، اس لڑکے کا ذِکر کرتی ہے اور میرا خیال ہے وہ اس سے خاصی متاثر ہو رہی ہے، اسد کے سامنے بھی اس نے دو ایک مرتبہ یہ بات کہی مگر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا... پھر ایک دن روبینہ نے کوئی قیمتی تحفہ صبا کو دکھایا جو اس لڑکے نے دیا تھا، یہ دیکھ کر صبا بے حد پریشان ہوئی۔ اس دن میری موجودگی میں اس نے اسد سے کہا، ''تم چچا احمد سے صاف صاف کہہ دو کہ روبینہ کو اس لڑکے سے ملنے کی ہرگز اجازت نہ دیں...'' میری امید کے خلاف اسد اس بات پر فوراً آمادہ ہوگئے اور انھوں نے صبا کی اس بات سے اتفاق کیا کہ روبینہ کو اس لڑکے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ مگر اس سلسلے میں میں نے اپنی خدمات پیش نہ کیں۔ میں بھلا کسی کو کسی سے ملنے کے لیے روکنے والا کون...

OOO

Marfat.com

۴

ایک دن ہم چار یار مل کر ولی تنگی ڈیم دیکھنے گئے جو فوج کے ہاتھوں زیرِ تعمیر تھا۔ کوئٹہ ڈویژن کی پانی کی قلت کو دور کرنے کے لیے یہ اسکیم بہت پرانی تھی مگر اب تک ناقابلِ عمل سمجھی جاتی تھی۔ اب فوجی جوانوں کی ہمت کے سہارے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا۔ ریتیلے پہاڑ کاٹ کر بمشکل تمام ایک قابلِ عبور راستہ بنالیا تھا جو اسی بند تک جاتا تھا، اڑک کے ریسٹ ہاؤس میں ہم نے اپنے اسکوٹر چھوڑے اور اپنے فوجی دوست کے ٹرک میں بیٹھ گئے۔ اس چار میل میں آدمی چار ہزار فٹ بلندی پر جاتا تھا اور اس قدر عمودی چڑھائیاں تھیں کہ چڑھتے ہوئے اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ جاتا تھا۔ کئی مرتبہ وہ بھاری بھر کم ڈوج کسی چڑھائی پر چڑھتے ہوئے جواب دے دیتی تھی اور واپس لوٹنے لگتی تھی اور اس وقت اس فوجی افسر کو چھوڑ کر جو روز ہی وہاں جاتا تھا، ہم سب کا رنگ اُڑ جاتا تھا۔ کوئی ڈرائیور کو رائے دیتا کہ ہر چڑھائی کے شروع میں ہی گاڑی فرسٹ گیئر میں ڈال لے، دوسرا ٹوکتا کہ وہ قطعی بات نہ کرے اور پورا دھیان گاڑی کی طرف رکھے، وہ ہمارے خوف پر فراخ دلی سے مسکراتا مگر اس وقت جان کے آگے ہمیں یہ قطعی پروا نہیں تھی کہ وہ ہمیں کتنا ڈرپوک اور حقیر سمجھ رہا ہے، اس سارے راستے وہ خاک جو سیروں کے حساب سے اُڑ رہی تھی، حلق کے راستے پھیپھڑوں پر منجمد ہوتی جا رہی تھی، ہم سب بھوت بن گئے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس رہے تھے، مگر صرف اس وقت جب راستہ ذرا بہتر ہوتا تھا، اس ریت سے کپڑے، بال اور پلکیں تک سفید ہو گئی تھیں، خدا خدا کر کے ایک آخری چڑھائی جو کسی طرح پل صراط سے کم نہ تھی، پار کر کے ہم اس پانی تک

Marfat.com

پہنچے جس پر بند تعمیر کیا جا رہا تھا۔ پانی ہلکے ہلکے شر شر کرتا ہوا گول پتھروں پر بہ رہا تھا، اوپر بند تک جانے کے لیے پانی میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ ہم نے بسم اللہ کر کے اپنے جوتے پانی میں ڈال دیے اور اُبھرے ہوئے پتھروں پر پاؤں رکھنے کی کوشش میں گرتے سنبھلتے پانی میں سے گزرنے لگے، ابھی کچھ دُور ہی گئے ہوں گے کہ بند پر بیٹھے ہوئے فوجیوں نے بے تابی سے واپس جانے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی بھڑام کی رُوح فرسا آواز سنائی دی، ہمارے کیپٹن دوست نے بتایا کہ بارود سے پتھر اڑائے جا رہے ہیں اور ہم لوگ اُلٹے پاؤں پھرے، ہمارے سر پر پتھر ہوا میں اُڑ رہے تھے اور ہم سب کے واپس بھاگنے کا سماں کچھ ایسا تھا جیسے ہم لڑائی میں مراجعت کر رہے ہوں، ایک بڑے سے پہاڑ کے آگے نکلے ہوئے چھجے کے نیچے بہت سے ملٹری ٹرک اور جیپیں کھڑی تھیں، ہم نے وہاں پہنچ کر دم لیا اور ایک ٹرک میں چڑھ کر بیٹھ گئے، اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم میدانِ جنگ میں خندقوں میں چھپے دشمن کی گھات میں بیٹھے ہوں۔ جب آل کلیئر ہو گیا تو ہم اپنی جائے پناہ سے نکلے اور دوبارہ پانی میں سے گزرتے ہوئے اس عمودی چڑھائی پر چڑھنے لگے، جو ہمیں بند کر کے اُوپر پہنچاتی تھی... وہاں ڈرلنگ ہو رہی تھی اور مارے شور کے کان پھٹے جاتے تھے، ہمارے چاروں طرف ریت تھی، اور خاکی وردیاں تھیں، کام کی اُمنگ اور لگن تھی، یہ بند ایک طرح سے فوجی انجینئروں کے لیے چیلنج تھا جس پر انھوں نے لبیک کہا تھا اور ہر طرح کی دشواریوں کے باوجود کم سے کم وقت میں اسے پورا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ انسانی ہاتھوں اور ان سے چلنے والی مشینوں نے ایک سو فٹ سے بھی زیادہ مٹی ڈھیر کر دی تھی اور اب بھی ایک بُل ڈوزر پہاڑ کی چڑھائی سے مٹی ڈھو ڈھو کر بند پر پھیلا رہا تھا۔ اس بُل ڈوزر کے چلنے کے لیے اتنی ہی جگہ تھی جتنی اس کے دو پہیوں کا آپس کا فاصلہ اور ڈرائیور نہایت چابک دستی سے اسے سیدھا اور اُلٹا بھی چلا رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ اپنے کام میں کتنے چاق چوبند اور نڈر ہیں جو اتنی بے باکی سے یہ خطرناک کام انجام دے رہے ہیں۔ اگر انچ بھر چوک جائیں تو گزوں نیچے جا پڑیں۔ اس وقت مجھے ہی کیا شاید سب کو اپنی کم ہمتی پر شرم آ رہی تھی۔ ہم راہ کی دشوار گزاریوں سے ہی گھبرا گئے تھے جب کہ ان میں سے اکثر بلاناغہ اسی رستے سے یہاں آتے تھے اور باقی یہیں خیمے لگا کر رات کو سوتے تھے اور آٹھ ہزار فٹ کی بلندی کی تیز یخ ہوا اور ٹھنڈ کو برداشت کرتے

Marfat.com

تھے۔ ہمیں واپس جانا نسبتاً آسان نظر آنے لگا۔ وہاں ریت کے اس اُونچے پلیٹ فارم پر ایک پرانی سی میز اور دو ایک کرسیاں پڑی تھیں۔ ہم باری باری تھوڑی دیر ان پر بیٹھے اور پھر شام ہوتی دیکھ کر فوجی افسروں اور سپاہیوں کو ان کی کارکردگی کی داد دیتے ہوئے واپس لوٹے۔ واقعی ہم ان کے کام سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس دفعہ ہم نے اپنے ڈرائیور کو بھی ہدایات نہ دیں اور اس پر بھروسا کر کے ٹرک میں بیٹھ گئے... واپسی میں اتنی ہی دھول ہمارے کپڑوں اور جسم پر جم گئی۔ اب ہم نے کپڑے جھاڑنے اور رومال سے منہ ہاتھ پونچھنے کا شغل ترک کردیا اور اس دھول کو اس سیر کا ضروری جزو سمجھ کر قبول کرلیا۔ اس مرتبہ ہم نے دل ہی دل میں اس فوجی دوست کو گالیاں نہیں دیں جو ہمیں یہاں لایا تھا بلکہ اس خیال سے خوش ہوتے رہے کہ ہم نے ایک ایسا انسانی کارنامہ دیکھا جو واقعی قابلِ دید تھا۔ اس وقت ہمارے اوپر جتنی ریت سوار تھی، ہمارے دل اتنے ہی ہلکے تھے۔

واپسی پر ہم سیدھے ریسٹ ہاؤس پہنچے تاکہ وہاں کسی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھ کر چائے پییں اور تازہ دم ہوں۔ ریسٹ ہاؤس کے گیٹ سے ذرا ہٹ کر سیب کے باغوں کے نزدیک فیروزی رنگ کی فوکس ویگن کھڑی تھی، میں نے نمبر دیکھا، وہ اسد کی تھی، اس وقت یکایک میرا خیال اپنے حلیے کی طرف گیا۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اسد اور صبا مجھے اس حالت میں دیکھیں، میں ذرا اپنے دوستوں کی آڑ میں ہو گیا تاکہ اس طرح جھٹ سے اندر داخل ہو جاؤں اور اپنا حلیہ دُرست کرلوں تو اسد اور صبا سے ملوں۔ اسی وقت میری نظر باغ کی طرف گئی جہاں وہ دونوں ٹہل رہے تھے، ان کی پیٹھ ہماری طرف تھی اور وہ درختوں میں گھرے ہوئے تھے، میرے دوستوں کے شور و شغب پر مڑ کر شاید اسد نے پیچھے دیکھا۔ معلوم نہیں اُنھوں نے مجھے دیکھا نہیں یا پہچانا نہیں مگر فوراً ہی منہ دُوسری طرف پھیر لیا اور اتنی نظروں سے بچنے کے لیے وہ دونوں راستہ کاٹ کر درختوں کے بیچ میں سے کہیں نکل گئے، میں اندر چلا گیا مگر جب حلیہ دُرست کر کے نکلا تو ان کی کار جا چکی تھی۔

اس سیر و تفریح میں میں اتنا تھک گیا تھا کہ گھر پہنچ کر نہانے اور کھانا کھانے کے فوراً بعد سو گیا اور دن چڑھے اُٹھا۔ اس دن اتوار تھا، میں اسد اور صبا سے ملنے چلا آیا۔ دروازے پر بچے، غیر ملکی مرد اور عورتیں بھیڑ لگائے آنے والی ایک برات کو اچنبھے سے دیکھ

Marfat.com

رہے تھے۔ غیر ملکی عورتوں کو تصویریں لیتے دیکھ کر برات وہاں ٹھہر گئی تھی اور وہ لپک جھپک پھولوں سے لدی پھندی کار، اس میں سے جھانکتے ہوئے لوگوں کے سر اور آگے بینڈ کے ساتھ ناچنے والی لڑکیوں کی تصویریں لے رہے تھے، پھر انھیں میں سے کسی کی درخواست پر دولھا کو باہر نکالا گیا، کمر تک پھیلے ہوئے سہرے کو سنبھالتا وہ سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ پھر چہرے پر سہرا ڈال کر اور کبھی سہرا اُتار کر کئی ایک تصویریں لی گئیں اور سب کی تسلی ہو جانے کے بعد برات پھر کاروں پر لد کر منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوگئی، اسی ریلے میں بوبی بھی کھڑا تھا، مجھے دیکھ کر لپکا ہوا آیا اور اسکوٹر پر بیٹھ گیا، ایک چکر لگا کر میں نے اسے اتارا اور چاروں طرف دیکھا۔ لان میں بہت سے لوگ اِدھر اُدھر بیٹھے تھے مگر اسد اور صبا نہیں تھے، بوبی نے بتایا کہ اوپر ہیں، میں اُوپر چلا گیا۔

صبا ڈرائنگ روم میں بیٹھی خلیل جبران کی نظم ''وژن'' کا ترجمہ کرنے میں مصروف تھی اور اسد کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ میں علیک سلیک کر کے صبا کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور پڑھنے لگا۔ ''ایک شفاف چشمے کے کنارے، ایک کھیت کے بیچوں بیچ میں نے ایک پنجرہ دیکھا جسے کسی کاری گر ہاتھوں نے بنایا تھا۔ اس کے ایک کونے میں ایک چڑیا مری ہوئی پڑی تھی اور دُوسرے کونے میں دو کٹوریاں... ایک دانے سے خالی تھی، دُوسری پانی سے۔ میں عقیدت سے کھڑا رہا جیسے وہ بے جان چڑیا اور چشمے کی گنگناہٹ بے حد مقدس اور قابلِ احترام چیزیں ہوں، ایسی چیزیں جو دل و دماغ کو ٹٹولنے اور غور وفکر کرنے پر اکسائیں۔

یوں اس منظر اور اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ بے چاری چڑیا ایک چشمے کے کنارے پیاس سے اور ایک لدے ہوئے کھیت میں بھوک سے مر گئی تھی۔ زندگی کے گہوارے میں جیسے کوئی امیر آدمی اپنی مقفل تجوری میں بند سونے کے سکوں کے درمیان بھوک سے مر رہا ہو۔

میری آنکھوں کے سامنے وہ پنجرہ دفعتاً ایک انسانی ڈھانچا بن گیا، اور مری ہوئی چڑیا آدمی کا دل جس میں کسی دُکھیاری عورت کے لبوں ایسے زخم سے خون رس رہا تھا۔ اس زخم سے ایک آواز بلند ہوئی، میں انسانی دل ہوں... وجود کا قیدی اور دنیاوی قانون کا مارا۔ خدا کی تخلیق کردہ حسن کی کھیتی کے درمیان، زندگی کے چشمے کے کنارے میں

Marfat.com

انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے پنجرے میں مقید ہوں۔"

"کیسا ہے؟" صبا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"اچھا ہے۔" میں نے کہا۔

"لوگ خلیل جبران اور ٹیگور کے طرزِ تحریر کے متعلق کچھ بھی کہیں، مجھے یہ دونوں پسند ہیں۔" اس نے کہا اور قلم رکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

حسن کی کھیتی اور زندگی کے چشمے نے یکایک میرا ذہن اڑک کے چشموں اور سیب کے باغوں کی طرف منتقل کر دیا اور میں نے کہا "کل آپ لوگوں نے اڑک میں خوب سیر کی؟"

"جی؟" اس نے آنکھیں اُٹھا کر حیرانی سے مجھے دیکھا۔

"کل ہم ولی تنگی بند دیکھ کر لوٹے تو آپ کی کار ریسٹ ہاؤس کے نزدیک کھڑی تھی۔ میں آپ سے ملنے آ ہی رہا تھا مگر آپ لوگ واپس چلے آئے۔"

"کل..." وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کل تو ہم کہیں بھی نہیں گئے کسی اور کی کار ہوگی..."

مجھے اس کے بھول پن پر ہنسی آئی۔ گویا میں ان کی کار اور اس کا نمبر تک نہیں پہچانتا، میں دوسرے صوفے میں بیٹھ گیا اور غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کل شام تو میں بوبی کے ساتھ "لوڈو" کھیلتی رہی۔ اسد اپنے کام سے باہر گئے ہوئے تھے..."

سچ اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا اور اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانک کر نیچے دیکھا اور بولی، "اسد آتے ہی ہوں گے، بلکہ اب تک تو انھیں آ جانا چاہیے تھا ساڑھے دس بجے کا کہہ کر گئے تھے..." میرا ذہن بھٹک رہا تھا... صبا میز پر سے اپنا پرچہ اور کتاب اُٹھا لائی اور مجھے خلیل جبران کی نظم کا انگریزی اور اپنا کیا ہوا اُردو ترجمہ اور اس میں پیش آنے والی مشکلات سناتی رہی مگر میں نے کچھ بھی نہیں سنا۔ میں سوچ رہا تھا کل شام اسد کے ساتھ سیب کے باغ میں وہ کون لڑکی تھی؟ اسد کی کار میں نے دیکھی تھی۔ اس نے پلٹ کر خود ہمیں دیکھا تھا اور وہ دونوں درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے تھے۔ کیا یہ بات میں صبا کو بتا دوں۔ مگر اس سے کیا کہوں۔ کس طرح

Marfat.com

شروع کروں۔ اسے جو رنج ہوگا کیا میں اسے برداشت کرسکوں گا اور کیا اسد کے خلاف میری اس بات کو وہ صحیح مان لے گی۔ کہیں اسے میری نیت پر تو شبہ نہیں ہوگا۔ پھر اگر اسد کے سامنے اس نے پوچھا تو کیا میں یہ سب دُہرا سکوں گا، نہیں مجھے صبا سے کچھ نہیں کہنا چاہیے... مجھے یہ بات اسے ضرور بتا دینی چاہیے۔ نہیں... نہیں... تمھیں کیا... میاں بیوی کے معاملات میں دخل دینے والے تم کون، مجھ میں اور میرے دل میں حسب معمول یہ لڑائی جاری تھی کہ صبا کی شیریں آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''عامر، آپ خواب کی تعبیروں کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔''

''جی ہاں، کیوں نہیں...'' میں نے مذاقاً کہا۔ دفعتاً میرا موڈ شگفتہ ہو گیا تھا۔ آپ اپنے کسی خواب کی تعبیر پوچھنا چاہتی ہیں؟''

''کل رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا...'' وہ کچھ خواب آلود لہجے میں بولی، ''میں نے دیکھا کہ ایک اندھیرے راستے پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر میں دیے رکھتی چلی جا رہی ہوں۔ مگر جوں ہی ایک دیا جلا کر آگے قدم بڑھاتی ہوں وہ دیا بجھ جاتا ہے۔ جب سارے دیے رکھ کر میں نے پیچھے دیکھا تو وہ راہ جوں کی توں تاریک تھی اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔'' اس کی آنکھیں یوں کھوئی کھوئی تھیں جیسے اس وقت بھی وہ یہ خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں خوابوں پر یقین نہیں رکھتا لیکن نہ معلوم کیوں اس وقت میرا دل بوجھل ہو گیا... میں نے صرف اس کو خوش کرنے کی خاطر کہا۔ معلوم ہوتا ہے رات کو آپ خلیل جبران کو پڑھتی رہی ہیں اور یہ اس ''وژن'' کا اثر ہے اور اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ...''

اس سے پہلے کہ میں کوئی خوش گوار سی تعبیر گھڑ کر سناؤں اسد آگئے اور میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔

''ہیلو، کب آئے؟'' اسد نے کہا۔

میں نے کھڑے ہو کر ہاتھ بڑھایا جسے انھوں نے نظرانداز کر دیا۔

''تھوڑی دیر ہوئی...'' میں نے جواب دیا اور غور کیا کہ آج اسد کی نظریں بدلی ہوئی ہیں۔

''اچھا ہوا میں آگیا... ورنہ تمھیں اور انتظار کرنا پڑتا۔''

ان کے لہجے میں کاٹ سی تھی۔ اس سے پہلے کبھی انھوں نے مجھ سے یوں بات

Marfat.com

نہ کی تھی۔ شروع سے ہی شمسہ باجی کے بھائی کی حیثیت سے مجھے کچھ زیادہ رعایت دی گئی تھیں۔ وقت بے وقت کھانے پر بٹھا لیا جاتا تھا۔ خود دو ایک دفعہ اسد مجھے صبا کے پاس چھوڑ کر اپنے کسی کام سے چلے گئے تھے، اسی لیے جب بھی میں آتا اور اسد نہ ہوتے، صبا مجھے بیٹھنے کو کہتی اور میں بیٹھ جاتا۔ اس سے پہلے بھی ایسا ہوا کہ اسد آئے تو میں یہاں پہلے سے موجود تھا مگر آج لہجے کا انداز کچھ طنزیہ تھا اور بالکل اچانک... یہ مجھ پر شک کیا جارہا تھا یا ان کا اپنا مجرم ضمیر مجھ سے اس طرح مخاطب ہونے پر مجبور کر رہا تھا؟... میں جتنی دیر بیٹھا رہا، اسد کے رویے میں فرق محسوس کرتا رہا۔ وہ کئی کئی منٹ تک میری موجودگی کو قطعی نظر انداز کیے صبا سے اپنے محکمے کی اُول جلول باتیں کرتے رہتے، پھر میری طرف دیکھ کر یوں مخاطب ہوتے جیسے کسی بے حد بور مہمان سے کوئی انسان بڑی ہمت کے بعد محض اسے خوش کرنے کی خاطر ایک آدھ بات کرلے، بوبی آگیا تو وہ اسے گود میں بٹھا کر اس سے باتیں کرتے رہے پھر اچانک اُٹھ کر ریڈیو گرام لگا دیا اور اپنی اور بوبی کی پسند کے ریکارڈ بجاتے رہے، صوفے پر بیٹھ کر، آنکھیں بند کر کے پاؤں سے گانے کی دُھن پر تال دیتے ہوئے وہ خود کو گانے میں گم ہو جانے کا احساس دلا رہے تھے مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے پوری طرح نظر انداز کرنے کے لیے یہ ڈھونگ رچا رہے تھے، جلد ہی میں نے اجازت چاہی۔ ہمیشہ کی طرح انھوں نے ٹھہرنے پر اصرار نہیں کیا، نہ کھانے کے لیے کہا۔

''اچھا چلیے...'' انھوں نے گردن اُٹھا کر کہا اور پھر میری طرف یوں دیکھا جیسے ٹٹول رہے ہوں کہ میں صبا سے کوئی ایسی ویسی بات کہہ کر تو نہیں جارہا ہوں۔ مجھے دیکھنے کے بعد غیر شعوری طور پر ان کی نظریں صبا کے چہرے کا جائزہ لیتی رہیں جس سے صبا کچھ پریشان سی ہوگئی۔ میرے خدا حافظ کہنے پر بیٹھے بیٹھے دونوں نے خدا حافظ کہا اور میں نیچے چلا آیا۔ آج صرف بوبی مجھے نیچے چھوڑنے آیا۔ اسد کی نگاہیں گویا ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ چکی تھیں اور صبا کی نظروں میں حیرت تھی۔ شاید اس نے آج ہم دونوں کے تعلقات کے اچانک فرق کو محسوس کر لیا تھا اور سبب نہ جاننے کی وجہ سے ظاہر ہے وہ کچھ اور پریشان ہوگی۔

اس طرح وہ ملاقات جس کا آغاز اچانک ہوا تھا، یک لخت ختم ہوگئی، پھر کبھی اسد کا فون نہیں آیا اور میں بھی نہیں گیا۔ صبا نے بھی یاد نہیں کیا اور وہ کرتی بھی کیوں،

جب کہ وہ مجھے صرف اسد کی وساطت سے جانتی تھی۔ شمسہ باجی کے بتائے ہوئے پتے پر وہ پہلے روز آئی تھی مگر اب میرے اور اس کے درمیان اُس راز کا رشتہ باقی نہیں رہا تھا... کئی مرتبہ ایک دم دل مچل اُٹھتا کہ میں وہاں جاؤں مگر میں ٹال جاتا... مجھے معلوم تھا کہ جو بات اُس روز لہجے اور انداز سے بتائی گئی ہے، اب کے الفاظ میں ڈھال دی جائے گی، مگر اس دوری سے وہ پہلی کسک جو آئے دن کے آنے جانے سے دب گئی تھی، ایک دم ابھر آئی مجھے اس دوران میں کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ وہ اس حد تک میرے ہوش وحواس پر چھا چکی ہے۔ باوجود اس احتیاط کے جو اتنے عرصے میں نے روا رکھی، باوجود اپنے دل سے تمام معاملہ صاف کر لینے کے اور اچھی طرح یہ جانتے ہوئے کہ وہ کسی اور کی ہے اور میری نہیں ہوسکتی۔ میں اس کی محبت کے سامنے خود کو بے دست و پا محسوس کرنے لگا۔ اس جذبے کو قوی تر شاید اس خیال نے کیا کہ وہ مظلوم ہے، وہ ایسے شخص کے ساتھ باندھی گئی ہے جو ذہنی لحاظ سے اس سے کوسوں دُور ہے اور جسمانی طور پر اس سے وفادار نہیں ہے، اب اکثر مجھے یہ خیال آتا تھا کہ سیب کے باغ میں وہ کون لڑکی اسد کے ساتھ تھی، مجھے شبہ ہی نہ تھا کہ وہ صبا کے سوا اور کوئی ہوسکتی ہے اس لیے میں نے اسے غور سے نہیں دیکھا۔ اب یاد کرتا ہوں تو اس کا لباس بھی یاد نہیں آتا۔ ممکن ہے وہ ہوٹل میں ٹھہرنے والی کوئی ٹورسٹ عورت ہو، شاید درختوں کے اوٹ میں... اس کا لباس اچھی طرح نہ دیکھ سکا، مگر وہ عورت تھی اس کا مجھے یقین تھا اور ہے... اور اب میں یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ وہ کون تھی...؟ کاش اس وقت میں نے اپنے حُلیے کی پروا کیے بغیر اسے دیکھ لیا ہوتا اور اس وقت اسد کو وہ دھکا لگتا جو ساری زندگی اس کے دل پر داغ بن کر دہکتا...

مگر جو کچھ بھی ہوا وہ ہو چکا تھا۔ میں ان کی دُنیا سے خاموشی سے باہر نکل آیا تھا اور اب جب کہ مجھے یقین تھا کہ میں پہلی بیماری سے قطعی شفایاب ہوگیا ہوں، پہلی چندھیاہٹ کے بعد آنکھیں اصلی حالت پر لوٹ آئی ہیں، مجھے اُٹھتے بیٹھتے صبا کا دھیان رہنے لگا، وہ گرما گرم بحثیں جو بغیر سوچے سمجھے کی جاتی تھیں ان کا ایک ایک لفظ ذہن... دہرایا کرتا، کوئی ایک ادا، کبھی جوش میں ان بڑی بڑی آنکھوں کا چمک اُٹھنا یا کسی مذاق پر خوش دلی سے ہنس دینا مجھے گھنٹوں تصورات کی دُنیا میں گم رکھتے... اس وقت مجھے کہاں اندازہ تھا کہ یہ سب چیزیں یوں میرے ذہن پر نقش ہو رہی ہیں جیسے پتھر پر لکیر... یہ کیسی

Marfat.com

عجیب بات تھی، میں نے سنا تھا لوگ محبوب کے سامنے پتھر کے بت بن جاتے ہیں زبان ہی نہیں کھلتی، مگر یہاں اُلٹا معاملہ تھا، اس کے سامنے میں خوب چہکا کرتا تھا، دُنیا بھر کے مذاق اور زمین سے آسمان تک کی باتیں مگر اب جو وہ نظر سے اوجھل تھی تو میں پانی کی تہ میں ڈوب جانے والے پتھر کی طرح خاموش تھا۔ نہ کہیں آنے جانے کو دل چاہتا تھا نہ کسی سے ملنے کو، دوست احباب آتے تو طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے ٹال دیتا، جب کئی دن اسی طرح روتے بسورتے گزر گئے تو ایک دن میں نے پھر اپنے دل سے دو بدو بات کرنے کی ٹھانی۔ یوں روایتی عاشقوں کی طرح دُنیا سے کٹ کر کب تک گزارا ہوگا بھائی۔ اُٹھو، ہنسو کھیلو، تفریح کرو، سُنا ہے شروع شروع کے یہ چرکے یوں ہی گہرے زخموں کی طرح نظر آتے ہیں مگر آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے اور دل کے احتجاج اور مردہ دلی کے باوجود میں نے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ چمنستان ہوٹل کا راستہ ہی جیسے میں بھول گیا تھا۔ شام کو شارع جناح پر نکل کر چہروں کو ٹٹولا کرتا... یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دُنیا بھر میں صرف ایک چہرہ ہی ایسا ہو جو مجھے متاثر کر سکے، ضرور اور بھی چہرے ہوں گے جن میں اتنا ہی حسن، اتنی ہی معصومیت اور اتنا ہی بانکپن ہوگا۔ مگر مجھے اور کوئی چہرہ ایسا نظر نہ آیا اور جو آئے بھی ان میں ایک چیز کی واضح کمی تھی... وہ مجھے متاثر نہ کر سکے۔

پھر ایک دن ڈرگ اسٹور سے میں کوئی چیز خرید کر نکل رہا تھا تو اس کے عین سامنے وہی فیروزی فوکس ویگن کھڑی تھی۔ میں نے چاہا پہلو بچا کر نکل جاؤں مگر ایک شیریں آواز نے پاؤں پکڑ لیے... ''عامر! ارے آپ تو یہیں ہیں۔ میں سمجھی آپ کہیں اور چلے گئے۔'' میں نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا اور کہا، ''جی ہاں، میں یہیں ہوں۔''

کنکھیوں سے میں نے دیکھا، اسد کار میں نہیں تھا، شاید وہ پاس کی کسی دکان میں گیا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ واپس آکر وہ مجھے صبا سے باتیں کرتا ہوا دیکھے۔ وہ بغیر کسی شک و شبہے کے مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔

''آپ تو ہمارے ہاں عرصے سے آئے ہی نہیں، کیا خفا ہو گئے؟'' اس نے کہا۔ ''روبینہ بھی کئی مرتبہ آپ کو پوچھ چکی ہے۔''

''جی نہیں... میں تو نہیں، البتہ اسد صاحب کسی بات پر مجھ سے ناراض ہیں۔''

''اچھا!'' اس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

Marfat.com

"اب میں چلوں گا... خدا حافظ..." بڑی کوشش سے اپنے قدموں کو گھسیٹتا میں وہاں سے چلا آیا۔ بغیر کسی شعوری کوشش کے میرے منہ سے نکل گیا تھا کہ اسد مجھ سے خفا ہیں۔ شاید میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے وہاں نہ جانے کو صرف کاہلی سمجھے یا یہ کہ وہ میرے نزدیک اس حد تک غیر اہم ہے، اس لیے اَن جانے طور پر میں نے اپنی بے گناہی جتا دی تھی، اب وہ اسد سے ضرور پوچھے گی اور اسد جو کچھ بھی کہیں گے وہ اسے ٹھیک سمجھے گی، اگر اسد صبا سے کہہ دے کہ اسے میری نیت پر شک تھا تو... اور مجھے اس خیال سے خوشی ہوئی، کاش اسد اس سے یہی کہہ دے۔ کسی طرح اسے پتا تو چل جائے کہ میں، میرا دل اس کے پیچھے دیوانہ ہوا جارہا ہے، خواہ وہ اسد کی وساطت سے ہی کیوں نہ ہو، خواہ کتنے ہی غلط رنگ میں کیوں نہ ہو...

میرا دل کام سے اُچاٹ ہو گیا تھا، اس لیے میں نے اپنے اُستاد سے درخواست کی کہ مجھے چند روز کے لیے لاہور جانے دیں مگر اُنھوں نے اس بات کو قطعی ضروری نہیں سمجھا اور زور دیا کہ اس وقت جب کہ کام کچھ جم چلا ہے، میں ہرگز جانے کا ارادہ نہ کروں۔ ان کی بات کو نظر انداز کر کے چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیوں کہ اس صورت میں ابا بھی مجھے خوش آمدید نہیں کہتے۔ ناچار دل مار کر بیٹھ رہا، مگر بے دلی، مایوسی اور ڈپریشن کے اس عالم میں مجھے اچانک ابا کے انتقال کا تار ملا۔ ابا کئی سال سے دل کے مریض تھے۔ تین سال سے ان کا بلڈ پریشر اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی وقت بھی ختم ہو سکتے ہیں۔ چند مہینے تو ہم یہی سمجھے کہ کسی وقت بھی ہم ابا سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے مگر اپنی ہمت کے بل پر وہ اپنی زندگی کو آگے ہی آگے کھینچ رہے تھے اور وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ہم ان کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح چمٹے رہیں مجھے انھوں نے زبردستی یہاں بھیجا تھا۔ شمسہ باجی کو اپنی سیر و سیاحت جاری رکھنے پر زور دیا تھا۔ ایک ڈیڑھ سال گزر جانے پر خود ہماری اُمیدیں بندھ گئی تھیں۔ ڈاکٹروں کو دھوکا بھی تو ہوسکتا ہے مگر آج جب کہ میں یہاں تھا اور شمسہ باجی بغداد میں، وہ نہایت خاموشی سے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ میں نے شمسہ باجی کو تار دیا اور پہلی گاڑی سے چلنے کے لیے اسٹیشن آپہنچا...... ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس ہاتھ میں لیے پریشان اور دل گرفتہ پلیٹ فارم پر چلا جارہا تھا۔ جیسے ہی میں ریفریشمنٹ روم کے دروازے کے سامنے سے گزرا اور

Marfat.com

دروازہ کھلا ایک جوڑا ہاتھ میں ہاتھ دیے باہر نکلا۔ یہ اسد اور روبینہ تھے... پہلو بچا لینے کے بجائے میں نے کندھے چوڑے کر کے عین ان کے سامنے پہنچ کر سلام کیا۔ اس نے بادلِ نخواستہ ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ ملانے کے بعد میں نے روبینہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ''آپ اچھی تو رہیں، بہت دن بعد ملاقات ہوئی۔'' وہ کچھ سٹپٹائی پھر، ''جی ہاں، آپ آئے ہی نہیں'' کہہ کر کھسیانی سی ہنسی ہنس دی۔

''واپسی پر ضرور حاضر ہوں گا۔'' میں نے کہا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اسد نے پوچھا۔ میں نے بتایا۔

''والد کا انتقال ہو گیا...'' روبینہ اپنا قہقہہ لگانے ہی والی تھی کہ رک گئی۔

''بڑا افسوس ہے۔'' اس نے کہا۔ اسد نے بھی رسمی اظہارِ افسوس کیا چند لمحے ہم سب خاموش کھڑے رہے، پھر میں نے پوچھا۔ ''مسز اسد تو اچھی ہیں؟''

''ہاں... نہیں، ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی ہم... ہم گاڑیوں کا وقت پوچھنے آئے تھے، روبینہ اپنی خالہ کے پاس حیدر آباد جانا چاہتی ہیں۔'' اسد نے کہا۔

اس کے چہرے کی رنگت اور آواز کی لڑکھڑاہٹ اس کے جھوٹ کی چغلی کھا رہی تھی۔ گاڑیوں کا وقت پوچھنے وہ یہاں آئے تھے جب کہ بڑی آسانی سے فون پر پوچھ سکتے تھے۔ بک شیلف پر رکھا ہوا ٹائم ٹیبل دیکھ سکتے تھے، مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ہر اتوار کی طرح یہ سیر و تفریح کے بعد یہاں کچھ کھانے پینے آئے تھے۔ یہ سوچ کر کہ ''چائینز'' اور ''فرح'' میں بہت سے جاننے والے مل جاتے ہیں، یہاں کوئی نہیں ملے گا مگر میں اتفاق سے یہاں مل گیا، میں جو عرصے سے یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون لڑکی ہے، جو صبا کی زندگی تباہ کر رہی ہے، وہ روبینہ تھی، صبا کی دوست۔ جس کی فکر میں صبا گھلی جا رہی تھی کہ کہیں وہ آوارہ اور شرابی نواب زادہ اسے پھانس نہ لے۔ اسی وقت مجھے یقین ہو گیا کہ نواب زادے کی بات قطعی گھڑی ہوئی تھی، صبا کا ذہن دوسری طرف منتقل کرنے اور اپنی طرف شبہ نہ ہونے دینے کی مصلحت سے... میں نے فیصلہ کیا کہ میں ابھی جا کر صبا کو فون پر بتاتا ہوں کہ اس وقت اسٹیشن پر اسد اور روبینہ موجود ہیں اور یقیناً سیب کے باغ میں بھی وہ دونوں ہی تھے۔ چاہے مجھے اس کی کچھ ہی قیمت کیوں نہ دینی پڑے، میں نے گاڑی چلنے میں چند منٹ بتا کر ان سے معذرت چاہی۔ وہ تیز تیز قدم رکھتے باہر نکل گئے، تب میں

Marfat.com

سیدھا اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں گھس گیا۔ اس سے اجازت لے کر میں نے چمنستان ہوٹل فون کیا۔ اگر صبا خود نہ آئی تو میں اس کے لیے پیغام چھوڑنے کو بھی تیار تھا، میں نے اس کے الفاظ سوچ لیے تھے، میں کلرک سے کہوں گا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں لکھ لو اور اسی وقت بیگم اسد کو بھجوا دو، ''اسد اور روبینہ اس وقت یہاں اسٹیشن پر موجود ہیں...عامر...'' مگر جس وقت میں نے فون کیا چمنستان ہوٹل کا ٹیلی فون ڈیڈ تھا۔ کئی منٹ تک میں نے انتظار کیا کہ شاید کوئی معجزہ ہو۔ فون اسی وقت ٹھیک ہو جائے اور میں چلتے چلتے یہ کام کر جاؤں مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا بالآخر جب ٹرین کھسکنے لگی تو میں لپک کر اپنے کمپارٹمنٹ میں سوار ہوگیا۔

OOO

Marfat.com

۵

ابا کے چالیسویں کے بعد ایک دن میں نے غور کیا کہ اب امی اور ابا کے انتقال کے بعد میری سرپرست شمسہ باجی ہیں۔ شمسہ باجی سے خاصا چھوٹا ہونے کے باوجود میں بے تکلف تھا۔ اس کی وجہ کچھ ان کی طبیعت تھی جو ہر ایک سے جلد گھل مل جاتی تھی، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا اور کچھ میری فطرت تھی کہ میں عمر کے اختلاف، بزرگوں کی روایتی بزرگی اور حد سے زیادہ احترام کا قائل نہیں تھا۔ ابا کی جائیداد کی بانٹ کا انتظام نہایت آسانی اور خوبی سے ہو گیا تھا کیوں کہ شمسہ باجی اور میں دو ہی بہن بھائی تھے، پھر ایک دن جب ہم باہر بیٹھے اپنی اپنی سوچ میں گم تھے شاید میرا موڈ ٹھیک کرنے کو باجی نے کہا، ''عامی، اب کہ تم خوب مال دار ہو گئے ہو، میرا خیال ہے کہ تمھارے لیے ایک عدد لڑکی کی تلاش شروع کر دوں۔''

''اگر میں مال دار نہ ہوتا تو کیا آپ اپنے لیے بھابھی لانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتیں؟'' میں نے جرح کی۔

''بھئی پھر تمھاری پریکٹس چلنے کا انتظار کرنا پڑتا اور اب پریکٹس چلے یا نہ چلے کوئی فرق نہیں پڑتا...'' باجی نے کہا۔

''مگر باجی، پہلے غربت میں تو میں کسی بھی لڑکی کے ساتھ گزارا کر لیتا مگر اب ایسی ویسی لڑکی میری نظروں میں کہاں سمائے گی۔'' میں نے انھیں چھیڑا۔

''اُوں ہوں...'' باجی نے ترچھی نظر سے مجھے دیکھا، ''ایسے کہاں کے افلاطون ہو گئے اب تم۔''

Marfat.com

''افلاطون نہیں مگر آپ کے کہنے کے مطابق قارون تو ہو گیا نا۔''

وہ ہنس پڑیں۔ بولیں، ''عامی، جب کوئی اچھی لڑکی دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں یہ عامی کی دُلہن ہو تو کیسی رہے۔''

''میں بھی یہی سوچتا ہوں، مگر اکثر پتا چلتا ہے کہ اس پر مجھ سے پہلے ہی کوئی صاحب ہاتھ صاف کر چکے۔''

''ہاں، اکثر اچھی لڑکیوں کی شادی جلد ہو جاتی ہے اس لیے سوچ رہی ہوں کہ اب کے ہونہار لڑکیوں کی جو کھیپ اُبھرے گی اس میں کہیں تمھیں کھپا دوں گی، ایسا نہ ہو کہ بعد میں لڑکیاں بوڑھے کھوسٹ سے شادی کرنے سے انکار کر دیں۔''

''باجی!'' میں نے سنجیدگی سے کہا، ''اب تک صرف ایک لڑکی مجھے ایسی ملی ہے جس سے میں شادی کرتا مگر اس کی شادی ہو چکی ہے، بتایئے اب کیا کروں۔''

''تم (OEDIPUS COMPLEX) کے شکار معلوم ہوتے ہو، تم ہمیشہ بڑی عمر اور شادی شدہ لڑکیوں کی طرف کھنچتے ہو۔ اصل میں جن بچوں کی ماؤں کا انتقال ان کے بچپن میں ہو جاتا ہے وہ اس...''

''باجی!'' میں نے بات کاٹی، ''آپ نے لفظ ہمیشہ بالکل غلط استعمال کیا ہے۔ میں نے آج تک کسی عورت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ رہی بڑی عمر تو وہ لڑکی شادی شدہ ضرور ہے مگر مجھ سے کم عمر ہے۔''

''کیا تم اسے چاہتے ہو؟''

''ہاں۔'' میں نے پہلی دفعہ خود کے سامنے بھی بلاچوں و چرا اس ننگی حقیقت کو تسلیم کیا، ''اور مشکل یہ ہے کہ وہ خوش نہیں ہے، وہ ایسی جگہ پھنس گئی ہے جہاں وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتی اور... اس کا شوہر دوسری لڑکیوں کے ساتھ پھرتا ہے۔''

''اچھا!'' باجی بولیں، ''تمھیں اس سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے دکھڑے تمھارے آگے روتی ہو گی اور تم سمجھتے ہو گے کہ دُنیا میں ایک تم ہی اس کے رازدار غم گسار اور جانے کیا کیا ہو...'' گو باجی کے لہجے میں تمسخر نہیں تھا، سنجیدگی تھی مگر مجھے بہت برا لگا۔ اسے بچانے کے لیے میں زور سے چلایا، ''وہ کسی کے آگے دکھڑے رونے والی لڑکیوں میں سے نہیں ہے باجی، شاید وہ جانتی ہی نہیں کہ اس کا میاں کہاں کس کو لیے پھرتا ہے اور

Marfat.com

اگر جانتی ہے تو کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتی۔"
"بہرحال تم کیا کر سکتے ہو۔" باجی نے کہا۔
"میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے میاں سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لے۔ میں جانتا ہوں باجی وہ ہمارے خاندان میں آ کر بڑی خوش رہے گی۔ وہ خلوص و محبت اور یک جہتی چاہتی ہے اور وہاں صرف بناوٹ اور دھوکا ہے۔"
باجی منھ اور آنکھیں پھاڑے حیرت سے میری طرف دیکھتی رہیں۔ "تم میں یہ بات ہوئی ہے؟" پھر انھوں نے مجھ سے پوچھا۔
"نہیں... میں نے آج تک اس سے کچھ نہیں کہا، مگر اب یہاں سے جا کر ضرور کہوں گا..."
"پاگل ہوئے ہو..." باجی غصّے سے بولیں "اس نے تم سے کچھ نہیں کہا اور تم نے اس سے کچھ نہیں کہا پھر تمھیں کیا معلوم کہ وہ خوش نہیں ہے، چھوٹتے ہی تم اس سے کہو گے کہ تم اپنے میاں سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لو تو وہ تمھارے منھ پر تھپڑ لگائے گی...شریف گھرانوں میں طلاقیں نہیں ہوتیں۔"
"آج کل شریف گھرانوں میں بھی طلاقیں ہوتی ہیں اور اگر نہیں ہوتیں تو ہونی چاہییں...ساری عمر روتے گنوانے سے طلاق لے لینا بہتر ہے، میں (Customary Morality) کا قائل نہیں ہوں۔ جس چیز کا حق مذہب اور قانون دیتا ہے اسے حاصل نہ کرنا احمق پن ہے۔" میں جوش میں بولے چلا گیا۔
"مہربانی کر کے آپ ملاؤں کی طرح مذہب کو ایکسپلائٹ نہ کریں۔" باجی طنز سے بولیں...کیا کوئی گارنٹی ہے کہ وہ لڑکی تمھارے ساتھ خوش رہے گی، اگر تمھارے ساتھ خوش نہ رہے تو پھر طلاق لے لے اور پھر سے شادی کر لے۔ سوچو، اگر سارے گھرانوں میں یہی ہونے لگے تو ہماری سوسائٹی کا کیا حشر ہوگا۔ انھیں چیزوں کو روکنے کے لیے یہ رسم و رواج اپنی افادیت ختم ہونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ طلاق کی مشکل اس لیے کھڑی کی گئی تھی کہ بے زبان عورتوں کو آسانی سے طلاق نہ دی جا سکے، شریف گھرانوں میں طلاق نہ ہونے کا خیال مانع رہے مگر بے زبان عورتیں ہی اس رسم کا شکار ہوئیں اور اب بھی ہو رہی ہیں...مرد تو بغیر طلاق دیے بھی دوسری شادیاں کرتے رہے۔"

Marfat.com

''اب شادی کے نئے قانون بننے کے بعد نہیں کر سکیں گے کم از کم بیوی کی اجازت کے بغیر نہیں۔'' باجی نے کہا۔

''میں سرے سے (Customary Morality) کا قائل ہی نہیں ہوں۔'' میں نے کہا آج کل (Reflective Morality) کا زمانہ ہے۔''

''یہ کیا بلا ہے؟'' باجی نے پوچھا۔

اس میں کوئی اخلاقی برائی دراصل اخلاقی برائی ہوتی ہے۔ کسی بات کو محض اس لیے بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا کہ یہ کام سوسائٹی میں نہیں کیا جاتا۔ عقلی طور پر اخلاقیات کے قانون مرتب کرنے کا مطلب ہے کہ ایک کام محض رسم و رواج کی وجہ سے اچھا یا برا نہ سمجھا جائے بلکہ سودمند اخلاقی نظریوں پر قائم ہو۔'' میں نے بڑے بڑے الفاظ استعمال کر کے باجی پر رُعب ڈالنے کی کوشش کی۔

''بھئی پہلے یہ کام سودمند اخلاقی نظریے کے تحت ہی کیے جاتے ہیں اور بعد میں رسم و رواج بن جاتے ہیں... بہرحال میں تمھیں کبھی یہ رائے نہ دوں گی کہ تم ایک بنے بنائے گھر کو تباہ کرنے کی کوشش کرو۔ ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے، تم ان باتوں کو کیا سمجھتے ہو۔ کل کو تمھاری شادی ہو جائے گی تو تمھیں کبھی اس لڑکی کا خیال بھی نہیں آئے گا۔''

میں نے باجی کی یہ باتیں غور سے سنیں اور دل سے پوچھا، ''کیا یہ بات ٹھیک ہے کہ کل کو میری کہیں شادی ہو جائے تو میں اسے بھول جاؤں گا۔''

دل نے کہا، ''یہ تو صرف وقت ہی بتائے گا۔''

باجی نے موضوع کو گرما گرم ہوتے دیکھ کر بات پلٹ دی، ''اچھا یہ تو بتاؤ، تم اسد اور صبا سے بھی ملے، وہ لوگ کیسے ہیں؟''

لمحہ بھر کو میں چکرا سا گیا۔ کیا باجی کو بتادوں مگر میں جو ابھی اتنے شدومد سے اپنے نئے خیالات کا اظہار کر رہا تھا، اتنی ہمت نہ کرسکا کہ باجی کو بتادوں وہ جس کا میں نے ذکر کیا صبا ہی تو ہے۔

''ہاں اچھے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کیسی گزر رہی ہے ان کی، صبا بوبی سے کیسا برتاؤ کرتی ہے؟''

''بہت اچھا۔'' میں نے مختصراً کہا۔

Marfat.com

''میں ان لوگوں پر ایک افسانہ لکھ رہی ہوں'' باجی نے کہا۔

''کس بات پر؟'' میں نے پوچھا۔

''یوں ہی... ان سے ملی تو ایک پلاٹ ذہن میں آ گیا۔ اب تم جانو افسانے تو یوں ہی جھوٹ اور سچ کی پوٹ ہوتے ہیں۔''

''یہ تو میں بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ اچھا یہ بتایئے آپ کو مسز اسد کیسی لگیں...؟'' میں نے پوچھ ہی لیا۔

''بڑی پیاری۔'' باجی نے کہا، ''تمھیں معلوم ہے مجھے بہت کم لوگ پہلی نظر میں پسند آتے ہیں مگر اس پر ایک ہی نظر میں میری طبیعت آ گئی۔''

باجی کس مزے سے اپنی پسندیدگی کا ذکر کر رہی تھیں مگر میں یہی بات انھیں الفاظ میں نہیں کہہ سکتا تھا کیوں کہ دو مختلف آدمیوں کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ہی الفاظ کا مطلب بدل جاتا ہے۔

''عادت کی بھی اچھی معلوم ہوتی تھی وہ لڑکی، تمھارا کیا خیال ہے؟'' یعنی اب باجی غیر شعوری طور پر مجھے کچوکے لگا رہی تھیں۔ اُلٹا مجھ سے اس لڑکی کی سیرت وصورت کے بارے میں پوچھ رہی تھیں جس کے بارے میں کچھ کہنے سے دل کھول کر سامنے رکھ دینا آسان تھا۔

اس کے بعد میرے قیام کے دوران میں باجی نے پھر کبھی میری شادی کا ذکر کیا نہ اس خاص لڑکی کے بارے میں کچھ پوچھا۔ ہاں جب میں چل رہا تھا تو اسٹیشن پر امجد بھیا سے الگ لے جا کر انھوں نے کہا۔

''عامر، تم ہم لوگوں سے بہت دور ہو۔ بیوقوفی میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا۔ میں تمھاری ہم درد ہوں تم جو کچھ کہو گے یا کرو گے، میں اس پر ٹھنڈے دل سے غور کروں گی مگر بغیر سوچے سمجھے جلدی میں کچھ کر بیٹھنے سے کبھی اچھا نتیجہ نہیں نکلے گا۔'' پھر انھوں نے قدرے جھک کر میرے کان میں کہا۔

''ایسا نہ ہو عامی کہ تمھارے ہاتھوں کسی بھولی بھالی لڑکی کی زندگی تباہ ہو جائے۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رندھے ہوئے گلے سے میں نے کہا، ''باجی، آپ نہیں جانتیں کہ میں اسے کتنا پیار کرتا ہوں۔ اس کی زندگی تباہ کرنے سے پہلے میں

Marfat.com

مر جانا پسند کروں گا..."

باجی کی آنکھیں تعجب سے یوں پھٹ گئیں جیسے اُنھوں نے کسی دودھ پیتے بچے کو شیکسپیئر دہراتے سن لیا ہو۔ واقعی وہ مجھے بچہ سمجھتی تھیں اور پورے خلوص سے یہ سوچ رہی تھیں کہ میں بچپنے میں آ کر جو دل میں آئے کہہ رہا ہوں مگر میری آخری بات سے شاید انھیں میرے دل کی گہرائی اور خلوص کا کچھ اندازہ ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس جملے سے جو بغیر کسی شعوری کوشش کے میرے منہ سے نکل گیا تھا، میں خود حیران سا رہ گیا تھا...

اور پھر جو میں نے صبا کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ان چند مہینوں میں وہ کتنی بدل گئی تھی۔ اس کے گالوں کی گلابی جھلکیاں زرد پڑ چکی تھیں، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے اور ہر کام میں غیر حاضر دماغی کی سی کیفیت تھی، مجھے دیکھ کر بھی اس کی آنکھیں ایک لمحے کو بلینک سی ہوگئیں جیسے اس نے مجھے پہلی مرتبہ دیکھا ہو... پھر ان میں آشنا سی جھلک آئی۔ وہ مسکرائی، سلام کا جواب دیا مگر اور کچھ نہ بولی، جیسے مجھے دیکھ کر مبہوت رہ گئی ہو۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" میں نے کہا۔

"اچھی تو ہوں۔" اس نے کہا۔ جس طرح میرے سوال میں اس کی طبیعت نہ ٹھیک ہونے کا صاف اشارہ تھا، اسی طرح اس کے جواب میں یہی کیفیت تھی۔

"آپ بہت کم زور ہوگئی ہیں۔" میں نے پھر کہا۔

"اچھا۔" اس کے لہجے میں تعجب نہیں تھا اور اس اچھا سے میں کچھ نہ سمجھا۔ پھر ایک دم میں مطلب پر آ گیا۔ میرے پاس وقت کم تھا، ابھی میں نے اسد کو بازار میں دیکھا تھا اور میں سیدھا یہاں آ پہنچا تھا تاکہ جو کچھ مجھے کہنا ہے کم سے کم الفاظ میں ایک ہی بار کہہ دوں۔ "صبا!" میں نے بیگم اسد کے بجائے اسے اس نام سے مخاطب کیا جس سے رات دن میں ہمیشہ تنہائی میں اسے مخاطب کیا کرتا تھا اور شاید اسی لیے مجھے یہ لفظ اپنی زبان پر قطعی اجنبی نہیں لگا۔

"صبا! میں یہاں اتنے دن اس لیے نہیں آیا کہ اسد میرا آنا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ میرا یہاں آنا اس لیے پسند نہیں کرتے کہ میں ان کے ایک راز سے واقف ہوں۔"

اس کا رنگ زرد پڑ گیا، "کیسا راز؟" شاید اس کے ہونٹوں نے کہا۔ میں نے صرف ان کو ہلتے دیکھا، آواز سنائی نہ دی۔

Marfat.com

''جس دن میں اٹک گیا تھا، وہاں اسد کے ساتھ سیب کے باغ میں ایک عورت میں نے دیکھی تھی اور اس کے بعد بھی ایک دن...''

''مجھے معلوم ہے۔'' صبا نے میری بات کاٹ کر ہولے سے کہا، ''وہ روبینہ کو اس لڑکے سے بچانے کے لیے اِدھر اُدھر لے جاتے ہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی تو کبھی کبھی میں ساتھ نہیں جاتی۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس نے نظریں جھکا لیں، میز پر رکھی ہوئی اس کی پتلی سڈول انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ اسد کو میری نظروں میں ذلیل ہونے سے بچانے کے لیے وہ جھوٹ بول گئی اور ایسا جھوٹ جس پر بڑے سے بڑا سچ قربان کیا جاسکتا ہے۔ کیا اس زمانے میں ایسی عورتیں بھی ہیں، میں نے حیران ہو کر سوچا۔

''صبا!'' میں نے اس کی کانپتی اُنگلیاں تھام لیں۔ میں تمھارا دوست ہوں، ہم درد ہوں... کیا میں تمھارے لیے کچھ نہیں کرسکتا؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

اور میں جو سوچ کر آیا تھا کہ آج صبا کو قائل کردوں گا کہ تمھیں وہ بندھن توڑنے کا پورا حق ہے جس پر دوسرا قائم نہیں ہے، اسے (Reflective Morality) کا مطلب سمجھاؤں گا اور بتاؤں گا کہ جب کوئی تمھارے قدم چومنے کو تیار ہو تو دوسرے کی ٹھوکریں کھانا حماقت ہے، خاموش کھڑا رہ گیا... صبا کی موجودگی میں یہ سب باتیں کہنی اور لفظ طلاق اپنے منھ سے نکالنا ناممکن تھا۔ اس وقت مجھے شمسہ باجی کی بات یاد آئی۔ ''اس نے تم سے کچھ نہیں کہا اور تم نے اس سے کچھ نہیں کہا، پھر تمھیں کیا معلوم کہ وہ خوش نہیں ہے...'' اور پھر، ''ایسا نہ ہو عامی کہ تمھارے ہاتھوں کسی بھولی بھالی لڑکی کی زندگی تباہ ہوجائے...''

اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ خوش نہیں ہے اس کا خاموش چہرہ، اس کی اُداس آنکھیں ہی بہت کچھ کہہ رہی تھیں مگر جو بات وہ زبان سے نہ کہنا چاہے اس سے کوئی نہیں کہلوا سکتا تھا اور میں اپنی تمام تر ترقی پسندی اور جدت طرازی کے باوجود بالکل بے بس تھا۔

آخر میں اٹھ کھڑا ہوا، وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے یکایک

Marfat.com

میں پلٹا اور میں نے کہا، ''صبا! اگر میں یہ کہوں کہ میں پہلے دن سے تمھیں چاہتا ہوں تو کیا میں تمھاری نظروں میں گر جاؤں گا۔''

وہ ٹھٹک گئی، اس نے مجھے تعجب سے دیکھا اور سر سے پیر تک لرز گئی، پھر کانپتی آواز میں بولی، ''میرے لیے اور مشکلیں پیدا نہ کیجیے۔ میں پہلے ہی...'' پھر وہ تھوڑی سی سنبھلی اور بولی، ''میں... میں اسد کو ہر حالت میں چاہوں گی۔''

''خداحافظ...'' میں نے کہا اور شرابی کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے سیڑھیاں اُترنے لگا اور اس رات تیسری مرتبہ میں نے دل سے دو بہ دو بات کر کے فیصلہ کیا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

اس کے بعد میں صبا سے نہیں ملا لیکن اکثر روبینہ کی زبانی مجھے اس کی خیریت معلوم ہوتی رہی۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ صبا پنڈی چلی گئی ہے۔ اب کے سردیوں میں اسد کو مشرقی پاکستان جانے کی اُمید ہے اور اتنی دُور جانے سے پہلے صبا چند ماہ اپنے بابا اور پھوپھی کے پاس گزارنا چاہتی ہے۔ روبینہ سے فرمائش کر کے وہ خط میں نے خود دیکھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ اس کا پہلا طبع زاد افسانہ اُردو کے بہترین اور مقبول ترین رسالے میں شائع ہوا ہے۔ میں نے وہ افسانہ خود پڑھا اور روبینہ سے صبا کا پتہ لے کر اسے مبارک باد کا خط بھی لکھا مگر میرے پاس خط کا کوئی جواب نہیں آیا۔ مجھے اس سے ذرا بھی رنج نہ ہوا کیوں کہ مجھے جواب کی اُمید بھی نہیں تھی۔ انسان ہر کام بدلہ چکانے کے لیے تو نہیں کرتا...

OOO

۶

آج اکتوبر کی آخری تاریخ ہے۔ ایک ماہ اور گزر گیا۔ اس کا مطلب ہے اب میری زندگی کے چار ماہ اور رہ گئے ہیں۔ صبا کی نظر بابا کی کھلی ڈائری پر پڑی تو سب سے اُوپر ذرا بڑے حروف میں یہ جملہ درج تھا صبا حیران سی رہ گئی، کیا بابا نے بھی افسانہ نگاری شروع کر دی۔ وہ ذرا اور آگے بڑھ گئی اور پھر وہ اس تحریر کو اپنی نظروں سے یوں نگلتی چلی گئی جیسے کوئی ندیدہ تر پلاؤ بغیر چبائے نگل رہا ہو۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ بابا غسل خانے سے آکر اسے پرائیویٹ ڈائری پڑھتے ہوئے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ ابھی ابھی وہ کوئٹہ سے یہاں پہنچی تھی۔ اس نے کسی کو اپنے آنے کی اطلاع تک نہیں دی تھی۔ گھر پہنچی تو بوڑھے خانساماں کے علاوہ کوئی نوکر نہیں تھا۔ ''بڑے صاحب اپنی اسٹڈی میں تھے، میں تو جی بہت دیر سے باورچی خانے میں ہوں۔'' اس نے ہاتھ ملتے ہوئے بتایا۔ اتنی بڑی کوٹھی میں اس کی آمد نے ذرا بھی ہلچل پیدا نہیں کی، کسی کو پتا ہی نہیں چلا... خانساماں نے سامان اندر رکھوایا اور پھر باورچی خانے میں لوٹ گیا... صبا اندر گئی۔ بابا اپنے کمرے میں نہیں تھے، اس نے اسڈی میں جھانک کر دیکھا۔ ٹیبل لیمپ رکھا تھا جس کی روشنی میں کھلی ہوئی ڈائری چمک رہی تھی۔ وہ بے خیالی میں دوچار قدم آگے بڑھ گئی جہاں اس کی نظر اس جملے نے مقید کرلی۔ اب میری زندگی کے چار ماہ اور رہ گئے ہیں۔ اس کے آگے لکھا تھا، ''دو ماہ پیش تر کینسر انسٹی ٹیوٹ کے بڑے ڈاکٹر نے نہایت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا تھا، آپ کا مرض اب ایڈوانس اسٹیج میں ہے اور آپ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہیں گے۔ تعجب ہے کہ یہ سن کر میں بے ہوش نہیں ہوگیا۔ کرسی سے اُچھلا نہیں، چیخ نہیں ماری صرف

Marfat.com

ہنستے ہوئے اتنا پوچھا، ''پھر بھی اندازاً کتنے دن آپ کے ساتھ اس دُنیا میں رہ سکوں گا؟''
میرے اس سوال پر ڈاکٹر کے چہرے پر کرب کی ایک عجیب وغریب لہر دوڑ گئی اس نے کہا، ''میرے ساتھ؟ میں خود اس دنیا میں چند ماہ کا مہمان ہوں... میں اور آپ ایک ہی سفر کے راہی ہیں۔ میرا مرض بھی علاج کی حد سے گزر چکا ہے، مجھے معلوم ہے اگر انسان کو یہ معلوم ہو کہ وہ کتنے دن دنیا میں ہے تو اس کا رویّہ بالکل بدل جاتا ہے۔ چند دن بعد اسے وہ سکون اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ مسرت حاصل ہوتی ہے جو کسی اور کو نہیں ہوتی... مریض جوان ہو یا کم زور دل عورت ہو تو میں اس کے عزیزوں کو رائے دیتا ہوں کہ اسے خاموشی اور سکون سے مرنے دیا جائے اور اسے اس کی مختصر زندگی کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے لیکن ہم آپ جو زندگی کی ساری بہاریں دیکھ چکے ہیں، اس مختصر عرصے میں ایک عجیب قسم کی لذت سی محسوس کرتے ہیں۔ آپ کو جلد ہی اس کا تجربہ ہو جائے گا...''
میں ڈاکٹر کی یہ گفتگو سن کر حیران سا رہ گیا۔ ''پھر بھی آپ نے وہ مدت نہیں بتائی جتنے عرصے میرا زندہ رہنے کا امکان ہے۔'' یہ میں نے اس طرح کہا گویا کسی اور کی زندگی اور موت کا سوال درپیش ہو، میرا کوئی پیچ ہی نہ ہو۔
''زیادہ سے زیادہ چھ ماہ... اور میری زندگی کی مدت اس سے بھی مختصر ہے...''
مجھے معلوم تھا وہ محض میری تسلی کے لیے یہ بات نہیں کہہ رہا۔ وہ اپنے کینسر کے علاج کے لیے خاصا عرصہ دوسرے ملکوں میں گزار کر آیا تھا۔ وہ خود اس بیماری کا اسپیشلسٹ تھا جو سائنس کے اس دور میں بھی ناقابلِ علاج تھی اور دواؤں، ریڈیم اور آپریشن سے وہ اس مرض کا تن دہی سے مقابلہ کرنے کی، زیادہ سے زیادہ مریضوں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے آخری لمحوں کا منتظر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ چند دن بعد اسے خود بستر پر لیٹ جانا ہوگا اور تب وہ انسانیت کے اس مہلک ترین دشمن سے نہ لڑ سکے گا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی یہ تن دہی، آرام سے پہلو تہی اسے جلد انجام کی طرف لے جا رہی ہے مگر جیسا کہ اُس نے خود کہا تھا، اپنی زندگی کا یہ مختصر عرصہ وہ سکون اور دوسروں کی مدد سے حاصل ہونے والی مسرت سے ہم کنار ہو کر گزارنا چاہتا تھا۔ اس ڈاکٹر کی زندگی بذاتِ خود میرے لیے اتنی بڑی مثال تھی کہ اپنی زندگی کے اختتام کی بات میں نے اتنے سکون سے سنی جیسے وہ چھ ماہ بعد آنے والے زلزلے کے کسی معمولی جھٹکے کی پیش گوئی کر رہا ہو... میں

Marfat.com

نے، جو ہمیشہ سے موت کو انسان پر قدرت کا سب سے بڑا ظلم سمجھتا تھا، بچپن سے میں نے بارہا موت کے فلسفے پر غور کیا تھا۔ دُنیا بھر کے فلسفیوں کا فلسفۂ موت مجھے محض خوش فہمی نظر آتا تھا۔ آواگون کا مسئلہ، دوسری دنیا کے خواب اور یہ کہ زندگی محض آنے والی زندگی کا پرتو ہے، اقبال کا فلسفۂ موت۔

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظامِ کائنات

اور

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

عالم گیر پیمانے پر یہ سب ٹھیک ہے، بہت خوب صورت فلسفہ ہے لیکن آپ ذرا اسے ایک فرد کے تصور سے دیکھیے، ماں باپ کا ایک پیارا کھیلتا مالتا بچہ ہے جس کی ہر حرکت پیاری اور دل لبھانے والی ہے، وہ ایک دن بیمار ہو کر، تالاب میں گر کر، کار کے نیچے کچل کر ختم ہو جاتا ہے، کیوں؟ وہ اسے پھر کبھی نہیں دیکھ سکتے، وہ پھر کبھی نہیں اُٹھتا۔ کبھی پیار سے ان کو ابا امی نہیں کہتا، کیا اس غم کا مداوا ہو سکتا ہے، کیا اس سے بڑا ظلم کوئی اور ہو سکتا ہے، ایک بچے کی ماں مر جاتی ہے اور ساری عمر اسے وہ ہستی کبھی نہیں ملتی جس کی اس کو اتنی ہی ضرورت تھی جتنی پانی اور ہوا کی۔ یہ میں اکثر سوچا کرتا تھا... یوں ہی بیٹھے بیٹھے میں اپنے کسی بچے کی طرف دیکھتا اور سوچتا۔ اگر یہ ختم ہو جائے تو میں کیا کروں گا۔ کیا میں پھر کبھی... کبھی اس کی پیاری صورت نہ دیکھ سکوں گا۔ اس کی میٹھی باتیں نہ سن سکوں گا۔ شاید یہ خوف ہر وقت میرے لاشعور میں پوشیدہ رہتا تھا جو کبھی کبھی بجلی کی مانند لمحہ بھر کو میرے شعور میں جھانکتا اور غائب ہو جاتا۔ شاید اس لاشعوری احساس نے مجھے نرم دل اور بچوں کے ساتھ محبت کرنے والا بنا دیا تھا لیکن مجھے کبھی اتنی فرصت نہیں ملی کہ میں ان سب کا دکھ فرداً فرداً پوچھوں۔ مجھے جب بھی موقع ملتا، ان سب کو اکٹھا کر کے کوئی کھیل کھیلتا، لطیفے سنتا اور دو گھڑی خوش ہو لیتا۔ مالی مشکلات، کام کی زیادتی اور بچوں کی افراط میرے ذہن پر ضرور برا اثر ڈالتی، اگر میں اس شدت سے یہ محسوس نہ کرتا کہ ان سب سے بڑی ٹریجڈی بھی دُنیا میں ہے جس پر کوئی چیز فتح نہیں پا سکتی...

اب میں کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ میرے ساتھ آئندہ ہونے والا تھا شاید یہ اس کی آگہی کی ہلکی سی لہر تھی جو کسی نامعلوم منبعے سے میرے لاشعور میں جاگزیں ہوئی اور کبھی کبھی میرے شعور میں بھی تیرتی رہی، جس کو میں اس وقت نہیں سمجھ پایا۔ میں موت کو انسان پر سب سے بڑا ظلم کہتا رہا اور موت نے اس ظلم کے لیے مجھ ہی کو انتخاب کیا۔ جانے کب سے اس کی نظریں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ ۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارا ہوا اور وہ جنس جو قدرت کا سب سے بڑا ظلم تھی، ایک دم ارزاں ہوگئی۔ میں پہلے سے پاکستان کے لیے آپٹ کر چکا تھا اور ہر وقت وہاں پہنچنے کے طریقوں اور راستوں پر غور کیا کرتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے سب سے لمبا اور سب سے محفوظ راستہ طے کیا۔ یہ بمبئی پہنچ کر بذریعہ جہاز کراچی جانے کا تھا۔ جب تمام تیاریاں مکمل ہوگئیں اور ہم رخصت ہونے لگے تو یکایک صبا بیمار ہوگئی۔ مگر یہ وہ وقت نہیں تھا جب بچوں کی چھوٹی موٹی بیماریاں سفر کو ملتوی کردیتی ہیں، یہ زندگی اور موت کا سوال تھا اور اس وقت بچ نکلنے کے لیے موقع غنیمت تھا پھر جانے کیا ہوا۔ پہلے میں نے اپنا سامان ویگن میں بھر کر پاکستان روانہ کردیا یعنی اسے ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دیا کیوں کہ اس زمانے میں بھری ویگنوں کا ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ جانا بھی معجزے سے کم نہ تھا اور پھر جمیلہ اور بچوں کو لے کر جن میں بیمار صبا بھی شامل تھی، خدا کے بھروسے گاڑی میں آن بیٹھا۔ اس گاڑی میں یہاں سے وہاں تک نہتے مسلمان بھرے ہوئے تھے، گاڑی یوں ٹھسا ٹھس تھی کہ سانس لینا بھی دشوار تھا۔ صبا کی زرد رنگت اور معصوم لاچار سی آنکھیں دیکھ کر میرا دل دُکھتا تھا۔ اس کے لیٹنے کے لیے ذرا سی جگہ بھی نہ تھی، وہ اس مجبوری کو خوب سمجھتی تھی اس لیے خاموش دل پر جبر کیے بیٹھی تھی، مصیبت کے وقت انسان کی قوتِ برداشت بڑھ جاتی ہے، ہم سب کی بھوک اور پیاس برداشت کرنے کی طاقت بڑھ گئی تھی، جب اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا ختم ہوگیا تو ہم سب بھوکے رہے۔ کون کسی سے کہتا کہ اسے بھوک لگی ہے سب ایک ہی ناؤ میں سوار تھے۔ جمیلہ جو بھیڑ بھڑ کے سے بے حد گھبراتی تھی، ذرا سا کوڑا دیکھ کر اس کا دل لوٹنے لگتا تھا اور بچوں والے گھر میں سارا دن صفائی کرتے گزر جاتا تھا وہ ان سب چیزوں کو بیک وقت برداشت کر رہی تھی، اتنے آدمیوں کے سانس کی گرمی، پسینے کی بو، حبس اور بھوک صبا زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو کر دھڑ سے فرش پر گری۔ اس وقت

Marfat.com

اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اسے کوئی چیز بچھا کر فرش پر ہی لٹا دیا جائے۔ لوگوں نے تھوڑی تھوڑی ٹانگیں سمیٹ لیں۔ کھڑے ہوئے لوگ ذرا اور نزدیک ہو گئے اور میں نے صبا کو فرش پر لٹا کر اس پر ہلکی سی ایک چادر ڈال دی اور پنکھا جھلنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی صبا ہمیں چھوڑ کر کسی اور منزل کو روانہ ہو جائے گی، اس وقت مجھے اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا۔ میں اس کے لیے کچھ بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ اس رنج و بے بسی کے عالم میں کچھ دیر کو میں اس بڑے خوف کو بھول گیا جس میں ہم سب کی جانوں کو خطرہ لاحق تھا۔ دوبارہ مجھے اس خطرے کا احساس اس وقت ہوا جب لوگوں کی چیخ و پکار اور گولیوں کی سنسناہٹ نے یک لخت قیامت کا سماں پیدا کر دیا۔ میں اسی طرح فرش پر بیٹھے بیٹھے نیچے جھک گیا اور شاید ٹوٹتی شاخوں کی طرح انسانوں کے اعضا کی اور خون کی بوچھاڑ دیکھ کر بے ہوش ہو گیا اور نہ جانے یہ کتنے عرصے بعد کی بات ہے، جب یہ اچھی طرح میرے ذہن نشین ہوا کہ اس بھرے پرے کنبے میں سے صرف ہماری دو جانیں بچی ہیں میری اور صبا کی...

صبا بیمار تھی اور قریب المرگ تھی، میں تن درست تھا مگر جیسے زندہ نعش تھا۔ قدرت کا سب سے بڑا ظلم مجھ پر اپنا بھرپور وار کر کے شاید دُور کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔

وقت جس کو ہر زخم کا مرہم بتایا گیا ہے، جیت گیا۔ صبا رفتہ رفتہ ٹھیک ہو گئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ موت کی دہلیز سے واپس لوٹ آئی، اور صبا کو زندہ دیکھ کر میں پھر سے زندہ ہو گیا... میں نے پھر اس سرکاری نوکری کی طرف دھیان نہیں دیا جو مجھے خانہ بدوشوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑاتی پھرتی تھی، میں نے ریٹائرمنٹ مانگ لیا اور جو جمع پونجی ملی اسے تجارت میں لگا دیا، عام رائے یہ تھی کہ میں اپنا تمام سرمایہ بیوپار کی بھینٹ چڑھا کر ہارے جواری کی طرح کسی عزیز کے رحم و کرم پر آن پڑوں گا۔ شروع سے ہی اگر میں سونے کو ہاتھ لگاتا تھا تو وہ مٹی بن جاتی تھی مگر اب وہی قسمت بدل گئی میں مٹی کو ہاتھ لگاتا تو وہ سونا ہو جاتی۔ بڑے بوڑھے کہتے۔ سچ ہے دنیا میں ہر چیز ہر ایک کو نہیں ملتی۔ جب اولاد کی نعمت تھی تو بے چارے کا ہاتھ ہمیشہ تنگ رہا۔ اب وہ نہیں تو دولت قدم چومنے آ گئی۔ شاید یہ بات ٹھیک ہو یا ممکن ہے میں اپنا غم غلط کرنے کے لیے وہ قوتیں بروئے کار لا رہا ہوں جو عام حالت میں سوئی پڑی ہوں یا اس کی وجہ جیسا کہ بہت سے

Marfat.com

لوگوں کا خیال تھا، پاکستان کی معاشی حالت ہو بہر حال دیکھتے ہی دیکھتے میں لوگوں کی نظروں میں کہیں کا کہیں پہنچ گیا مگر روپے پیسے نے کبھی میری زندگی میں اہمیت حاصل نہیں کی اور نہ صبا ہی کبھی اس سے زیادہ متاثر ہوئی۔ صبا بچپن سے تعلیم کی شوقین اور پڑھائی میں تیز تھی۔ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد میں نے اسے پاکستان کے بہترین انگریزی کالج میں داخل کردیا، جہاں صرف بڑے بڑے آدمیوں کی لڑکیاں پڑھتی تھیں... وہ یہاں بھی پڑھائی میں اچھی رہی مگر اس نے کبھی وہاں کی نت نئی فیشنوں پر دھیان نہیں دیا جو اس کالج کا طرۂ امتیاز تھیں، حالاں کہ وہ چاہتی تو ان میں سے اکثر لڑکیوں سے زیادہ روپیہ اپنی ذات پر خرچ کرسکتی تھی، دراصل یہ دولت اپنے تمام عزیز ہستیوں کو کھونے کے بعد مجھے بھی مہنگی لگی اور صبا کو بھی... بقول خلیل جبران:

”کل میں مسرت کے خزانوں سے امیر تھا۔ آج میں سونے کے ڈھیروں میں غریب ہوں۔“

صبا کو پرانی اقدار عزیز ہیں۔ اس کا خمیر ان چیزوں سے نہیں اُٹھا، تب بھی وہ انھیں پسند کرتی ہے، ان کی خاطر لڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے اور نئی پود میں خود کو دقیانوسی کہلوانے سے نہیں ڈرتی... دوسرے اسے اُردو زبان سے غیر معمولی محبت ہے، انگریزی اسکول اور کالج میں پڑھنے کے بعد فرفر انگریزی بول سکنے کے باوجود وہ روز مرّہ گفتگو میں شاید ہی انگریزی الفاظ استعمال کرتی ہے حالاں کہ یہ چیز موجودہ نسل ہی کا نہیں ہماری نسل کا بھی روزمرہ بن چکی تھی۔ وہ بڑی سے بڑی سوسائٹی اور محفل میں صرف اس وقت انگریزی بولتی جب اس کی گفتگو کسی غیر ملکی سے ہو رہی ہوتی، کئی دفعہ اُسے رواں دواں انگریزی بولتے دیکھ کر پاکستانی خواتین چونک اُٹھتی تھیں، ان میں سے دو ایک نے تو کہہ بھی دیا تھا کہ ہمیں آج تک اندازہ نہیں تھا کہ صبا اتنی اچھی انگریزی بول سکتی ہے، یہ وہ خواتین تھیں جو اپنی قابلیت کی ساری نقدی پہلی ہی ملاقات میں دوسروں کے سامنے پیش کر دیتی ہیں اور باقی عرصہ اپنی ظاہریٔ ہیئت اور لباس کا جادو جگاتی رہتی ہیں اور ہر ماہ اپنا باتوں کا اسٹائل بدل کر اس میں تنوع پیدا کرتی ہیں۔

بعض اوقات یہاں تک بھی ہوا کہ وہ ایسی غیر ملکی خواتین سے جو اُردو سمجھتی تھیں، اُردو میں گفتگو کرتی رہی، یہ منظر قابلِ دید ہوتا، وہ بڑے سکون سے اُردو بولتی رہتی

Marfat.com

اور غیر ملکی خاتون انگریزی۔ وہ یہی سمجھتیں کہ بے چاری انگریزی سمجھ لیتی ہے بول نہیں سکتی، ایک مرتبہ جب اس بات پر میں نے اس سے کہا، ''صبا، تم ان باتوں میں ناقابلِ عمل حد تک اصولی ہو۔'' تو وہ بڑے جوش سے بولی، ''آپ نے خود دیکھا کہ یہ طریقہ کس حد تک قابلِ عمل ہے، ہم دونوں پورے ایک گھنٹے باتیں کرتی رہیں...'' میں ہنس دیا تو وہ بگڑ کر بولی، ''جب وہ اُردو سمجھ لیتی ہیں تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ ان کی زبان بولوں۔ انھوں نے پاکستانی سے شادی کی ہے تو انھیں چاہیے کہ ہماری زبان سیکھیں، انھیں ساری عمر یہاں رہنا ہے بلکہ میں تو اُردو بول کر ایک طرح سے ان کی مدد کر رہی تھی۔'' جب کبھی میں مذاق میں اس سے بحث کرتا تو اس کا گلابی چہرہ سرخ پڑ جاتا آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکنے لگتیں اور مجھے اس کا بچپن یاد آجاتا۔ بچپن سے ہی سیدھی سادی ہونے کے باوجود وہ جوشیلی تھی...

میں کبھی کبھی بے اختیار خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے صبا کو موت کے ظالم چنگل سے بچالیا تھا، ورنہ میری زندگی کس حد تک ویران ہو جاتی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن لڑکیاں آخر کب تک والدین کے پکھوے سے لگی بیٹھی رہ سکتی ہیں، اس کو مجھ سے جدا ہونا ہی تھا، میں چاہتا تھا اسے کوئی ایسا ساتھی مل جائے جو اسے پورے طور پر سمجھ سکے اور وہ ہمیشہ خوش رہیں، میں نے صبا پر بھی زور دیا تھا کہ وہ کسی شخص کو پسند کرتے وقت ان باتوں کا خیال رکھے، ان سب چیزوں پر غور کرنے کے بعد ہی غالبًا اس نے اسد کو پسند کیا تھا، اسد خوش شکل اور شریف خاندان کا لڑکا ہے، اس میں تھوڑی سی بناوٹ ہے لیکن یہ بناوٹ اب ہمارے نوجوانوں میں عام ہے اب تو یہ ہمارے قومی کردار کا ایک ضروری جزو بن چکی ہے اس لیے اس سے بچنا ناممکن ہے اہم چیز یہ ہے کہ صبا اسے پسند کرتی ہے، اسے چاہتی ہے اور شادی کے بعد وہ دونوں بوبی کے ساتھ نہایت پیار اور سکون بھری زندگی گزار رہے ہیں، خدا کرے وہ ہمیشہ اسی طرح خوش وخرم رہیں۔

ان کی اس سکون بھری دُنیا میں کس طرح میں یہ کہہ کر پتھر پھینک دوں کہ میں صرف چند ماہ کا مہمان ہوں، صبا کی حساس طبیعت اس نئی آفت کو قبل از وقت کیسے برداشت کرے گی۔ نہیں میں اس بارے میں قطعی خاموش رہوں گا، صرف اسے لکھ دوں گا کہ میری خواہش ہے وہ چند دن میرے پاس آکر رہے، اتنے عرصے کے ساتھ اور یکایک

Marfat.com

اتنے دن کی علیحدگی کے بعد میری یہ خواہش قطعی فطری ہے۔ وہ آئے گی تو میں دل بھر کر اسے دیکھ لوں گا، اس کے ساتھ رہوں گا اور پھر ہنسی خوشی اسے رخصت کردوں گا اور ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں داخل ہو کر اطمینان سے اپنی زندگی کے آخر چند ہفتے گزار دوں گا اور وصیت کردوں گا کہ مجھے نہایت خاموشی سے دفن کرنے کے بعد صبا کو اطلاع دے دی جائے کہ میں اب اس دُنیا میں نہیں ہوں اور میرا جو کچھ تھا اب اس کا ہے، وہ آخری بار میرا چہرہ نہ دیکھ سکنے پر ضرور روئے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس رنج سے کہیں کم ہوگا جو اسے آخری بار میرا بے حس جسم دیکھنے پر ہوتا۔ تب رفتہ رفتہ وقت اس زخم کو مندمل کردے گا۔ وہ اپنے بچوں میں جلد ہی اپنے بوڑھے باپ کو بھول جائے گی اب اقبال کا وہ فلسفۂ موت۔

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

میری سمجھ میں آتا جارہا ہے، موت قدرت کا اٹل قانون ہے۔ اس لیے موت کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں، موت زندگی کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی پیدائش۔

میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ اس عرصے میں صبا کا کوئی اپنا بچہ ہوتا جو اسے ہمہ وقت اپنے میں الجھائے رکھنے کے علاوہ، اسے غم سے لڑنے کی صحیح قوت دیتا اور میں بھی دوسری دُنیا میں پہنچنے سے پہلے ایک بار اسے اپنے پیارے چھوٹے سے قافلے کے ساتھ زندگی کے سفر پر رواں دواں دیکھ لیتا۔ میں نے ایک بار اسد کو اس بات کا اشارہ بھی دیا تھا، لیکن ابھی ہمارے ملک میں یہ وہ موضوع نہیں جس پر باپ بیٹی یا سسر داماد کھل کر بات چیت کر سکیں... ممکن ہے اسد نے میرا اشارہ پا کر اس پر عمل بھی کیا ہو اب یہ تو ضروری نہیں وہ مجھے آکر بتائے آپ کا حکم بجا لایا گیا ہے، میں کیا فضول اوٹ پٹانگ باتیں لکھ رہا ہوں۔ (انسان خود سے باتیں کرتے ہوئے کتنا بچہ بن جاتا ہے) نامعلوم کیوں مجھے ایسی باتوں پر ہنسی آرہی ہے، یہ آپس کے رشتے کتنے مستحکم، کتنے مقدس اور کتنے مضحکہ خیز ہیں۔ بہرحال میں جلد ہی صبا کو لکھوں گا کہ وہ بوبی اور اسد کے ساتھ چند ماہ میرے پاس گزار جائے، میں تنہائی سے اکتا گیا ہوں اور اس کی کمی شدت سے محسوس...

آخری جملہ ادھورا چھوڑا گیا تھا جیسے وہ لکھتے لکھتے کسی ضروری کام سے اٹھ گئے

ہوں۔ تحریر ختم کر کے وہ چونکی اور اسے خیال آیا کہ اس طرح یہاں کھڑے رہنا مناسب نہیں۔ وہ الٹے پاؤں پھری اور اپنے کمرے میں پہنچ کر دم لیا اور تب خیالات کا دھارا یکا یک برس پڑنے والی موسلا دھار بارش کی طرح اس کے ذہن میں امنڈ پڑا... کیا یہ سب سچ ہے، کیا واقعی ابا صرف چار ماہ کے مہمان ہیں؟ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی لیکن یکا یک اسے خیال آیا کہ ممکن ہے ابا جان ابھی غسل خانے سے نکل آئیں اور گھر میں چہل پہل دیکھ کر اس کے کمرے کا رخ کریں۔ انتہائی غم میں بھی بعض اوقات انسان کا شعور اسے دغا نہیں دیتا۔ اس نے اپنی چیخیں روک لیں اور آنکھوں کے لبالب پیالوں کو رومال سے خشک کر لیا۔ وہ یہاں آئی تھی، بابا سے رائے لینے کے لیے کہ وہ کیا کرے۔ وہ کس طرح اپنے الجھے ہوئے حالات کو سلجھائے، بہت پریشان ہونے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ بابا ہی اسے صحیح راہ دکھا سکتے ہیں اور اسے انھی سے رجوع کرنا چاہیے... وہ ان سے پوچھے گی، کیا ایک چیز کو ہر حال میں چاہنا اور چاہتے رہنا ضروری ہے، خواہ وہ دن میں دو مرتبہ آپ کا دل توڑتی رہے... کیا محبت کے عہد و پیمان واقعی دائمی ہوتے ہیں۔ کیا شادی وہ معاہدہ نہیں ہوتا جسے فریقین اپنی مرضی کے مطابق نہ پا کر توڑ سکیں۔

اور کیا اپنا جسم اپنی مرضی کے خلاف کسی کے حوالے کرتے رہنا طوائف پن نہیں ہے، خواہ وہ اپنا شوہر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا خیال تھا، یہ سب باتیں وہ کسی نہ کسی طرح بابا سے ضرور پوچھے گی اور ان کے فیصلے پر عمل کرے گی۔ بابا اس کی پہلی اور آخری غلطی کو ضرور معاف کر دیں گے۔ وہ فراخ دل اور سمجھ دار ہیں، دوسرے بڑے بوڑھوں کی طرح رواج اور تنگ نظری کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ اس کی بیوقوفی تھی جو اتنے عرصے خاموش رہی، اسے پہلے ہی بابا سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔ آخر تو وہ اس کے بابا ہی ہیں جو اس کے باپ بھی ہیں اور ماں بھی، سر پرست بھی ہیں اور دوست بھی.. مگر جب وہ ان سے رائے لینے آئی تو اس نے دیکھا کہ اپنے آخری سفر کے لیے وہ اپنا رختِ سفر باندھ چکے ہیں اور منزل کی طرف خوشی خوشی قدم بڑھا رہے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ اپنے پیچھے وہ تمام کام بخیر و خوبی انجام دے گئے ہیں ان کے آگے کی راہ ہموار ہے اور وہ اپنی اکلوتی بچی کو محفوظ اور خوشیوں سے پھلتے پھولتے چمن میں چھوڑ کر جا رہے ہیں، ایسے وقت میں وہ انھیں کیسے بتائے کہ پھول آگ کے شعلے بن کر اسے جھلسا رہے ہیں اور بادِ صبا بادِ

Marfat.com

سموم بن گئی ہے۔

اور تب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بابا کی آخری راہ میں کانٹے نہیں بوئے گی، وہ خاموشی اور سکون سے انھیں اپنی راہ جانے دے گی اور جو کچھ بیتے گی تن تنہا اپنی جان پر سہے گی۔ انھیں یہ سمجھتے ہوئے ہی ختم ہونا چاہیے کہ میں خوش ہوں اور یہ بھی کہ ان کی جان لیوا بیماری کے متعلق ذرہ بھر بھی کچھ نہیں جانتی... اس وقت اسے احساس ہوا کہ جو بوجھ وہ ہلکا کرنے آئی تھی، آتے ہی دو چند بلکہ سہ چند ہو گیا ہے، پہلے کے مقابلے میں اسے اور بہت کچھ خاموشی سے برداشت کرنا ہے، اپنے شفیق باپ کی موت کی سمت روانگی ٹھنڈے دل سے دیکھتے رہنا اور کچھ نہ کہنا۔ کیا وہ تنہا یہ سارے غم برداشت کر سکے گی، یہی تو اس کا امتحان ہے۔ یہی تو دیکھنا ہے۔

قدموں کی چاپ سنائی دی اور اس نے رومال سے آنسو پونچھے اور الماری کھول کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے اپنے کپڑے لٹکا رہی ہو۔ وہ بابا ہی تھے۔

''ارے تم کب آئیں۔ بالکل بغیر اطلاع۔'' انھوں نے حیران ہو کر پوچھا...

''آداب۔'' اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ابھی ابھی پہنچی ہوں۔ نہ آپ کہیں نظر آئے نہ پھوپھی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر سامان رکھنے لگی۔

بابا نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بولے ''اسد اور بوبی کہاں ہیں۔''

''اسد چند روز کے لیے دورے پر جا رہے تھے پہلے میرا ارادہ ساتھ جانے کا ہوا پھر سوچا کچھ دن آپ کے پاس رہ آؤں۔'' اس نے سوچی سمجھی اسکیم سنا دی، بوبی کی بات اس نے گول کر دی، اسے یاد آیا کہ کس طرح اس نے بوبی کو اپنے ساتھ لانے کی ضد کی تھی اور اسد نے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ آج تک نہیں سمجھی تھی کہ اسد بوبی کے معاملے میں اس پر اعتبار کیوں نہیں کرتا تھا۔

''واقعی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے، میں خود سوچ رہا تھا تمھیں کچھ دن کے لیے بلا لوں۔'' انھوں نے کہا۔

''اچھا... کوئی خاص بات؟'' وہ خود حیران رہ گئی کہ وہ کتنی کامیاب ایکٹنگ کر رہی تھی۔''

''نہیں۔ بھئی... کیا تمھارے بابا کو اتنا حق بھی نہیں کہ کبھی دل گھبرائے تو بیٹی کو بلوا لے۔''

Marfat.com

''کیوں نہیں۔ میں نے تو ایسے ہی پوچھا تھا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''بوبی کہاں ہے؟'' انھوں نے پھر پوچھا۔

''وہیں... اسد نے اسے اسکول میں داخل کروا دیا ہے۔''

''اتنی جلدی۔ ابھی تو وہ بہت چھوٹا ہے۔''

''گھر میں تنہا تھا۔ ساتھ کے سارے بچے چلے گئے تھے اب اسکول میں خوش رہتا ہے نرسری ہی میں تو ہے۔'' صبا نے کہا۔

''اس سے تو بہتر ہوتا کہ تم لوگ اس کے کھیلنے کے لیے کسی بھائی یا بہن کا انتظام کر دیتے۔'' انھوں نے یکایک کہا اور ایسی بات کہنے کے بعد شاید بیٹی کا سامنا نہ کرنے کے لیے انھوں نے جلدی سے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

''اپنی پھوپھی سے تو مل لو۔ عائشہ۔'' انھوں نے پکارا۔

پھوپھی عائشہ پچاس سال کی بچی تھیں، ان کا قد کوئی ساڑھے تین فٹ تھا۔ ننھے ننھے ہاتھ پاؤں تھے۔ جب چودہ سال کی عمر میں ان کی شادی ہوئی ہے تو سنا ہے سسرال میں انھوں نے بڑے بڑے تماشے کیے تھے، وہ بلاناغہ رات کو کسی بچے کی پائنتی پر پڑ کر سو جاتی تھیں اور جب انھیں اُٹھا کر اپنے کمرے میں بھیجا جاتا تو یہ اس قدر جھلاتیں اور بڑبڑاتیں کہ گھر کی کنواری لڑکیاں تک مسکرانے لگتیں اور صبح کو وہ پھر کسی اور بچے کے پائنتی سوئی ہوئی ملتیں... اُنھیں اچھے کپڑوں رنگین دوپٹوں، زیور اور مہندی کا بڑا چاؤ تھا۔ شادی ان کے لیے صرف اُنھیں چیزوں کے حصول کا نام تھا۔ سب کہتے رہے۔ بچی ہے رفتہ رفتہ سدھر جائے گی مگر وہ بیس بائیس سال کی عمر تک بھی نہ سدھریں، اُنھیں کپڑوں اور زیوروں کا ابھی تک شوق تھا۔ مہندی باقاعدگی سے لگاتی تھیں، اپنی باریک اور سُریلی آواز میں دن بھر مینا کی طرح گاتی پھرتی تھیں اور جب کسی بات پر ہنستیں تو یوں معلوم ہوتا جیسے بہت سی کانسی کی تھلیاں مع ننھی ننھی کانسی کی پیالیوں کے زمین پر بکھر کر بج اٹھی ہوں۔ ان کے میاں نے چند سال اور انتظار کیا مگر وہ نہ سنبھلنا تھیں نہ سنبھلیں، آخر اُنھوں نے دوسری شادی کر لی، پھوپھی اسی طرح اپنے کپڑوں اور زیوروں کی بقچی اُٹھا میکے چلی گئیں۔ (پہلے وہ زیادہ تر اپنے بڑے بھائیوں کے ساتھ رہتی تھیں مگر پاکستان بننے کے بعد صبا کے بابا کے ساتھ رہنے لگی تھیں)۔ میکے میں بھی وہ اسی طرح مٹی کے کونڈے میں اپنے ململ کے

Marfat.com

دوپٹے سبز اور گلابی لہریا رنگتی رہیں، اس طرح پہلی کی پہلی نئی چوڑیاں پہنتی رہیں اور اپنی باریک آواز میں پرانے گیت اور نئے فلمی گانے گاتی رہیں اور ان کی جھنکار دار ہنسی سے گھر کے کمرے اور دالان گونجتے رہے اور پھر جب ایک دن سنا کہ ان کے میاں کا انتقال ہوگیا تو وہ یوں ہی کچھ دیر کو افسردہ سی ہوگئیں، جیسے کوئی پاس پڑوس کی ایسی خبر سن کر ذرا دیر کو سن سا ہو جاتا ہے۔ کسی نے ان کی چوڑیاں توڑنے اور رنگین دوپٹے کو سفید سے بدلنے کی رائے دی تو ان کی اماں بولیں۔ ''اے رہنے بھی دو۔ وہ غریب کیا جانے کہ سہاگ کس چڑیا کا نام ہے۔'' اس زمانے کی عورتیں کتنی سمجھ دار تھیں، انھوں نے نفسیات نہیں پڑھی تھی پھر بھی وہ جانتی تھیں کہ اگر ان کے جھوٹے سہاگ کے بہانے عام دستور کے مطابق ان سے رنگین دوپٹے، رنگین چوڑیوں اور مہندی کا حق چھین لیا گیا تو ان کی زندگی کتنی ویران ہوجائے گی، لوگ باتیں بناتے رہے مگر ان کی اماں نے ان کی باتوں پر دھیان نہیں دیا اور پھوپھی کی زندگی کی بہار جوں کی توں قائم رہی۔ اب وہ پچپاس سال کی تھیں لیکن اب بھی ان کی ذہنیت میں زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ صبا نے آج تک اتنی عمر کی کسی عورت کو بچوں کی طرح کھڑکی میں کھڑے گاتے نہیں سنا تھا لیکن پھوپھی گاتی تھیں۔ تعجب ہے کہ اس عمر میں بھی ان کی آواز اتنی ہی شیریں اور جوان تھی، ان کی ہنسی میں وہی جھنکار تھی۔ شاید انھوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کے بچے ہوتے تو وہ انھیں کس طرح رکھتے، آج وہ کتنے بڑے ہوتے اور ان کے لیے کیا کیا سکھ اور دکھ لاتے ۔ وہ ان چیزوں سے بلند نہیں تھیں، یہ چیزیں ان کے ذہن سے بلند تھیں، ان کے ذہن کی پرواز اچھے موسم میں پکوان، منگنی اور بیاہ کے موقعوں پر ڈھولک پر گانوں اور عید بقرعید پر ہاتھوں پر مہندی رچا لینے سے آگے نہ بڑھی تھی۔ انھیں صبا کی مشکلات یا بھائی کی بیماری کا ذرا سا شبہ بھی نہیں تھا۔ صبا سوچتی وہ اپنے دل میں کتنی سکھی اور مطمئن ہوں گی، ذہن اور آگہی کبھی وہ سکون اور اطمینان نہیں دے سکتی جو لاعلمی دیتی ہے۔ یہ فلسفہ، یہ آگہی یہ دنیا اور دُنیا والوں سے مراسم سکون نہیں دیتے، انسان کی دنیا جتنی محدود ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ بچوں کی طرح مطمئن زندگی گزارنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اپنی دُنیا کو بچوں کی طرح محدود کرلیا جائے، پھوپھی آئیں تو اس نے آگے بڑھ کر انھیں سلام کیا۔ انھوں نے سر پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی تو صبا کو دہرا ہو جانا پڑا، اس بات پر وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑیں جیسے کانسی کی تھالیاں پکے فرش پر

Marfat.com

چھن سے گر کر دیر تک بجتی رہی ہوں۔ وہ چہرے سے قطعی مگن اور مسرور نظر آ رہی تھیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں کانچ کی سبز چوڑیاں تھیں سبز چنا ہوا دوپٹہ، کانوں میں سونے کی بالیاں اور پچھلے تہوار کی دُھندلائی ہوئی مہندی ان کے ناخونوں پر ہلال بنی اب تک موجود تھی۔ ان کی باچھوں میں پان کی پیک بھری ہوئی تھی۔ سالہا سال پہلے جب اس نے ہوش سنبھالا تھا تو بھی پھوپھی بالکل ایسی ہی تھیں۔ ان پر سال جاتے کیوں معلوم نہیں ہوتے۔ وہ حیران ہو کر سوچنے لگی۔ پھوپھی نے رسماً اس سے اسد کی اور بوبی کی خیریت پوچھی اور کھانا رکھوانے کو کہنے چلی گئیں۔ کھانے پر اس کے بابا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور وہ قطعی طور پر خوش اور مطمئن ہونے کی ایکٹنگ کرتی رہی...

رات کو لیٹی تو وہ بہت سی باتیں سوچ رہی تھی۔ بابا کی زندگی کے چار ماہ، چار ماہ جیسے اس کے ذہن پر ہتھوڑا بن کر برس رہے تھے، وہ دروازہ بند کرنے کے بعد تکیے میں منہ چھپا کر دل کھول کر روتی رہی جب ذرا دل ہلکا ہوا تو پھر طرح طرح کے خیالات نے ہلہ بول دیا۔ اس وقت اسے بابا کا کہا ہوا شام کا جملہ یاد آیا" اس سے بہتر ہوتا کہ تم اس کے کھیلنے کے لیے کسی بھائی یا بہن کا انتظام کر دیتے۔ تنہائی میں بھی وہ شرم سے سرخ ہوگئی، کیا وہ بابا کو بتا دے، مگر کیسے؟... ابھی جلدی بھی کیا ہے۔ آہستہ آہستہ انھیں پتہ چل جائے گا مگر شاید نہیں... صرف چار ماہ ہی تو ہیں۔ چار ماہ، چار ماہ۔ جیسے یہ الفاظ اس کے دل کی دھڑکن بن گئے تھے، وہ شرم و حیا، رنج و غم کی تیز باڑھ میں ڈوب گئی، میں ابا کو ضرور کسی نہ کسی ذریعے سے اس کی اطلاع بھجوا دوں گی، پھوپھی ٹھیک رہیں گی...نہیں، بوڑھی ماما تو مجھ سے ملنے آئے گی ہی۔ اس کو ایسی باتیں کہنے کا خوب سلیقہ ہے۔ یوں باتوں باتوں میں کہ کسی کو پتا ہی نہ چلے کہ وہ خاص طور سے یہ بات جتا رہی ہے، میں اس کے ذریعے یہ خوش خبری بابا تک پہنچا دوں گی... وہ سوچتی رہی اور پھر اسے وہ رات یاد آئی جب ایک دفعہ پہلی اور آخری دفعہ اس نے اسد اور اس کے اصول پر فتح پائی تھی...

اس رات بجلی اور بارش کی عمل داری تھی۔ زور شور کی ہوا درختوں کو یوں جھنجھوڑ رہی تھی جیسے ابھی جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دے گی۔ بالکنی میں پڑی ہوئی چقیں پہلے ہوا سے پتنگ کی طرح اڑنے لگتیں۔ پھر دھڑ دھڑ آ کر بالکنی کی منڈیر سے ٹکراتیں۔ چھت پر اور شیشوں پر بوندیں اولوں کی طرح ٹکرا رہی تھیں، سڑک کی روشنیوں کے کھمبے بھیگے ہوئے

Marfat.com

مسافروں کی طرح سکڑے ہوئے کھڑے تھے، سڑک کسی ناکردہ گناہ مجرم کی طرح کوڑے کھا کھا کر جیسے تڑپ رہی تھی۔ اس کے آگے دھند تھی اور بارش کا زبردست ریلا تھا۔ دور دور تک کسی جان دار کا نشان تک نہ تھا۔ فطرت کے اس زور وشور کے باوجود ایک سناٹا تھا وہ سناٹا جو آدمیوں کی چہل پہل اور ان کی صداؤں سے مرتا ہے۔ وہ بہت دیر بالکنی میں کھڑی اس تماشے کو دیکھتی رہی، ہوٹل کی رنگین روشنیاں بجھائی جا چکی تھیں، پہاڑ بارش میں غائب ہو چکے تھے، باغ کے سارے درخت جھوم جھوم کر، بل کھا کھا کر تیز ہوا کے جھکڑوں کو شکست دینے پر تلے ہوئے تھے، وہ سوچنے لگی۔ حوض کی نارنجی مچھلیاں اسی طرح پانی میں تیر رہی ہوں گی، کیا ان پر اس بارش کے کوڑوں کا، اس باغی ہوا کا کوئی اثر نہیں ہوتا؟... جب وہ کھڑے کھڑے تھک گئی تب آکر اپنے بستر پر لیٹ گئی، آج اسے کچھ عجیب سی بے چینی تھی، ایسے موسم میں ہمیشہ اس کی طبیعت بے چین رہتی تھی۔ شاید جو لوگ اپنی زندگی کو محدود نہیں کر پاتے، جو اپنی راہیں مقرر نہیں کر پاتے ان کو ایسی بے چینیاں بھی لاحق رہتی ہیں جن کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔

شیشوں اور بند دروازوں کے پیچھے فطرت کا شور بہت حد تک ڈوب گیا تھا مگر بالکل مرا نہیں تھا۔ وہ ہلکے سبز رنگ کی روشنی میں اپنے دُودھ ایسے اُجلے بستر پر لیٹی جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ آج اسے بہت سے بھولے بسرے چہرے یاد آرہے تھے جیسے بارش کی دُھند میں دُور کہیں کھڑے ہاتھ ہلا رہے ہوں۔ اسے شاہدہ باجی یاد آرہی تھیں جو اتنی اچھی تھیں اور نہ جانے کیوں مر گئی تھیں پھر اپنی امی، بہن اور بھائیوں کے چہرے تھے جو اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی اس کے ذہن میں جوں کے توں موجود تھے۔ اسے وہ رشتے دار اور دوست یاد آرہے تھے جو سرحد کے اُس پار رہ گئے تھے اور جو آئے تھے وہ کچھ اپنی مصیبتوں میں گرفتار تھے، کچھ شہروں کی دُوری تھی، کچھ حیثیتوں کی خلیج ہوگئی تھی جو کم آمیزی سے اور گہری ہوتی چلی گئی تھی... اس سب کو یاد کرتے کرتے جانے وہ کب سو گئی لیکن شاید اس کے حواس جاگ رہے تھے، اس کا ذہن جاگ رہا تھا۔ ہوا کا شور اور بارش کی رِم جھم اب بھی اس کے حواس پر برس رہی تھی، بجلی کی چمک اس کی ذہنی آنکھوں پر کوند رہی تھی۔ سوتے میں وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی، یکا یک اس نے سنا۔ بارش اور ہوا کے طوفان میں ایک باریک سریلی آواز جھنکاری۔ ''امی!'' اُس نے حیرت سے

Marfat.com

چاروں طرف دیکھا، اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ آواز دوبارہ آئی۔ مور پنکھیا میں لٹکی ہوئی مینا کی طرح باریک اور پیاری۔ ''امی میں یہاں ہوں۔'' اب کے اس نے دوبارہ چاروں طرف غور سے دیکھا اور دیکھا کہ کھڑکی کے شیشے کے باہر ایک منا گورا سا ہاتھ ٹکا ہوا ہے اور کوئی معصوم، بہت ہی پیارا اور معصوم چہرہ بارش کے قطروں سے نہایا ہوا دُھندلے شیشے کے پار دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے، اس کے گھنگریالے سنہری بالوں پر موتیوں کی طرح بارش کے قطرے ٹکے ہوئے ہیں اور اس کی آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک ہے۔ وہ بے اختیار اس کی طرف لپکی، درمیان میں شیشے کی دیوار حائل تھی۔ پھر وہ سریلی آواز آئی۔ ''امی، میں یہاں ہوں۔ آپ مجھے اندر کیوں نہیں آنے دیتیں۔'' اور صبا سرد شیشے سے اپنے گال لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اسد نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

''صبی کیا ہوا۔ سوتے میں رو رہی ہو۔'' اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے۔ کیا یہ خواب تھا، وہ سفید رخسار، وہ گھنگریالے بال اور وہ منا سا ہاتھ محض خواب تھا، وہ مینا ایسی آواز جواب تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی، وہ بھی خواب تھی۔ ''امی۔ آپ مجھے اندر کیوں نہیں آنے دیتیں۔'' دفعتاً وہ اسد کے سینے میں سر چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اور دل ہی دل میں اس نے کہا۔ ''میں تمھیں ضرور اندر آنے دوں گی میری ننھی روح۔ تم یوں طوفان میں بھٹکتی نہ پھرو گی'' اور جس وقت اسد نے اپنے رومال سے اس کی آنکھیں صاف کیں، اس نے ان آنکھوں میں وہ دُنیا دیکھی جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ گہرائی، وہ عمق، وہ نرمی اور گرمی جو نرم سے نرم اور گرم سے گرم چیز میں نہیں ہو سکتی۔ ان آنکھوں میں سپردگی اور مامتا کا عجیب و غریب امتزاج تھا۔ باہر بارش کے قطرے اور ہوا شیشوں سے ٹکرا رہی تھی، اور اس وقت صبا کا فیصلہ اٹل تھا۔ یہ لمحہ امر تھا... اس وقت اسد کی ہر قسم کی احتیاط کے خلاف وہ جیت گئی تھی اور اسد ہار گیا تھا...

اپنے ذہن میں اس رات کی روئداد دہرانے کے بعد اور یہ سوچ کر کہ بابا اس خوش خبری کو سن کر کتنے مسرور ہوں گے، وہ قدرے ہلکے دل کے ساتھ سو گئی...

○○○

Marfat.com

۷

اب وہ اپنے بابا کے ساتھ بالکل یوں رہ رہی تھی جیسے ۴۸ء میں بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد رہا کرتی تھی، وہ ہر وقت اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتے، اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے، اس کو مجبور کرتے کہ وہ اپنی دوستوں کی دعوت کرے تاکہ گھر میں کچھ چہل پہل نظر آئے۔ پہلے وہ بابا کی کئی باتوں پر احتجاج بھی کیا کرتی تھی مگر اب وہ ہر بات بلاچوں و چرا مان لیتی تھی۔ ان کی بات ماننے کو، ان کے ساتھ رہنے کو کتنا کم وقت اب اس کے پاس تھا۔ وہ چاہتی تھی یہ گھڑیاں برس بن جائیں تاکہ وہ منحوس وقت کبھی نہ آسکے جو اس کے بابا کو اس سے چھینے۔ کتنے سال بابا اور وہ صرف ایک دوسرے کی خوشی کی خاطر اپنے اپنے غموں کو چھپائے مگن رہنے کی کوشش کرتے رہے تھے اور اب ایک بار پھر وہی نوبت آ پہنچی تھی، بابا نے اپنے خیال میں یہ بات چھپا رکھی تھی کہ ان کی زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں اور صبا نے اپنی ازدواجی زندگی کے سارے گھاؤ ان سے راز رکھے تھے اور پھوپھی عائشہ ان دونوں ہی کے غموں سے بیگانہ اپنے آپ میں، اچھے موسم میں اور ریڈیو کے گانوں میں مگن تھیں۔

اسد کے خط آتے تھے مختصر اور عجلت میں لکھے ہوئے، ہر خط میں وہ یہی لکھتا۔ یہ خط جلدی میں لکھ رہا ہوں، آئندہ مفصل لکھوں گا مگر جیسے تفصیل سے لکھنے کو کچھ رہا ہی نہ ہو، بابا جب کبھی اپنے کام سے یا دوستوں کے پاس یا کلب گئے ہوتے تو وہ بیٹھ کر افسانے لکھا کرتی اپنے احساسات و مشاہدات کو تحریر میں ڈھالنے کا جو گر اُسے عامر نے بتایا تھا، وہ آج کل اس کے لیے بہت سکون بخش تھا۔ وقت کاٹنے اور کچھ دیر کے لیے

Marfat.com

اپنے گرد و پیش کو بھول جانے کا یہ نسخہ آسان نہیں مگر فائدہ مند ضرور تھا۔ عامر کا ایک خط اس کے پاس آیا تھا جس میں صرف ایک قاری کی حیثیت سے اُس نے ایک افسانے کی تعریف کی تھی پھر بھی اس کے دل کی گہرائی اور خلوص اِس غیر جذباتی تحریر میں بھی صاف جھلک رہا تھا۔ آخیر میں اس نے صبا کی تحریر سے وہ اُمیدیں وابستہ کی تھیں جو خود صبا کو بھی نہیں تھیں۔ خط ختم کرنے کے بعد اطراف میں اس نے ایک ایسا جملہ لکھا جو صبا کے لیے لمحۂ فکریہ بن گیا تھا۔ اُس نے لکھا تھا۔ آج کل میں اس حقیقت کو پانے کی کوشش میں مصروف ہوں کہ روبینہ اتنی بری لڑکی بھی نہیں ہے۔

انھیں دنوں اسے عذرا کا ایک خط ملا جو پشاور سے آیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ تم یہ خط دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔ ہم نے اچانک ہی لاہور چھوڑ دیا ہے اور پشاور آ گئے ہیں، ایک وقت میں نے تم سے کہا تھا کہ بعض باتیں خط میں لکھنے کی نہیں ہوتیں اور میں کبھی تمھیں خط میں یہ باتیں نہیں لکھوں گی مگر صبی آج میں تمھیں یہ باتیں خط میں ضرور لکھوں گی کیوں کہ اب میں اپنی مرضی سے خط لکھنے کے لیے آزاد ہوں۔ اب میں اپنے گھر میں ہوں جہاں میرے اوپر کوئی جذباتی دباؤ نہیں ہے۔ اب یہاں میں کسی کی مقروض نہیں ہوں۔ پورا قصہ سنو گی؟ لو سنو۔ مختصراً لکھوں گی... یہاں آنے سے چند دن پیش تر شاہد میں ایک عجیب انقلاب پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ آفس سے دن میں دو دو تین تین چکر لگانے چھوڑ دیے اور پھر آفس سے آنے کے بعد بھی کوئی کتاب لے کر زیادہ تر اپنے کمرے میں پڑے رہتے، میں ہمیشہ کی طرح گھر کے کاموں اور بچوں میں مصروف رہتی اور یہی سمجھتی کہ طبیعت کسل مند ہے یا کوئی نایاب کتاب ہاتھ لگ گئی ہے، اب دولھا بھائی یا آپا بازار جانے کے لیے کہلواتے تو کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔ پھر ایک دن عجیب تماشا ہوا۔ سہ پہر کو منے بھائی نے ان کو برج کھیلنے کے لیے بلوایا۔ آپ نے مجھ سے کہا۔ کہہ دو سو رہے ہیں، میں نے کہہ دیا۔ ذرا دیر میں آپا بڑے اعتماد کے ساتھ کھٹ کھٹ کرتی آئیں۔ اُنھوں نے سر تک چادر تان لی۔ میں بے پروا سی بنی بے بی کی فراک سیتی رہی۔ آپا نے آتے ہی صفائی سے شاہد کے منہ پر سے چادر ہٹائی۔ دیکھا تو وہ جاگ رہے تھے۔ بولیں، ''کیا نخرے ہیں شاہد! آؤ نا برج کھیلیں۔''

میرا خیال تھا (اور تجربہ بھی) کہ شاہد اُٹھ کر چپل پہنیں گے اور چپ چاپ آپا

Marfat.com

کے ساتھ چلے جائیں گے مگر ہوا یہ کہ انھوں نے روٹھے انداز میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا، ''مجھے نیند آرہی ہے۔'' آپا کچھ کھسیانی سی ہوگئیں، وہ ایسی شکستوں کی عادی نہیں ہیں۔ میرے سامنے کچھ زیادہ ہی روہانسی ہو کر بولیں، ''بھئی خوشامد تو ہم سے ہوتی نہیں۔''

''آپ بار بار نہ کہیں تو ممنون ہوں گا۔'' کہہ کر شاہد نے کروٹ بدل لی۔ میں نے سوچا، آپس میں کچھ ناراضگی ہوگئی ہے، میں وہاں سے ٹل گئی کہ جو شکوے شکایات ہوں آپس میں ہو جائیں، دونوں طرف سے دل کی بھڑاس نکل جائے تو اچھا ہے مگر ساتھ ہی صیبی میں ان دونوں کی گفتگو سننے سے باز نہ رہ سکی اور پچھلے برآمدے کی کھڑکی میں چپ چاپ جا کھڑی ہوئی۔ میں نے سنا شاید کہہ رہے تھے۔ ''میں ناراض نہیں ہوں مگر اب میں نے حقیقت کو پالیا ہے... سایوں کے پیچھے دوڑنا زندگی نہیں ہے۔''

آپا نے آہستہ سے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر میں نے سنا ضدی جھنجلائے ہوئے بچے کی طرح بولے، ''تمھارے اپنے میاں ہیں، بچے ہیں، گھر ہے... مجھے اپنے چنگل سے آزاد کردو۔ میں اب کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہوں۔ میں ان لوگوں کو حق دینا چاہتا ہوں جن کا واقعی میرے اوپر حق ہے۔''

آپا نے پھر کچھ کہا۔ تب بڑے سکون سے شاہد بولے... ''ہاں ٹھیک ہے، تم نے مجھے باندھ کر نہیں رکھا۔ یہ میرا اپنا تصور اور تخیل تھا مگر اب میں اس تصور کے بندھن سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔''

''اس بندھن سے آزاد ہو کر بھی تم ہمارے ساتھ برج کھیل سکتے ہو۔'' آپا کے چہرے پر اس وقت عجیب قسم کی کش مکش تھی جیسے اپنا بچہ اپنی خوشی سے کسی بڑے عہدے پر دور دیس جا رہا ہو۔ ماں اپنا دکھ بھی اسے نہ بتا سکے اور اس کی دوری کے خیال سے اس کی خوشی میں شریک بھی نہ ہو سکے۔

''میں برج کھیل سکتا ہوں اور کھیلوں گا مگر اپنی مرضی سے، کسی کے کہنے سننے سے نہیں... اس وقت میرا دل نہیں چاہ رہا...''

وہ پھر لیٹ گئے... آپا کی طرف سے انھوں نے کروٹ بدل لی۔ آپا چند لمحے سن کر کھڑی رہیں۔ پھر وہ عجیب بے چارگی سے مسکرائیں اور تیزی سے کمرے سے باہر

Marfat.com

نکل گئیں... اس کے بعد آپا نے کبھی انھیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کیا۔ اور میں نے شاہد کو پھر کبھی آپا کے ساتھ تنہا نہیں دیکھا۔ اور پھر ایک اس سے بھی عجیب بات ہوئی، شاہد سائے کی طرح میرے پیچھے پیچھے پھرنے لگے، میں باورچی خانے میں جاتی تو تاڑ کی طرح میرے کندھے سے ہانڈی میں جھانک رہے ہوتے، میں کپڑے سیتی تو اسٹول کھینچ کر میرے پاس آ بیٹھتے اور جلدی جلدی کہہ کے میرے ہاتھ پاؤں پھلا دیتے... شام کو مجھ سے پکچر کے لیے کہتے اور جب میں منے بھائی اور آپا سے پوچھنے کو کہتی تو ایک دم منھ پھول جاتا۔ ''تم میرے ساتھ اکیلی نہیں جاسکتیں، کھا جاؤں گا تمھیں؟'' وہ کہتے۔

مجھے اس بات پر بڑی ہنسی آتی۔ سوچو صبی، کوئی میاں اپنی بیوی سے (جنھوں نے اَن گنت راتیں ساتھ گزاری ہوں اور جن کے دو بچے ہوں) ایسی بات کہے تو ہنسی آئے گی ہی۔

اور پھر ایک رات اس سے بھی عجیب بات یہ ہوئی کہ میرے پہلو میں سوئی ہوئی بے بی کو اٹھا کر وہ بولے، ''میں اسے آپا کو دے آتا ہوں، آخر بچی تو انھیں کی ہے، اب انھیں اپنے ساتھ سلانے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ ہم تو یہاں صرف چند دن کے لیے ہیں۔''

''چند دن کے لیے ہیں۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں... میں نے اپنا تبادلہ پشاور کروالیا ہے۔'' انھوں نے سکون سے کہا۔ مارے حیرت کے میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اتنے بہت سے سوال پوچھنے کو تھے مگر میری زبان گنگ ہوگئی اور وہ بے بی کو بازوؤں میں اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئے...

دوسرے دن انھوں نے منے بھائی اور آپا کو بتا دیا کہ میرا تبادلہ ہوگیا ہے، مجبوری ہے۔ جس وقت سامان باندھنے کا وقت آیا، شاہد نے سوائے کپڑوں کے سارا سامان جوں کا توں چھوڑ دینے کی رائے دی۔ مانا کہ آپا میری بہن ہیں لیکن یہ گھر میں نے اپنے پیسوں سے بنایا تھا اور عورتیں ایسی چیزیں آسانی سے نہیں چھوڑتیں، مجھے مکدر دیکھ کر صبی وہ ایک دم میرے گلے سے لپٹ گئے اور کان میں بولے، ''اجی، میں ایک نیا گھر چاہتا ہوں، سب سے الگ جہاں صرف تم، میں اور ہمارے بچے ہوں۔ ان چیزوں کو چھوڑ دو، ان پر دوسروں کی چھاپ لگی ہوئی ہے، ہم نئی چیزیں بنائیں گے اور یہ

Marfat.com

تمھاری اور میری پسند کی چیزیں ہوں گی... اجی، میں ان سب سے اکتا گیا ہوں۔'' اور پھر یقین کرو صبی وہ میری گود میں گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

چند دن بعد ہم تمام چیزیں چھوڑ کر صرف اپنے کپڑے اور بچے لے کر پشاور چلے آئے۔ یہاں چند روز اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرے پھر ہمیں مکان مل گیا۔ رفتہ رفتہ ہم نے سارا سامان بنالیا۔ اب ہم اپنے نئے گھر میں ہیں۔ صبی دنیا ہی بدل گئی ہے، لکھتے ہوئے شرم آتی ہے، وہ اب اس طرح چاؤ چونچلے کرتے ہیں جیسے ہم نئے بیاہتا ہوں۔ اور گھر کی چیزوں کو دیکھ کر بار بار کہتے ہیں۔ ''تمھارا ٹیسٹ آپا سے کہیں بلند ہے۔ اجی تمھارا ذوق بلند ہے اور تم خود بھی بلند ہو۔'' یہ سب کیسے ہوا مجھے نہیں معلوم، نہ میں کبھی پوچھوں گی۔ ہاں کبھی کبھی خود ہی قیاسات کے گھوڑے دوڑاتی ہوں۔ شاید منے بھائی نے ان سے کچھ کہا ہو یا کسی کم زور لمحے میں انھوں نے اپنی دیوی کو زمین پر اترتے دیکھ لیا ہو... وہ اب اپنے بچوں سے بھی ایسے لاڈ کرتے ہیں صبی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، ایک وہ بھی زمانہ تھا جب آپا کا ٹفی ان کی ٹانگوں میں لپٹا رہتا تھا اور بے بی گود میں سوار رہتی تھی اور ہمارے بچے دور کھڑے حسرت سے دیکھا کرتے تھے مگر میں نے کہا تھا نا کہ ہر چیز کی قدرتی موت پر یقین رکھتی ہوں۔ وقت کے ساتھ وہ جذبے مر گئے، وقت نے کھوٹے کھرے کا احساس دلا دیا اور وہ اس جگہ لوٹ آئے جہاں انھیں ہونا چاہیے تھا۔ اب کل آپا کا خط آیا تو انھوں نے ایک نظر دیکھ کر لاپروائی سے یوں میز پر ڈال دیا جیسے وہ بجلی یا پانی کا بل ہو... صبی ڈیئر! اب میں جلدی ہی تمھارے قلم سے یہ خوش خبری سننے کو تڑپ رہی ہوں کہ تمھارے آپس کے چھوٹے موٹے اختلاف بھی اسی طرح ختم ہو گئے ہیں اور تم اسد اور بوبی اسی طرح پیار اور خوشی سے رہ رہے ہو جیسے شاہد، میں، روبی اور جوجو...''

تب صبا نے اس کو لکھا کہ اجی چاہے تم اسے وقت کا کرشمہ کہو یا یہ کہ اب تمھارا قرض اتر چکا ہے، میں اسے تمھاری شخصیت کا جادو کہوں گی، جس صبر و سکون سے تم یہ سب دیکھتی رہیں، وہ پتھر دل کو پانی کر دیتا۔ اگر تم شور مچاتیں، روتی پیٹتیں، طعنے دیتیں تو اس کا نتیجہ الٹا ہوتا مگر تم دوسروں کو سب کچھ دے کر خود الگ ہو گئیں اور اسی طرح ہنستی کھلکھلاتی رہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، اسی طرح تمھاری خاموشی اور قربانی نے

Marfat.com

یہ ثابت کردیا کہ تم دوسروں سے کتنی بلند ہو، اس کو پرانے زمانے کے لوگ صبر کا پھل کہیں گے مگر میں اسے تمھاری شخصیت کا جادو کہوں گی۔ میں تمھیں رسمی مبارک باد دوں، اس سے کیا فائدہ۔ بس یہ سمجھو کہ میں تمھاری خوشی سے اتنی ہی خوش ہوں جتنی تم خود۔

اجی، میں خواہ کتنا ہی تمھارے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کروں، میں یہ سب اتنی فراخ دلی اور خوش طبعی سے نہیں کرسکتی۔ اجی پیاری، مجھے بتاؤ کہ تم پیار نہ پاتے ہوئے بھی کس طرح پیار کرتی رہیں... میرا خیال ہے تم لفظ محبت کا مطلب ضرور بتا سکوگی، مجھے بتاؤ کہ یہ کیا ہے، یوں لگتا ہے جیسے میں اس لفظ کی گہرائی تک کبھی نہ پہنچ پاؤں گی۔ کیا محبت صرف کسی شخص کو پسند کرنے کا نام ہے یا یہ کوئی اندرونی آگ ہے جو باہر کے محفوظ حصار کے باوجود انسان کو جلاتی رہتی ہے، مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے محبت بھی دق میں تھوکے جانے والے خون کے لوتھڑوں کی طرح کٹ کٹ کر انسان کے جسم سے باہر نکل جاتی ہے، اب یہ دوسری بات ہے کہ اس کے پوری طرح نکلنے سے پہلے ہی وہ خود ختم ہوجائے۔

○○○

Marfat.com

۸

صبا کو آئے دو ماہ ہو گئے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ مشرقی پاکستان جانے سے پہلے اسد بھی چھٹی لے کر یہاں آجائے گا۔ صبا کے بابا بے حد کم زور ہو گئے تھے اور چارپائی سے لگ گئے تھے، ان کی صحت ڈاکٹر کے اندازے سے بھی جلد جواب دے رہی تھی۔ وہ اپنے اس فیصلے پر کہ صبا کو رخصت کر کے اسپتال میں جانِ شیریں جانِ آفریں کے سپرد کر دیں گے، کاربند نہ رہ سکے، ایک وقت انسان جو بات سوچتا ہے۔ دوسرے وقت وہ اتنی آسان نہیں رہتی، جوں جوں دن گزر رہے تھے، وہ زیادہ زود رنج اور جذباتی ہوتے جا رہے تھے۔ اب ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آخری وقت میں صبا کو اپنے سامنے سے جدا کر دیں، وہ کہتے بھی تو صبا کسی صورت نہ جاتی مگر وہ خود ہی یہ الفاظ کہنے کی جرأت نہ کر سکے، بس خاموشی سے صبا کی فکر، تیمار داری اور خیال کو دیکھتے رہے اور اسد اور بوبی کا انتظار کرتے رہے۔

سردیاں شروع ہو چکی تھی۔ اسد نے لکھا تھا کہ یہاں کی ہوا میں خنجر کا سا کٹیلا پن آگیا ہے، انھوں نے اپنے کمرے میں کوئلے جلانے شروع کر دیے ہیں۔ سروے کیمپ وہاں سے چلا گیا ہے اور یہ کہ اس کی چھٹی منظور ہوگئی ہے مگر تعجب یہ ہے کہ اس نے اپنے آنے کی بابت کچھ نہیں لکھا۔ صبا بابا کی بیماری کے متعلق پہلے ہی لکھ چکی تھی اور اب بے چینی سے دونوں کی آمد کا انتظار کر رہی تھی، یہی دونوں باتیں اس نے پھر خط میں لکھ بھیجیں، اس خط کا جواب کوئی ایک ہفتے بعد آیا کہ وہ عنقریب روانہ ہوں گے مگر اس کے بعد صبا کے پے درپے کئی خط لکھنے کے باوجود کوئی پندرہ روز تک اسد کا جواب

Marfat.com

نہیں آیا۔ روبینہ نے بھی عرصے سے اسے خط لکھنا چھوڑ دیا تھا، ورنہ اسی کے ذریعے کچھ حالات معلوم ہوتے۔ آخر پریشان ہوکر صبا نے ٹیلی فون پر کال بک کی، خاصا وقت اور سارا دن انتظار کرنے کے بعد اسد ملا۔ اس نے بتایا کہ بوبی کو نمونیہ ہوگیا تھا، اس لیے وہ نہیں چل سکے، اب بوبی بالکل ٹھیک ہے، ذرا کم زوری دور ہوجائے تو وہ جلد ہی روانہ ہوں گے، صبا کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہاں سردی خوب زور پکڑ گئی ہے، برف باری بھی ہوچکی ہے مگر وہ بوبی کی ہر طرح احتیاط کر رہا ہے۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے اسے سارا دن بوبی کے ساتھ کھیلنے اور اسے دوا یا ٹانک پلانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے اور بہت عرصے بعد اس کے کام کرنے سے اسے ایک خاص راحت سی محسوس ہو رہی ہے، اس کے بھی بہت دن بعد اسد نے اپنے چلنے کی اطلاع دی جس دن صبا اور بوبی کے پہنچنے کا انتظار تھا، صبا کو اسد کی طرف سے ایک انشورڈ لفافہ ملا۔ اتنے اہتمام سے بھیجے گئے لفافے کو پاکر وہ کچھ حیران سی رہ گئی۔ کیا ہوسکتا ہے اس میں، اپنے کمرے میں دروازہ بند کرکے اس نے اس لفافے کو کھول کر ایک مضبوط سا کاغذ نکالا۔ جس پر اسد کے ہاتھ کی چند سطریں نہایت صفائی اور خیال سے لکھی ہوئی تھیں۔ نیچے نہایت واضح طور پر اس کے دستخط تھے، صبا نے دھڑکتے دل کے ساتھ پڑھا۔ یہ طلاق نامہ تھا۔

صبا سن رہ گئی۔ اس کے رشتے کا کھنچاؤ اس انتہا کو پہنچے گا، یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ان میں طلاق ہونے والے جوڑوں کی طرح نہ کبھی تو تو میں میں ہوئی تھی، نہ برسوں کی علاحدگی ہوئی تھی مگر اب یہ ہوچکا تھا۔ اسد نے بہ قائم ہوش و حواس اسے طلاق دے دی تھی اور وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اب ان دونوں میں کوئی تعلق نہ رہا تھا، وہ جو اسد کے ہونے والے بچے کی ماں تھی اور وہ جو اس کے ہونے والے بچے کا باپ تھا، ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی ہوچکے تھے۔

ایک دفعہ، دو دفعہ دس دفعہ رسنے کے بعد تو گہرے سے گہرے گھاؤ کا خون خشک ہوجاتا ہوگا... صبا کا دل جب دل بھر کے خون ہوچکا تو جیسے ایک دم مضبوط ہوگیا۔ شاید نرمی اور سختی کا یہ امتزاج شروع سے ہی اس کی شخصیت میں تھا، ورنہ ۴۷ء میں جو کچھ ہوا، اس کے بعد وہ بستر سے زندہ سلامت نہ اٹھتی۔ ممکن ہے اس عظیم المیے نے اس کے دل کو اور بھی نرم اور ساتھ ہی اور بھی سخت کردیا ہو۔ اب اس کی زندگی کے دو ہی

Marfat.com

مقصد تھے۔ مرتے ہوئے باپ کی خدمت اور اپنے جسم میں پرورش پانے والی روح کی دیکھ بھال...

مگر صبا کا یہ خیال کہ اس نے اپنے دل کو پتھر کر لیا ہے اور اب اسد کچھ بھی کرے، اس پر اثر نہیں ہوگا، غلط ثابت ہوا جب تیسرے دن اس نے اخبار میں پہلے صفحے پر یہ خبر پڑھی، ''بچے کی پراسرار موت۔'' اخبار پر سرسری نظر ڈالتے ہی اس کے قدم جم گئے تھے۔ سرخی کے نیچے درج تھا... ''کوئٹہ، آج صبح چمنستان ہوٹل میں سروے کے ایک افسر اسد گیلانی کا متنبہ لڑکا جس کی عمر پانچ سال بتائی جاتی ہے، بستر پر مرا ہوا پایا گیا اور وہ خود بے ہوشی کی حالت میں فرش پر پڑے ہوئے پائے گئے۔ ان کی حالت نارمل نہیں بتائی جاتی۔ ڈاکٹر طبی معائنہ کر رہے ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اندر سے تمام دروازے بند تھے، بیرا پچھلے زینے سے اندر داخل ہونے کے لیے آیا تو صرف جالی کا دروازہ بند تھا اور سامنے چھوٹے کمرے میں جو ان کے بچے کا بیڈ روم تھا، وہ فرش پر پڑے نظر آئے۔ جالی کا دروازہ توڑ کر لوگ اندر داخل ہوئے، مرے ہوئے بچے کے کہیں زخم کا نشان نہیں ہے۔ عام خیال ہے کہ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے، پولیس تفتیش کر رہی ہے۔''

اخبار اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ دھم سے اپنے بستر پر گر پڑی۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ بدن کے اس لرزے کے ساتھ ایک عجیب قسم کی وحشت اور خوف سا طاری تھا، اسے اپنا جسم بے حد ہلکا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی سوکھا پتا ہوا کی ذرا سی لرزش سے لرز رہا ہو، اس کا سر گھوم رہا تھا۔ یہ اسد نے کیا کیا؟ کیا اس نے بوبی کو مار ڈالا، مگر کیوں... بوبی کی ہستی دنیا میں وہ واحد ہستی تھی جسے اسد بے انتہا پیار کرتا تھا، ماں باپ بھائی بہن، بیوی بچوں سب کی محبت اس نے بوبی کو بخش دی تھی۔ اس سے اسد کی محبت بے غرض اور دنیا کی ہر چوں و چراں سے بلند تھی۔ بوبی کی خاطر وہ کئی مرتبہ خود اس سے الجھا تھا۔ اس کے ڈوب جانے کا تصور ہی کر کے وہ نیم پاگل ہو گیا تھا، کیا اسے اسد نے خود مار ڈالا...

یہ ایک سوال تھا جو اس کے ذہن میں بار بار گونج رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔ میں اگر وہاں ہوتی تو شاید یوں نہ ہوتا۔ لیکن اس کے سامنے بھی اسد پر دیوانگی کا کوئی

Marfat.com

ایسا دورہ پڑتا تو وہ کیا کرلیتی۔ یااللہ! اسد کس حد تک اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اور درد کی نئی لہر کی طرح سے اسے خیال آیا کہ اس خبر نے اس پر اتنی وحشت کیوں طاری کردی ہے، اسد اس کا کوئی نہیں ہے، بوبی اس کا کوئی نہیں تھا۔ اس قسم کی خبریں آئے دن اخبار میں آتی رہتی ہیں۔ وہ کبھی ان سے اتنی متاثر نہیں ہوئی، تو کیا وہ غیر نہیں ہیں۔ کیا قانون سے الگ کوئی بندھن ہے جس سے وہ ابھی تک ان کے ساتھ بندھی ہوئی ہے، دل کے اس بندھن کو بھی جس سے وہ غیر مرئی طور پر اسد کے ساتھ بندھی ہوئی تھی، اس نے کوشش کرکے توڑ دیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ آزاد ہے۔ اسد کچھ بھی کرے، اب اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن یہ کیا ہوا کہ وہ محسوس کررہی تھی، اس کاغذ کے پرزے سے جو بظاہر ان کے رشتے کی اساس تھا، ذرہ بھر بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس نے اسد کو چاہا تو بوبی کو چاہا تھا۔ حالات کچھ سے کچھ ہوگئے تھے مگر وہ اب بھی ان سے دور نہیں تھی، اس کے تصور میں بوبی کا پیارا پیارا گول مٹول چہرہ ابھر رہا تھا جو اب ہمیشہ کے لیے سو گیا تھا۔ وہ لمبی لمبی پلکیں جنھوں نے ہمیشہ کے لیے ان سیاہ آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔

یہ کیا ہوگیا خدایا! یہ کیا ہوگیا۔ دونوں ہاتھ کی اُنگلیاں ایک دُوسرے میں پھنسا کر وہ چیخ پڑی، مگر اگلے ہی لمحے اسے اپنی چیخ روکنی پڑی... وہ رونے کے لیے بھی آزاد نہیں تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر اس کے بابا زندگی اور موت کی آخری کش مکش میں گرفتار تھے، انھیں ابھی تک یہی معلوم تھا کہ اُسد اور صبا محبت کرنے والے میاں بیوی ہیں جو ان کے گزر جانے کے بعد ہمیشہ رفاقت کے پرمسرت لمحات گزاریں گے۔ صبا اب بھی انھیں اسد کے فرضی خطوں کے اقتباس سنایا کرتی تھی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ ایسے چھوٹے جھوٹ کسی کی لافانی مسرتوں کو کچل دینے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ بابا سے اصل حالات چھپانے کے لیے اس نے کیا کچھ نہ سہا تھا۔ وہ آخر دم تک بابا کو اس بات کی اطلاع نہ ہونے دے گی اس نے فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ یہ سارے کاری زخم یہ گہری چوٹیں اکیلی ہی سہے گی کیوں کہ یہی اس کی قسمت ہے۔ اُس نے اپنی چیخیں سمیٹ لیں اور تکیے میں منھ چھپا کر خاموشی سے رویا کی یہاں تک کہ صبح سے شام ہوگئی۔ بابا اور پھوپھی یہی سمجھتی رہیں کہ کئی راتوں کی جاگی اور تیمارداری سے تھکی تھکائی وہ سو رہی ہے حالاں کہ نیند اس کی آنکھوں سے اتنی ہی دُور تھی جتنا اسد اور بوبی کا خیال اس کے

Marfat.com

نزدیک تھا۔

دوسرے دن صبح جب وہ اُٹھی تو حیران تھی کہ اُس نے یہ سارے غم کس طرح برداشت کر لیے۔ کیا واقعی یہ سب وارداتیں اس کے ساتھ پیش آچکی تھیں اور وہ اب تک زندہ تھی کیا انسان اس حد تک برداشت کر سکتا ہے۔ کیا اس نرم و نازک جسم کے اندر فولادی قوتیں چھپی ہوئی ہیں اور اسے یاد آیا کہ اس سے پہلے بھی وہ اپنے بہن بھائیوں اور ماں کو بیک وقت کھو دینے کا صبر آزما دکھ سہہ چکی ہے، دوسرے دن سے وہ پھر روزمرہ کے کاموں میں لگی ہوئی تھی لیکن اگر اس کی پھوپھی میں ذرا بھی سمجھ ہوتی یا بابا اتنے بیمار نہ ہوتے تو وہ فوراً پہچان لیتے کہ وہ ایک دن میں کس حد تک زرد ہوگئی تھی۔ چلتے چلتے اسے کسی چیز کا سہارا لینا پڑتا تھا جیسے وہ ابھی چکرا کر گر پڑے گی اور کوئی چیز اُٹھاتے وقت اس کے ہاتھ اس طرح کانپتے تھے جیسے وہ مدتوں کی مریضہ ہو۔ ان سب دُکھوں میں ایک اور غم منہ پھاڑے اس کا منتظر تھا، یہ وہ فرشتۂ اجل تھا جو اس کے بابا کے لیے جھولی پھیلائے بیٹھا تھا۔

○○○

Marfat.com

۹

اسد اور صبا پر میرا یا امجد کا افسانہ کبھی پورا نہ ہوا۔ کیوں کہ ان کی زندگی کے حقائق نے یکایک ایسا موڑ اختیار کرلیا جو ہمارے افسانے سے کہیں زیادہ ڈرامیٹک اور ہمارے تصور و تخیل سے کہیں زیادہ المیہ تھا۔ ہماری مشرقِ بعید کی سیاحت کے دوران اس المیے کے بعض ٹکڑے اپنے وطن کے اخباروں اور عزیزوں کے خطوط سے ہمیں معلوم ہوتے رہے تھے، مگر پورا قصہ وہاں سے لوٹ کر عامر کی زبانی معلوم ہوا۔ عامر نے اپنی پریکٹس کراچی میں شروع کردی ہے، یہیں اس نے چھوٹا سا ایک خوب صورت مکان لے لیا ہے جہاں وہ تنہا رہ رہا ہے، اس قصے کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ عامر نے پہلے جس شادی شدہ لڑکی کا ذکر کیا تھا وہ صبا کے سوا کوئی اور نہیں تھی۔ صبا کو بچانے کی خاطر اس نے روبینہ سے منگنی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر عین منگنی کے دن اسد نے بوبی کو مار ڈالا اور بہت سی باتیں منظر عام پر آگئیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ اسد صبا کو طلاق دے چکا ہے اور دوسری یہ کہ اس ساری ٹریجڈی کے پسِ پشت روبینہ ہی تھی، ایسی صورت میں کوئی بھی بھلامانس عامر کی اس منگنی کے توڑ دینے پر اعتراض نہیں کرسکتا تھا...

''صبا آج کل کہاں ہے؟'' میں نے عامر سے پوچھا... اس کے چہرے پر شفق سی پھول گئی۔

''صبا... یہیں ہے۔ آج کل اس پر میڈیسن کرنے کی دھن سوار ہے۔''

''تم ملتے رہتے ہو اس سے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں... ایمی تو مجھ سے اتنی مانوس ہوگئی ہے کہ حد نہیں۔''

''ایمی کون ہے؟''

Marfat.com

''صبا کی بچی... بے حد پیاری ہے شمسہ باجی۔ آپ نے ساری دُنیا کی سیر کی ہے مگر اتنے خوب صورت بچے کم دیکھے ہوں گے۔''

اس کے لہجے میں ایسا جوش تھا جیسے کوئی فن کار اپنی کسی تخلیق کی تعریف کر رہا ہو۔ جب میں نے اس سے یہ بات کہی تو وہ شرم سے سُرخ ہوگیا۔ بناوٹی خفگی سے بولا۔

''باجی آپ بڑی خراب ہیں...'' پھر ذرا سنبھل کر کہا۔

''ہم تو صرف نقاد ہیں، دوسروں کی تخلیقات کی تعریف یا تنقیص کیا کرتے ہیں... تخلیق ہماری قسمت میں کہاں...''

''صبا یہاں اکیلی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے والد کا تو انتقال ہوگیا... اپنی پھوپھی کے ساتھ رہتی ہے...''

''ہمیں کب ملوا رہے ہو اُس سے؟''

''جب آپ چاہیں مگر آپ کو ایک کام کرنا ہوگا۔''

''کیا؟''

''میری سفارش...''

''کس سلسلے میں؟'' میں صاف بن گئی۔

''آپ خوب جانتی ہیں شمسہ باجی... ایک مرتبہ میں نے بڑے جوش سے کہا تھا کہ میں صبا کو اسد سے چھٹکارا دلوا کر اس سے شادی کروں گا مگر اب حالات خود ہی ایسے ہوگئے ہیں۔ اب آپ کو یا کسی اور کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

''تم اب تک اس معاملے میں سنجیدہ ہو عامی؟'' میں نے پوچھا۔

''قطعی...'' اس نے دھیرے سے کہا مگر اس کے لہجے میں پہاڑ ایسی پختگی تھی...

''تب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں ضرور تمھاری سفارش کروں گی'' میں نے کہا۔

''شکریہ...'' وہ بولا۔

''ہمارے ملک میں یہی کام ہیں جو بغیر سفارش کے ہوا کرتے ہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا، ''کیا تم نے خود کبھی عرضِ مدعا کیا ہے۔''

''کیا تھا؟''

''پھر؟''

Marfat.com

''آپ کو معلوم ہے خیر سے وہ اب افسانہ نگار ہوگئیں ہیں۔'' عامر نے منہ بنا کر کہا...

''ہاں مجھے معلوم ہے... مگر افسانہ نگار ان چیزوں سے بلند نہیں ہو جاتے۔''

یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ ان چیزوں سے بلند ہوئی یا نہیں مگر میرے اس ذکر پر وہ افسانوی زبان میں بولی۔

''عامر، اپنے لیے کوئی تازہ دم ساتھی چنیے... میں تھک چکی ہوں، میرے پاؤں میں چھالے ہیں میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گی، میں نے اپنے لیے جو راہ چنی ہے مجھے اس پر چلنے دیجیے۔''

''اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے... وہ خاموش ہوگئی اور اس وقت سے آج تک میں بھی اس بارے میں خاموش ہوں۔''

''کیا تم نے اس کے ہاں جانا چھوڑ دیا؟''

''نہیں، جاتا رہتا ہوں...''

''اب اس کی صحت کیسی ہے؟''

پہلے سے بھی کم زور اور زرد ہوگئی ہے مگر معلوم ہوتا ہے جیسے اس دھان پان لڑکی میں کوئی آہنی شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ شمسہ باجی، اس سے بات کر کے انسان کو رونا نہیں آتا بلکہ نئے حوصلے اور نئے ولولے بیدار ہوتے ہیں۔''

''کیا وہ کبھی پچھلی باتوں کا ذکر نہیں کرتی؟''

''کبھی نہیں، وہ حال اور مستقبل میں رہتی ہے۔ کہتی ہے میں میڈیکل کر کے ان لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں جن کے لیے اب تک کچھ نہیں ہوتا۔ اپنے مستقبل کے بعد وہ ایمی کے مستقبل میں دلچسپی لیتی ہے، اکثر کہتی ہے میں ایمی کو خود سے بھی زیادہ مضبوط بناؤں گی، کم زور انسان دُنیا میں کچھ نہیں کر سکتے۔''

''مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی عامی، یہ سب ہوا کیسے میں نے اسد اور صبا کو گاڑی میں دیکھا ہے۔ اسد اس سے بہت محبت کرتا تھا۔''

عامر چپ چاپ اُٹھ کر گیا اور اندر سے کاغذوں کا ایک پلندہ لا کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں پڑھتی رہی... وہ اُٹھ کر چلا گیا۔

OOO

Marfat.com

۱۰

میں اسد گیلانی ظہور گیلانی کا بیٹا ہوں۔ ہم تین بھائی دو بہنیں ہیں۔ میں بچپن سے ہی اپنے بہن بھائیوں سے زیادہ خوب صورت تھا۔ مجھے شروع سے ہی اس کا احساس تھا، یا دلایا گیا تھا، میں سب سے چھوٹا تھا اس لیے لاڈلا بھی تھا۔ ہمارے والد زیادہ امیر نہیں تھے لیکن ملازمت میں اتنا مل جاتا تھا کہ سفید پوشی سے گزارا ہو سکے، میرے سب سے چھوٹے اور لاڈلے ہونے کے سبب سفید پوشی کے ساتھ تھوڑی سی رنگین مزاجی کی بھی گنجائش تھی۔ پھر جب بڑے بھائیوں کو ملازمت مل گئی اور بہنوں کی شادی ہوگئی تو میرے لیے سب کی مشترکہ کوششوں سے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کی گنجائش نکل آئی۔ کالج میں ہمیشہ امیر ترین لڑکوں کے ساتھ رہا اور خود کو بہت متمول ظاہر کرتا رہا۔ لباس اور بات چیت میں ہمیشہ میں نے اعلیٰ طبقے کو نظر میں رکھا۔ خیالات بھی انھیں کے اپناتا رہا۔ یہاں تک کہ بعد میں خود کو قطعی انھیں میں سے سمجھنے لگا۔ ان لوگوں کے خیالات مجھے اپنے خیالات نظر آنے لگے اور اپنے گھر کی بہت سی باتیں مجھے جہالت معلوم ہونے لگیں، رفتہ رفتہ میں گھر سے کٹنے لگا۔ چھٹیوں میں گھر جانے کے بجائے میں امیر لڑکوں کے ساتھ سیر و سیاحت کو نکل جاتا، صرف اپنے ملک کی سیر و سیاحت کو لیکن دُنیا بھر کے اچھے ہوٹلوں کے کرائے مجھے یاد تھے۔ ہوائی سروسوں کے نام اور کرائے ازبر تھے یہاں تک کہ لوگوں کی شکل وصورت، لباس، نشست و برخاست اور کھانے کا ڈھنگ دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ یہ کس ملک کے باشندے ہیں (یہ باتیں میں کسی اور طریقے سے معلوم کرتا تھا) لیکن میرے دعوے اکثر صحیح نکلتے تھے اور لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ کالج

Marfat.com

کے لڑکوں میں سے بھی اکثر کو یقین تھا کہ ساری نہیں تو آدھی دُنیا میرے قدموں کے نیچے سے نکل چکی ہے، حالاں کہ سچ بات یہ تھی کہ میں نے ابھی تک ہوائی سفر نہیں کیا تھا اور سمندر کو صرف دیکھا ہی تھا، برتا نہیں تھا۔

میں اپنی بنائی ہوئی دُنیا میں مگن تھا۔ راز فاش ہونے کا امکان بہت کم تھا کیوں کہ میرے والدین لاہور میں تھے میں کراچی میں تھا اور میرا خرچ ہر طرح اُجلا تھا۔ انجینئرنگ پاس کرنے کے بعد میں سروے کی ٹریننگ کے لیے امریکا چلا گیا اور واپسی میں بوبی کو اپنے ساتھ لایا جو میرا لڑکا تھا لیکن خاندان میں سبکی سے بچنے کے لیے یہ بہانہ گھڑا گیا کہ ایک حادثے میں اس کے ماں باپ فوت ہوگئے اور میں نے اسے گود لے لیا۔ اس بات نے گو بعض لوگوں کے دل میں شکوک پیدا کیے مگر عام طور پر اس نے مجھے فائدہ پہنچایا۔ ایک تو میرے تموّل کے خیال کو اس سے سہارا ملا کہ آج کل کے زمانے میں یوں مزے سے ایک بچے کو ساری عمر کے لیے پال لینا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے جب تک کسی کے پاس روپیہ فالتو نہ ہو، دوسرے یہ داستان میری نیک دلی اور حوصلہ مندی کا وکٹوریہ کراس ثابت ہوئی جس نے مجھے بہت سے حلقوں میں مقبول بنایا اور جیسا کہ بعد میں صبا نے مجھے بتایا وہ اسی وجہ سے مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہوئی۔

بوبی کو میں اپنے ساتھ لے آیا۔ اب میں نوکر ہو چکا تھا اور کسی پر بار نہیں تھا۔ نہ بوبی کا بار کسی پر ڈالنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے والدین یا بہن بھائیوں کے پاس اس لیے بھی نہیں چھوڑا کہ جس ڈھب پر میں اسے پرورش کرنا چاہتا تھا وہ ہمارے گھر میں ممکن نہیں تھی۔ اس طرح وہ تمغۂ شجاعت اب ہر وقت میرے سینے پر لگا رہتا تھا۔

بوبی سے مجھے واقعی محبت تھی، اب مجھے اندازہ ہوا تھا کہ باپ کا پیار کیا چیز ہوتا ہے۔ بوبی کے لیے میں جو کچھ کرتا اس میں دکھاوا یا بناوٹ نہیں تھی۔ اس میں پیار اور خلوص تھا کیوں کہ وہ میرے جسم کا حصہ تھا۔ میرے جگر کا ٹکڑا تھا۔ میں اسے بہترین کپڑے پہناتا تھا، اس لیے کہ میں چاہتا تھا میرا بیٹا بہترین کپڑے پہنے، اس کے لیے قیمتی کھلونے لاتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلاتا تھا اور اسے اپنے پاس سلاتا تھا۔ وہ بہت خوب صورت اور بھولا تھا۔ رات کو سوتے ہوئے اس کے سفید چہرے پر جب لمبی

کالی پلکیں سایہ کیے ہوتیں اس کے سرُخ ہونٹ تھوڑے سے کھلے ہوئے اور منے منے ہاتھ گال کے نیچے رکھے ہوتے تو میں کئی کئی منٹ تک اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا اور پھر بے اختیار سینے سے لگا کر پیار کرتا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میں اس کی محبت میں سب کچھ بھولتا جارہا تھا۔ میں نے خود کو اور اپنے ماضی کو اس لیے معاف کردیا تھا کہ اس نے مجھے بوبی جیسا بیٹا دیا تھا۔ ہم دونوں بڑی شان سے رہتے تھے اور ہمارا یہی رہن سہن اور لباس اکثر لوگوں خصوصاً لڑکیوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا تھا، خوش قسمتی سے مجھے ایک ایسا لڑکا بھی مل گیا تھا جو بوبی کی دیکھ بھال اچھی طرح کرتا تھا پھر بھی بوبی کو ہر جگہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا خاصا بڑا مرحلہ تھا اور اس کا ایک ہی علاج گھر والوں کی اور میری سمجھ میں آتا تھا۔ شادی...

اپنی بیوی کی حیثیت سے میرے ذہن میں ایک خیالی لڑکی تھی، آپ چاہیں تو اسے مثالی کہہ لیں، میں چاہتا تھا وہ بہت خوب صورت اور ایڈوانس ہو، اتنی کہ جب وہ میرے ساتھ نکلے تو کوئی نظر اس پر اُٹھے بغیر نہ رہ سکے لیکن ساتھ ہی وہ بوبی سے اتنی ہی محبت کرسکے جتنی میں کرتا ہوں، یہ عجیب سی بات ہے۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ مجھ جیسی محبت کیسے کرسکتی ہے جب کہ وہ میرا اپنا لڑکا ہے اور اس کے لیے وہ میرا لڑکا بھی نہیں ہوگا بلکہ غیر قوم کا ایک گود لیا ہوا بچہ، دیکھنے والے یہ سمجھتے تھے کہ میں ایک غیر لڑکے کو اپنا کر اسے بالکل اپنے بیٹے کی طرح چاہتا ہوں، یہ بات اس طرح میرے ذہن میں بیٹھ گئی کہ مجھے یہ بھی ممکن نظر آنے لگا کہ میری بیوی بھی اسے اپنا بیٹا بنا کر اسی طرح محبت کرسکے گی... لیکن یہ طلسم جلد ہی ٹوٹنے لگا۔ کراچی میں، لاہور میں اور دوسری جگہ کئی ایسی لڑکیاں ملیں جو خوب صورت تھیں، مجھ سے کہیں زیادہ ایڈوانس تھیں لیکن بوبی سے محبت کرنا تو درکنار اس سے بات تک کرنا گوارا نہیں کرتی تھیں، ان میں سے کئی میرے متعلق سنجیدگی سے سوچتی تھیں لیکن بوبی کو وہ اتنی ہی اہمیت دیتی تھیں جیسے میں نے گھر میں کوئی کتا یا بلی رکھ چھوڑی ہو جن کا ذکر بھی شادی ایسے معاملات میں کبھی نہیں ہوتا، یہ بات ہمیشہ میرے دل پر کاری ضرب لگاتی، کراچی میں مجھے ایک ایسی خاتون ملیں جن کی میاں سے ان بن ہوکر طلاق ہوگئی تھی، ان کے دو پیارے پیارے بچے تھے وہ انھیں کے پاس رہتے تھے، وہ خاتون خوب صورت، سلجھی ہوئی اور ملنسار تھیں، مجھے

Marfat.com

حیرت تھی کہ ایسی عورت سے میاں کو کیا شکایت ہوسکتی ہے، رفتہ رفتہ میں خاصا ان کے گھر جانے لگا۔ وہ بھی میری طرف جھکی ہوئی نظر آتی تھیں، گو کھلم کھلا کوئی بات نہیں ہوئی تھی... پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ ان سے شادی کرلوں۔ گو دو بچوں کی ماں سے شادی کرنا بھی خاندان میں اور دوستوں کے حلقے میں خاصا قیامت خیز ثابت ہوتا۔ تاہم ایک تو وہ مجھے پسند تھیں، دوسرے میرا خیال تھا کہ ان کے بچوں کے ساتھ ببلی کی پرورش مناسب ہوگی، قیامت خیزی کو یوں نظر انداز کرسکتا تھا کہ شروع سے من مانی کرتا آیا تھا اور مجھے اس قسم کی حرکتیں پسند تھیں کہ آپ کی طرف اشارے ہوں۔

ایک دن ہمت کر کے میں نے ان سے صاف صاف بات کرنے کا ارادہ کرلیا مگر میری حیرت کی حد نہ رہی جب اُنھوں نے نہایت صفائی سے اعتراف کیا کہ اور تو سب ٹھیک ہے لیکن وہ ببلی کا اپنے بچوں کے ساتھ پرورش پانا کبھی گوارا نہ کریں گی، ہاں اگر میں اسے کسی کو دے دوں یا یتیم خانے میں داخل کردوں تو دوسری بات ہے، وہ دن ہے اور آج کا دن میں نے ان صاحبہ کی شکل کبھی نہیں دیکھی، اگر کبھی سرِ راہے ملاقات کی صورت نظر آئی تو میں ان سے بچ کر یوں نکل گیا جیسے خدانخواستہ انھیں کوڑھ ہے یا میں نے قرض لے رکھا ہے جسے دینے کا ارادہ نہیں رکھتا...

تقریباً دو سال ہوئے چمنستان ہوٹل میں میری ملاقات صبا اور اس کے والد سے ہوئی۔ صبا پہلی لڑکی تھی جسے میں نے خود سے زیادہ ببلی سے متاثر پایا۔ ہوٹل میں آنے جانے والوں کے چہرے، ان کے کمرے اور بچے ذہن میں بٹھاتے خاصا عرصہ لگ جاتا ہے، چناں چہ میں نے دیکھا کہ صبا نے ببلی میں اس وقت سے دلچسپی دکھائی جب اسے یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ ببلی میرے ساتھ ہے اور میں ان کے برابر کے کمرے میں رہتا ہوں۔ میں تسلیم کروں گا کہ صبا مجھے کبھی بہت خوب صورت نہیں لگی، اس میں ایک خاص کشش ضرور تھی مگر شاید وہ خوب صورت نظر آنے کا ہنر جانتی ہی نہ تھی، میں نے اس سے کم شکل لڑکیاں اس سے زیادہ اسمارٹ نظر آتی دیکھی ہیں اس لیے کہ وہ یہ ہنر جانتی ہیں مجھے میک اپ نہ کرنے میں کوئی خاص خوبی نظر نہیں آتی جب آپ کو چند ایسی چیزیں میسر ہیں جن سے آپ خود کو حسین بنا سکیں تو ان کو استعمال نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے موٹر اور ریل گاڑیاں میسر ہوتے ہوئے بیل گاڑی میں سفر کرنا یا محض

دقیانوسیت کے سہارے سوٹ نہ پہننا، ریڈیو، گھڑی اور چشمہ استعمال نہ کرنا اور بجلی ہوتے ہوئے گھر میں تیل کے دیے جلانا۔

خیر... بوبی سے اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو دیکھ کر میں نے اس پر سنجیدگی سے غور کیا، میں نے اس سلسلے میں جذبات سے زیادہ منطق سے کام لیا، اپنے آئیڈیل قسم کی لڑکیوں کو میں پہلے دیکھ چکا تھا، گھر والوں سے کپڑوں کی ایک گٹھڑی کے سوا اور کسی چیز کی امید نہ تھی چناں چہ میں نے اسے پسند کی ترازو میں تولا... سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ امیر باپ کی بیٹی تھی، میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بات میرے لیے خوشی کا باعث بھی تھی اور سب سے مضبوط دلیل بھی۔ وہ دھیمے مزاج کی (Submissive) سی لڑکی نظر آتی تھی یہ دونوں باتیں میرے لیے اہم تھیں اس لیے کہ اسے ایک بالکل غیر بچہ اپنا سمجھ کر پالنا تھا۔ دُوسرے میں خود ذرا اکھڑ قسم کے کیریکٹر کا مالک تھا اور مجھے یہ احساس تھا کہ اپنی جیسی کوئی لڑکی مجھے ملی تو نباہ مشکل ہوگا، چناں چہ اس طرح صبا کے حق میں اس مثالی لڑکی کو میں نے قربان کردیا جو عرصے سے میرے خیالوں میں بسی ہوئی تھی...

اب ایک طرف تو میں اس کے بابا سے مل کر زمین ہموار کرتا رہا، دُوسرے اس لڑکی کے دل کو جیتنے کی گھات میں لگا رہا مجھے یہ کہتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میں دل جیتنے کا ہنر جانتا ہوں، اس پر میں نے باقاعدہ ریاضت کی ہے، مجھے معلوم ہے کہ شاعروں کی پیدا کردہ آنکھوں کی زبان واقعی کچھ معنی خیز ہوتی ہے، جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، انسان کی ایجاد کردہ چیزوں اور قدرت کی دی ہوئی نعمتوں کو میں اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا پسند نہیں بلکہ ضروری سمجھتا ہوں، میں اس کی افتادِ طبع کا خیال کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا اور رفتہ رفتہ میں دراصل اسے پسند کرنے لگا اس لیے اس کے بعد میں نے اسے اپنی طرف ملتفت کرنے کے لیے جو کچھ کیا میں اسے دام بچھانا نہیں کہوں گا۔ اب میں اس سے شادی کرنے کی خواہش میں قطعی سنسیئر (Sincere) تھا۔ غرض کہ صبا کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے ان کے والد سے اظہارِ مدعا کیا، دُنیا دار مردوں کی طرح انھوں نے مجھ سے اس بارے میں خاموش رہنے کو کہا اور خود میرے متعلق تحقیقات کی۔ کچھ دن بعد مجھے ان کا جواب مل گیا جو "ہاں" تھا اور اس طرح میں اور صبا شادی کے بندھن میں بندھ گئے...

شادی کے بعد سب سے پہلی بات جو میرے اندازے کے خلاف ثابت ہوئی اس کی شخصیت کے بارے میں میرا خیال تھا۔ صبا دھیمی طبیعت کی ضرور تھی مگر موم کی ناک نہیں تھی کہ جدھر موڑو مڑ جائے بلکہ عام لڑکیوں کے خلاف وہ خاصی سیلف ولڈ Selfwilled تھی۔ یہ ضرور ہے کہ بعض دفعہ وہ اپنی ناپسندیدگی کا کھلے الفاظ میں اظہار نہیں کرتی تھی مگر اس کی ناپسند کو پسند سے بدل دینا شاید جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ یہ بات تو پھر بھی مجھے کچھ دن بعد معلوم ہوئی حقیقت یہ ہے کہ شادی کے فوراً بعد ہی مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میں نے صبا سے شادی کر کے کچھ ٹھیک نہیں کیا، اب غور کرتا ہوں تو اس کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی۔ شاید اس کا سبب میری ازلی بے اطمینانی ہو، بچپن ہی سے مجھے ہر کام کرنے کے بعد اطمینان کے بجائے یہ اُلجھن سی ہوتی کہ شاید مجھے یوں نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اب غور کرتا ہوں تو یہ خیال آتا ہے کہ شادی کے بعد سب سے پہلا جذباتی دھکا یہ تھا کہ صبا کے والد معاشی لحاظ سے میری طرح اپ اسٹارٹ تھے، وہ پشتوں کے رئیس نہیں تھے اور ایک جمے ہوئے خاندان کے ساتھ خود کو وابستہ کر لینے سے جو سیکورٹی میں نے محسوس کی تھی اس میں ایک حد تک ضرور کمی آئی، اس کے بعد میرے اور صبا کے خیالات اور رجحانات کا اختلاف تھا۔ میں جو سوسائٹی میں تارا بن کر چمکنا چاہتا تھا، شادی کی دُھند میں دُھندلا کر رہ گیا تھا۔ یوں بوبی اور صبا کے تعلقات بہت اچھے تھے مگر اس معاملے میں بھی میرے خواب پورے نہ ہوئے، میں اگر اسے خالص انگریزی تلفظ اور لہجے میں انگریزی سکھاتا یا رات کو کپڑے تبدیل کر کے کھانا کھانے کو کہتا تو صبا ہنستی تھی، اس کے نزدیک یہ چیزیں فضول اور بے معنی تھیں اور اتنے چھوٹے بچے پر ایٹی کیٹ اور مینرز کا بوجھ لادنا سراسر ظلم تھا۔ وہ بوبی کو پرانی قدروں پر پرورش کرنا چاہتی تھی میں اسے دنیاداری، مصلحت آمیزی اور دُنیا میں جلد ترقی کرنے کے ڈھب پر ڈالنا چاہتا تھا۔ جب صبا کہیں جاتی اور میں مکمل طور پر بوبی کو اس کی تحویل میں دینے سے انکار کر دیتا تو وہ بہت زیادہ محسوس کرتی تھی، اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جنھوں نے ہمیں آہستہ آہستہ یوں دُور کر دیا جیسے دو سیارے نزدیک آ کر نامعلوم طور پر دُور ہوتے جائیں۔ اب جو کچھ ہو چکا تھا میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں تھا سوائے اس کے کہ کبھی کبھی زندگی

Marfat.com

سے فرار حاصل کر کے اس کو بھول جاؤں اور یہ میں کرتا رہا۔

اس سب کے بعد بھی میں اپنا توازن نہ کھوتا اگر روبینہ یوں بے اختیار میری طرف نہیں کھنچتی... روبینہ صبا کی دوست تھی سب سے پہلے میں نے اسے اس وقت دیکھا تھا جب ایک مرتبہ اس کے بابا کے ساتھ ان کے گھر گیا تھا، اس دن روبینہ نے اپنا خوب صورت باغ مجھے دکھایا تھا۔ یہ کہنے میں مجھے باک نہیں کہ وہ مجھے صبا سے زیادہ خوب صورت لگی، روبینہ ان لڑکیوں میں سے تھی جنھیں اپنی شکل وصورت کی خوبیوں اور کوتاہیوں کا علم ہوتا ہے اور جو اپنے برے پائینٹس چھپانے اور اچھے پائینٹس اُبھارنے کا ملکہ جانتی ہیں۔ بس شروع میں اس کے متعلق میں نے اتنا ہی سوچا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ میرے دل و دماغ پر چھانے لگی اور یہاں منطق کے بجائے جذبات مجھ پر حاوی ہوگئے۔ روبینہ نے مجھے یقین دلا دیا کہ:

> Where there is marriege without love, There is love without marriage.

وہ بار بار مجھے اس بات کا احساس دلاتی کہ میں نے غلط قسم کی لڑکی سے شادی کر کے اپنے مستقبل کی خوشیوں کو تباہ کرلیا ہے۔ میں جو اپنی کشش کا جادو دوسروں پر ڈالا کرتا تھا۔ اس کی کشش کے دام میں اُلجھ کر رہ گیا۔ اس کی مقناطیسی شخصیت، اس کی ادائیں، اس کی خوب صورت ہنسی مجھ پر چھا گئی، ہم لوگوں سے چھپ چھپ کر ملنے لگے اور روبینہ سے ہر ملاقات کے بعد میں یہ بات زیادہ شدت سے محسوس کرتا کہ صبا اور میں دو متوازی لکیریں ہیں جو کبھی نہیں ملتیں۔

زندگی اسی ڈھرے پر گزر رہی تھی کہ یکایک صبا نے اپنے بابا کے پاس جانے کی خواہش ظاہر کی، میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اسے اسٹیشن چھوڑنے جانے سے پہلے جب وہ زینے کے اُوپری حصے پر کھڑی کھڑکی کی جالی سے باہر دیکھ رہی تھی، میں نے دروازے میں کنجی گھماتے ہوئے اچانک بغیر کسی تیاری کے کہا۔ ''صبا، مجھے افسوس ہے یہ بات میں نے اب تک تم سے چھپائے رکھی... اصل میں بوبی میرا بیٹا ہے۔''

اب پھر سوچتا ہوں کہ میں نے ایکا ایکی اُس سے یہ بات کیوں کہی، شاید میں اس کا زبردست ری ایکشن دیکھنا چاہتا تھا کہ ہمارے ایک دوسرے سے فاصلے کی کوئی

Marfat.com

واضح وجہ سامنے ہو۔ ممکن ہے میرا خیال ہو کہ جو فیصلہ میں خود اب تک نہیں کر پایا، یہ بات سن کر صبا کردے۔ یہ بات کہنے کے بعد میں تیار تھا کہ صبا چلا چلا کر ہسٹرک انداز میں مجھے برا بھلا کہے یا ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے، بلکہ میں اس کے لیے بھی تیار تھا کہ وہ لڑکھڑا کر گرے تو میں اسے سنبھال لوں مگر یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ صرف اس کے چہرے پر پرچھائیں سی آئی۔ وہ جالی سے باہر ہی دیکھتی رہی اور دھیرے سے بولی ''مجھے معلوم ہے۔''

''تمھیں معلوم ہے؟'' حیرت سے میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا'' زینے کا جنگلا تھام کر آہستہ سے میں نے کہا۔

''مجھے اس بات کا یقین اس روز ہو گیا تھا جب... کولالائے ریسٹ ہاؤس میں رات کو میں نے تمھیں اس عورت کے ساتھ دیکھا تھا'' یہ کہنے کے بعد وہ اپنا پرس لیے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُتر گئی اور پیچھے پیچھے میں بھی اُتر گیا۔ سارے راستے ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ اسٹیشن پر وہ زیادہ تر بوبی سے باتیں کرتی رہی اور ٹرین چل دینے کے بعد ہم میں صرف خدا حافظ ہوئی۔

اس کے بعد کی باتیں اتنی اہم نہیں ہیں کہ تفصیل سے لکھی جائیں اس لیے اب میں اس خاص دن پر آتا ہوں جب یہ سانحہ پیش آیا۔ اس سے پہلے میں کئی دن تک شدید ذہنی کش مکش میں گرفتار رہا۔ میری چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ صبا اور اس کے بابا بار بار مجھے پنڈی آنے کا خط لکھ رہے تھے۔ کوئٹہ میں سردیاں اپنے شباب پر تھیں، برف باری ہو رہی تھی، بوبی ایک مرتبہ بیمار ہو چکا تھا میں اسے یہاں کی سردیوں سے بچانا بھی چاہتا تھا مگر یہاں سے چلا جانا بھی ممکن نہ تھا۔ اس وقت چلے جانا کا مطلب بہت کچھ ہاتھ سے کھو دینا... ملک میں ازدواجی قانون کا آرڈی ننس پاس ہو چکا تھا اور پوری تفصیلات طے ہو جانے کے بعد چند مہینے کے اندر اندر نافذ ہونے والا تھا۔ چھٹیوں کے فوراً بعد مجھے مشرقی پاکستان چلے جانا تھا جہاں سے جلدی واپس آنا ممکن نہ تھا۔ میرے لیے فیصلے کا لمحہ آگیا تھا ورنہ پھر وقت نکل جائے گا اور میں ساری عمر پچھتاتا رہوں گا، میں سوچا کرتا۔ صبا یا روبینہ میں سے مجھے ایک کا انتخاب کرنا تھا ابھی اور اسی وقت۔ یہ وقت جو مردوں کی آزادی کا آخری سنہری دور تھا... ذہنی کش مکش اور رد و کد کے ان

Marfat.com

آخری دنوں میں میں کئی روز گھر سے باہر نہیں نکلا اور تعجب یہ ہے کہ روبینہ بھی نہیں آئی، شاید وہ مجھے دل جمی سے سوچنے کا موقع دینا چاہتی ہے، میں نے سوچا۔

آخر میں نے فیصلہ کرلیا، اس وقت جو چیز میری تھی اس سے مجھے وہ چیز زیادہ عزیز معلوم ہوئی جو ذرا سی کوتاہی سے میرے ہاتھ سے نکل سکتی تھی، یہ فیصلہ کرنے اور صبا کو اطلاع بھیج دینے کے بعد مجھے اپنا دل بہت ہلکا محسوس ہوا اور میں روبینہ کے گھر پہنچا، کسی زبردست پارٹی کا اہتمام ہوتا نظر آرہا تھا، ایک طرف ڈھیر ساری کرسیاں اور صوفہ سیٹ پڑے تھے۔ دو تین میزوں پر برتن اور گلاس سجے ہوئے تھے، کئی آدمی باغ میں دل جان سے کام کر رہے تھے، اس گھر میں پارٹی کا ہونا تو کوئی نئی بات نہیں تھی نئی بات یہ تھی کہ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔

''یہ کیا سلسلہ ہے؟'' میں نے سہیلہ سے پوچھا جو برآمدے میں کاغذ پنسل لیے کھڑی کسی چیز کا حساب کتاب کر رہی تھی۔

''ارے آپ اتنے دن سے کہاں تھے، باہر دورے پر گئے ہوئے تھے نا؟ اس نے میرے سوال کو نظر انداز کر کے کہا۔

''نہیں تو... گھر پر ہی تھا'' میں نے کہا۔

''اور آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ کیا سلسلہ ہے کیا روبی نے آپ کو فون نہیں کیا...''

''نہیں...''

''حد ہے، حالاں کہ وہ کہہ رہی تھی کہ میں انھیں خود فون کروں گی۔''

''آخر بات کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کل روبینہ کی منگنی ہے بھئی...'' بیگم احمد نے جو ایک طرف کھڑی قالین جھڑوا رہی تھیں، مجھے مطلع کیا۔ ''روبینہ کا تو ہر ایک کام ایسا ہی جلدی کا ہوتا ہے۔ ہتھیلی پر سرسوں جماتی ہے یہ لڑکی اور میاں عامر اس سے بھی جلد باز نکلے، اب بھلا دیکھو تین چار دن کے اندر آدمی کیا کر سکتا ہے میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں، کئی ایک تو دعوت نامے بھی ابھی نہیں گئے ارے سہیلہ اسد کا دعوت نامہ تو لا کر دے دو اُسے...''

میں پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔ اگر پتھر کے بت سن سکتے ہیں تو میں نے بھی یہ

Marfat.com

سب کچھ سن لیا مگر کیسے اس کا مجھے یقین نہیں... روبینہ کی منگنی... عامر سے... پہلے تو مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا پھر جب ذرا ہوش و حواس درست ہوئے تو مجھے یاد آیا کہ پچھلے کئی ماہ سے عامر یہاں باقاعدگی سے آ رہا تھا اور روبینہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سہیلہ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ سہیلہ دعوت نامہ لانے کے لیے پاس سے گزری تو نہ جانے کس طرح میں نے اس سے کہا، ''ذرا روبینہ کو بھیج دو۔'' اور خود لڑکھڑاتا ہوا باغ کے ایک خاموش کنج میں چلا گیا۔ بیگم احمد اور سہیلہ دونوں نے یہ ظاہر کیا کہ جیسے انھوں نے مجھ میں کوئی تبدیلی محسوس ہی نہیں کی...

روبینہ کے انتظار میں جانے کتنی صدیاں اور زمانے بیت گئے۔ آخر وہ آئی اور شگفتگی سے بولی، ''ہیلو اسد، بڑے دن بعد آئے...''

''یہ کیا ہو رہا ہے روبینہ؟'' میں نے اُس سے کہا۔

''کچھ نہیں، شادی کر رہی ہوں عامر سے۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''کیوں؟'' میرے منھ سے نکلا۔

وہ ہنس پڑی، ''یہ بڑا عجیب سوال ہے، شادی کیوں کی جاتی ہے۔''

وہ ہنس رہی تھی، اسے میرے احساسات کا ذرا بھی اندازہ نہیں تھا، میرا خون اس طرح کھول رہا تھا کہ منھ سے بات نہ نکلتی تھی، بمشکل خود پر قابو پا کر میں نے کہا، ''روبینہ، کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔''

''کہا ہوگا، مگر مجھے شادی تو کرنی ہی تھی نا اسد۔'' اس نے دل ربائی سے کہا۔

اور کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ اگر میری شادی صبا سے نہ ہوئی ہوتی تو تم بخوشی مجھ سے شادی کر لیتیں۔''

''کہا تھا...'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''اور کیا تم نے ہزاروں دفعہ مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ صبا میرے ٹائپ کی نہیں ہے اور میں نے اس سے شادی کر کے غلطی کی ہے۔''

''تو کیا ہوا۔'' وہ تیکھے تیور سے بولی، ''میں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ میں اب بھی یہی کہوں گی۔''

''مگر اب... جب کہ تمھاری خاطر میں نے صبا کو طلاق دے دی ہے، تم عامر

Marfat.com

سے شادی کر رہی ہو۔"

"طلاق دے دی ہے!" وہ ایک قدم پیچھے سرک گئی۔

"ہاں... آخر مجھے اندازہ ہو گیا کہ واقعی وہ میرے ٹائپ کی نہیں ہے، اپنی اور اس کی ساری عمر تباہ کرنے سے میں نے بہتر سمجھا کہ میں اسے طلاق دے کر تم سے شادی کر لوں..."

"مگر تم نے مجھے بتایا نہیں۔" اس نے کہا۔

"میں صبا کو طلاق نامہ بھیج کر تمھیں بتانا چاہتا تھا کہ تمھاری طرف سے کوئی اعتراض باقی نہ رہے، میں آج اسی لیے آیا تھا۔"

"مگر اب تو میں عامر سے وعدہ کر چکی ہوں۔" اس نے سکون سے کہا۔

"روبینہ!!" میں چلایا، "میرا اور تمھارا وعدہ بہت پرانا ہے، تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے ہمیشہ محبت کرو گی..."

"مگر میں نے تم سے شادی کا وعدہ نہیں کیا تھا۔"

"روبینہ... میں نے صرف تمھاری خاطر صبا کو طلاق دی ہے، سوچو تو..."

"میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ تم صبا کو طلاق دے دو گے۔"

"تمھیں حاصل کرنے کا ایک یہی طریقہ تھا روبینہ اور تمھیں خوب معلوم تھا کہ تمھیں حاصل کرنے کے لیے ایک نہ ایک دن میں صبا کو چھوڑ دوں گا۔ اسی لیے تم میرے اتنے نزدیک آتی رہیں روبینہ..."

"یہ غلط ہے... تم میری طرف کھنچ رہے تھے، یہ دیکھ کر کہ حالات زیادہ خراب نہ ہو جائیں میں نے عامر سے شادی کا وعدہ کر لیا۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔" میں دھاڑا، "تم نے کہا تھا کہ عامر یہاں سہیلہ کی خاطر آتا ہے..."

"میں یہی سمجھتی تھی مگر جب اس نے مجھے پروپوز کیا تو سب کی یہی رائے ہوئی کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ ابا اور امی نے اس بات پر زور دیا کہ میں جلد سے جلد اپنی منگنی کا اعلان کر دوں..."

"تم اس منگنی سے انکار کر دو، روبینہ۔" میں نے ٹھنڈا پڑ کر لجاجت سے کہا،

Marfat.com

"میں نے صرف تمھاری خاطر صبا کو چھوڑا ہے۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو اسد۔ میں اتنی کمینی نہیں بن سکتی، اپنی دوست کے شوہر سے شادی کر کے میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔ لوگ میرے منہ پر تھوکیں گے..."

مجھے پھر تاؤ آ گیا۔ "لوگ اس وقت بھی ہمارے منہ پر تھوکتے تھے جب راتوں کو ہمیں پکچر میں اور ساتھ ٹہلتے دیکھتے تھے... شادی کے بعد کم از کم یہ سب جائز ہو جائے گا۔"

"میں یہ سارے اسکنڈلز اور افواہیں عامر سے شادی کر کے ختم کر دینا چاہتی ہوں، اس وقت لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہمارے دل میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم صرف دوست تھے۔"

"روبینہ! کیا تمھارے نزدیک یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ میں نے صبا کو چھوڑ دیا ہے صرف تمھیں اپنانے کے لیے۔"

"اسد!" اس نے یکایک بے حد سنجیدہ بن کر کہا، "اوّل تو مجھے اس کا یقین نہیں کہ تم نے صبا کو واقعی طلاق دے دی ہے اور اگر تم نے ایسا کیا ہے تو سخت حماقت کی ہے، میرے اوپر اس کا الزام اس لیے نہیں آتا کہ جب میں نے تمھیں اس بات کا اشارہ دیا تو تم نے کبھی Commit نہیں کیا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ تم صبی کو نہیں چھوڑو گے تو تم یہ خبر لے کر میرے پاس آئے ہو۔ اب اگر تم نے طلاق دے بھی دی ہے تو اپنی خاطر دی ہوگی میری خاطر نہیں۔"

"روبینہ، روبینہ..." میں نے غصّے سے کہا، چڑ کر کہا، نرمی سے کہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تب میں نے اپنا آخری وار کیا۔

"تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔" میں نے کہا، "اور میں جانتا ہوں، کیوں... عامر کے والد کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے اور سنا ہے اسے جائیداد میں بہت کچھ ملا ہے..."

"یہی سمجھ لو۔" اس نے سکون سے گھر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

برآمدے سے ذرا فاصلہ پر اُس نے پلٹ کر دیکھا اور کہا "کل آؤ گے نا" اور اندر چلی گئی۔

Marfat.com

میں کس طرح واپس لوٹا، کس راستے سے آیا کب اور کیسے اندر داخل ہوا مجھے کچھ یاد نہیں، میں رات تک بیٹھا سگریٹ پیتا رہا یا یوں ہی بیٹھا رہا، سوچتا رہا یا خالی الذہن رہا مجھے کچھ یاد نہیں۔ شاید نو بجے تک مجھے نیچے نہ جاتے دیکھ کر بیرا میرا کھانا اوپر لے آیا۔ اس نے کھانا میرے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ اس میں غیر ملکی مہر کا سرخ اور نیلے کناروں والا لفافہ میں نے غیر شعوری طور پر اُٹھا لیا اور کھول لیا۔ اس میں دو الگ الگ خط تھے، میں انھیں کئی مرتبہ شروع سے آخر تک پڑھ گیا لیکن میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑا، جیسے آج ساری زبانیں میرے ذہن سے محو ہوگئی ہوں، میں نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا، ایک گلاس پانی ٹرے سے اُٹھا کر پیا اور پھر غور سے دونوں خطوں کو پڑھا۔ اس وقت ان خطوں میں لکھی گئی حقیقت بجلی بن کر اس ذہن پر گر پڑی جو چند لمحے پیش تر تک پہلے ہی ماؤف تھا۔ شاید قدرت ساری مصیبتیں ایک خاص دن کے لیے اُٹھا رکھتی ہے تاکہ ایک دم کسی کے سر پر دے مارے، یہ حقیقت جو اس خط میں درج تھی، روبینہ سے شادی نہ ہو سکنے کے مقابلے میں کئی گنا بڑی تھی... کئی گنا تلخ تھی... ایک خط سینٹ اینتھنی چرچ، نیو یارک کے فادر اینڈرسن کا تھا، لکھا تھا:

مائی ڈیئر اسد...

کیتھرین ہل نے اپنی آخری بیماری کے دوران میں یہ تحریر لکھی تھی۔ اپنے آخری وقت میں گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہ تحریر اس نے مجھے دی تھی اور کہا تھا کہ اسے تم تک پہنچا دوں۔ لفافے پر پتا بھی خود اس نے لکھ کر رکھا تھا۔ اب وہ اس دُنیا میں نہیں ہے، خدا اس کی روح کو بخشے۔ اُمید ہے تم اس کی دکھی روح کو معاف کر دو گے۔

تمھارا، فادر اینڈرسن

دوسرا خط کیٹی کا تھا۔ اس نے اپنی ترچھی گھسیٹ تحریر میں لکھا تھا:

ڈیئرسٹ اسد...

میں تم سے بے حد... بے حد شرمندہ ہوں... اب آخری وقت میں اعتراف کرتی ہوں کہ بوبی تمھارا بیٹا نہیں ہے۔ وہ تمھارے یہاں

Marfat.com

پہنچنے سے پہلے ہی میری کوکھ میں پرورش پا رہا تھا۔ وہ تمھارے دوست اصغر کا تحفہ ہے۔ میں نے جب تمھارے دوست سے اس بات کا ذکر کیا تو اس دن کے بعد اس نے مجھے شکل نہیں دکھائی۔ وہ چپ چپاتے اپنے وطن واپس چلا گیا۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد زچ ہو کر میں نے اسے تمھارے، اس کے باپ کے ایک ہم وطن اور دوست کے سر تھوپ دیا۔ مجھے اس سے اُس وقت جو سکون میسر آیا تھا۔ اس لمحے وہی میری روح کو ڈس رہا ہے، میں نے زندگی میں اور بہت گناہ کیے ہیں مگر محسوس ہوتا ہے جیسے میرا یہ گناہ سب سے عظیم اور ناقابلِ معافی ہے۔

تم یہ جان کر بہت دکھی اور بہت خفا ہوگے مگر اپنی روح کو شانت کرنے کا ایک یہی طریقہ میری سمجھ میں آیا کہ غائبانہ طور پر تمھارے سامنے گھٹنے ٹیک کر اپنے گناہ کا اقرار کرلوں۔

جو کبھی تمھاری کیٹی تھی...

یہ خط دہکتا ہوا انگارہ بن کر میری انگلیوں، میرے حواس اور میرے ذہن کو جھلس گیا لیکن اس وقت میں ہوش میں تھا۔ صبا کو طلاق دے دینے کا خیال، روبینہ کا شادی سے انکار اور یہ کہ بوبی میرا بیٹا نہیں ہے... یہ باتیں ایک کر کے میرے ذہن میں اپنی جگہ پا رہی تھیں، کچھ سوچ کر میں نے اوور کوٹ پہنا اور سیدھا منیجر کے پاس گیا۔ اس سے کہا کہ میں کراچی ایک ضروری ٹیلی فون کال بک کرنا چاہتا ہوں اور جب تک بات نہ کرلوں آفس سے نہیں جاؤں گا، خواہ ساری رات گزر جائے، شاید منیجر نے میرے چہرے سے اس کال کی اہمیت کا اندازہ لگا لیا۔ اُس نے کہا کہ وہ آفس تو نہیں کھول سکتا، البتہ ٹیلی فون سیٹنگ روم میں رکھوا دے گا۔ میں جب تک چاہوں اس سے اُلجھتا رہوں، میرے جانے کے بعد چوکیدار سیٹنگ روم بند کردے گا... بیرے نے ٹیلی فون آفس سے ملے ہوئے سیٹنگ روم میں رکھ دیا جو پارٹیوں کے موقعوں کے علاوہ ہمیشہ خالی پڑا رہتا تھا۔ میں نے کراچی اصغر کے نمبر پر کال بک کی اور اسی طرح ایک پہلو میز پر جما رہا۔

Marfat.com

بہت دیر بعد کال تھرو ہوئی مگر اصغر نہیں ملا۔ نوکر نے بتایا کہ وہ کسی ایمبیسی کی پارٹی میں گیا ہوا ہے، میں پیغام دے دوں۔ میں نے کہا پیغام کوئی نہیں ہے جس وقت بھی وہ آئیں گے، میں ان سے بات کروں گا۔ اس کے بعد میں نے اصغر کے نام کی کال بک کی اور انتظار کرتا رہا۔ سردیوں کی اندھیری اور لمبی رات تھی، میں اوورکوٹ میں بھی اس ٹھنڈے کمرے میں سکڑ رہا تھا... برفیلی ہوا کے شور کے سوا ہر طرف سناٹا تھا، باہر کی ٹھٹھرن اور ہوا سے بچنے کے لیے چوکیدار بھی نہ معلوم کس کونے میں جا کر دبک گیا تھا۔

رات کے ایک بجے اصغر مجھے فون پر ملا۔ اس کی آواز بھاری تھی، وہ خوب پیے ہوئے تھا مگر بدمست نہیں تھا۔

''کون ہے، بھئی؟'' اس نے اپنی بھاری لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں اسد ہوں، کوئٹہ سے بول رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اوہو... اس وقت کیا کام ہے، کوئی ضروری بات ہے؟''

''ہاں، ضروری بات ہے۔'' میں نے کہا، ''غور سے سنو۔ آج کیٹی کا خط آیا ہے، اس نے مرتے وقت فادر اینڈرسن کے سامنے کنفیس کیا ہے کہ...''

''کون کیٹی؟'' بھاری آواز میں اس نے بات کاٹی۔

''کیٹی... کیتھرین ہل۔ امریکا میں جس کے ساتھ تم رہتے تھے اور جس کا پتا تم نے مجھے...''

''اوہ... ہاں یاد آیا۔ ٹھیک... کیا لکھا ہے اس نے؟'' اصغر نے سکون بھرے لہجے میں قدرے بے پروائی سے کہا۔

''اس نے لکھا ہے بلکہ اس نے اقرار کیا ہے کہ بوبی میرا بیٹا نہیں، تمھارا بیٹا ہے۔ سینٹ انتھنی چرچ، نیو یارک کے فادر کا تصدیق نامہ اس کے ساتھ ہے۔ سن رہے ہو؟''

''ہاں...''

''سن رہے ہو تو کچھ کہتے کیوں نہیں۔''

''کیا کہوں؟''

''تمھیں یہ سن کر تعجب نہیں ہوا کہ بوبی میرا نہیں تمھارا بیٹا ہے۔''

Marfat.com

دوسری طرف سے اس کے بھاری بے ہنگم قہقہے کی آواز آئی... کیا فرق پڑتا ہے یار۔ میرا ہو یا تمھارا ایک ہی بات ہے۔"

میں غصے سے کھول اُٹھا... ایک ہی بات ہے۔ خود پر قابو پا کر میں نے بمشکل کہا، "سنو، تم بوبی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو؟"

"نہیں..." اُس نے سکون سے کہا۔

میں ٹیلی فون میں اتنے زور سے گرجا کہ شاید آفس کے علاوہ ڈائننگ ہال اور کچن تک میری آواز سے گونج اُٹھا ہو۔ "یہ معلوم ہونے کے بعد کہ بوبی میرا بیٹا نہیں ہے میں اسے کیسے پال سکتا ہوں۔"

"تو مت پالو..." ادھر سے آواز آئی۔

"تو تم اسے نہیں لو گے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ارے میاں، اگر ہم اس طرح اپنے بچوں کو سمیٹتے پھریں تو پورا ایک یتیم خانہ بن جائے..." پھر اس کے بے ہنگم بے سرے قہقہے کی آواز آئی... مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں نے فون کا ریسیو زور سے زمین پر دے مارا اور پاگلوں کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔

کبھی آپ نے unbreakable شیشہ ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے؟... اس کی بناوٹ دوسرے عام شیشوں سے مختلف ہوتی ہے، اسے بناتے ہی فوراً ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے جس سے وہ زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ عام حالات میں وہ نہیں ٹوٹتا، خواہ آپ اسے زمین پر دے ماریں لیکن جب وہ ایک خاص پہلو سے گرتا ہے یا کسی چیز سے ٹکراتا ہے تو ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ یوں بکھر جاتا ہے کہ اس کی اصل بناوٹ اس پر بنے ہوئے نقش و نگار اور ڈیزائن کسی صورت نہیں پہچانا جاتا۔ ایک گلاس کے ٹکڑے دس گلاسوں کے ٹکڑوں کے برابر معلوم ہوتے ہیں اور غور سے دیکھنے پر ہر چھوٹے بڑے ٹکڑے پر اور دسیوں ٹکڑوں کے بال پڑے نظر آتے ہیں۔ میرا دل بھی اس شیشے کی طرح تھا۔ اس کی بناوٹ میں کوئی بنیادی فرق تھا۔ شاید وہ ماما کی آنچ میں تپا کر جلد ہی ٹھنڈا کر دیا گیا تھا۔ بچپن ہی سے لا اُبالی اور کوئی بات دل کو نہ لگانے والا مشہور تھا۔ میری چیزیں گم ہو جاتیں تو میں پیشانی پر بل تک نہ لاتا، میں نے سنا ہے کہ جب میرے ایک بھائی کا

انتقال ہوا ہے تو گھر بھر میں ایک میں تھا جس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔ بعد میں بھی کئی گھاؤ بڑی مردانگی سے سہہ گیا لیکن یک لخت یہ چوٹ کاری لگی۔ شاید اس خاص پہلو پر جس نے میرے پتھر دل کے ریزے ریزے کر دیے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے دل کے ٹکڑوں پر اسی طرح سیکڑوں بال پڑے ہوں گے کہ جتنے ٹکڑے ہوں، ان سے پانچ گنا ٹکڑے اور بنائے جاسکتے ہوں، ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے، ضبط کی بھی... میں نے بوبی سے ٹوٹ کر محبت کی تھی، اس سے زیادہ میں کسی جان دار یا بے جان چیز سے محبت نہیں کرسکتا تھا اور اس کا صلہ کیا تھا؟ دل و دماغ کی پہلے سے سلگتی بھٹی میں یہ خبر کہ بوبی میرا بیٹا نہیں ہے...

برآمدے میں تیزی سے چلتے ہوئے چند اور سین بجلی کے کوندوں کی طرح لپک رہے تھے، اس میں کیٹی تھی جس کا خوب صورت چہرہ نزع کی تکلیف سے ستا ہوا تھا، اس میں روبینہ تھی جس نے مجھے دھوکا دیا تھا اور ڈھٹائی سے میرے منہ پر جھوٹ بول گئی تھی اس میں اصغر تھا جو مجھے بیوقوف سمجھ کر بے ہنگم بے ڈول قہقہے لگا رہا تھا اور بوبی... خوب صورت، معصوم شریر بوبی جس کو میں نے اپنے جگر گوشے کی طرح پالا تھا جس سے اپنی والہانہ محبت کو ابھی تک میں فطری سمجھتا تھا، جو میرا نہیں تھا، قطعی میرا نہیں تھا۔

میں اس جنون کے عالم میں دو دو، تین تین سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر پہنچا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر بھی میں نے چند بار دیوانہ وار چکر لگائے اور پھر شاید میں بوبی کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ اس وقت میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا اور مجھے یاد نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ صبح کو جس وقت مجھے ہوش آیا میں نے اپنے گرد بہت سے لوگوں کو پایا، اس میں پولیس بھی تھی اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ بوبی بستر پر مرا ہوا پایا گیا ہے..."

○○○

Marfat.com

۱۱

یہ اسد کا بیان تھا جو اُس نے اپنے وکیل کو لکھ کر دیا تھا۔ عامر اپنے پاس مشہور مقدموں کے فیصلے اور خاص خاص بیانات کی کٹنگ رکھا کرتا ہے۔ یہ بیان اُس نے فیصلہ ہوجانے کے بعد اپنے استاد اور ابا کے دوست سے لیا تھا جو اس مقدمے میں وکیلِ صفائی تھے۔ ان کے تجربے ان کی قابلیت اور ان کی محنت نے اسد کی جان بچالی تھی، اس بات کا پورا ثبوت موجود ہوتے ہوئے کہ بوبی کی موت اسد کے ہاتھوں ہی واقع ہوئی، وہ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ اسد ایک ذرا سی لغزش کے ہاتھوں اپنی بھرپور جوانی قید میں کاٹ رہا تھا، یہ سوچ کر میں بہت دیر تک روتی رہی، صبا غریب وہ ناکردہ گناہ ہستی تھی جو دوسروں کے کیے کا خمیازہ بھگت رہی تھی مگر بڑی ہمت سے۔ عامر سے یہ بات سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی... واقعی اگر عامر اسے اپنا لے تو کتنا اچھا ہو، سارا دن میں سوچتی رہی۔

دوسرے دن شام کو میں اور عامر صبا سے ملنے گئے (امجد اپنے کسی دوست سے ملنے گئے ہوئے تھے)... دروازے پر ایک پیاری گھونگریالے بالوں اور بھولے بھولے چہرے والی بچی آیا کے ساتھ کھڑی تھی۔ عامر نے اس کی طرف ہاتھ پھیلائے اور وہ لپک کر اس کے بازوؤں میں آگئی۔ عامر نے چٹاچٹ اس کے گالوں پر کئی پیار کیے جس سے اس کا میدے ایسا رنگ لال بھبوکا ہوگیا۔ اسے اپنے بازوؤں میں تھامے وہ آگے بڑھا، برآمدے میں صبا بیٹھی سائنس کی موٹی موٹی کتابوں میں الجھی ہوئی تھی، ہمیں دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، مجھ سے تپاک سے ملی اور ہم سب وہیں بیٹھ گئے۔

Marfat.com

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' میں نے تپائی پر رکھی ہوئی موٹی موٹی کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔

''ایف ایس سی کا امتحان دے کر میڈیسن میں داخلہ لوں گی۔''

''یہ کیوں؟''

''زندگی میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے آپ کو بھولنے کا بہانہ کہہ لیجیے۔''

''وہ تو تم اپنی افسانہ نگاری سے بھی کر سکتی ہو... تمھارے افسانے پڑھ کر دل بہت خوش ہوتا ہے۔''

''شکریہ...'' اس نے کہا، ''مگر دماغی کام انسان کے ذہن کو اُلجھاتا ہے، آپ تو خود لکھتی ہیں آپ کو اندازہ ہوگا کہ لکھنے میں بار بار اپنے ہی زخم کریدنے پڑتے ہیں۔ میں اپنے ہاتھ پاؤں ہلا کر کوئی کام کرنا چاہتی ہوں۔''

وہیں بیٹھے بیٹھے ہم نے چائے پی اور رات گئے تک ملک کے نئے ازدواجی قانون اور نئے آئین اور دوسری باتوں پر بحث کرتے رہے۔ پچھلی باتوں کا نہ صبا نے ذکر چھیڑا نہ میں نے اشارہ دیا۔ اتنی دیر تک ہماری باتوں میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ عامر پورے وقت ایمی سے الجھا رہا۔ کبھی اسے گود سے اُتار دیتا، وہ یوں ڈگمگاتی ہوئی چلتی جیسے کوئی چھوٹی سی کشتی ہوا کے رُخ پر جا رہی ہو، شاید اُس نے ابھی ابھی چلنا سیکھا تھا۔ تھوڑی دور جاتی تو عامر اسے پھر اُٹھا لاتا۔ کبھی گود میں بٹھا کر بھینچتا، کبھی اُچھالتا اور کبھی اسے لے کر باغ میں نکل جاتا۔ یہ سب وہ اتنے غیر شعوری طور پر کر رہا تھا کہ مجھے اس پر بے اختیار پیار آنے لگا۔ اسے یہ احساس تک نہیں تھا کہ اس کی ان حرکتوں کو دوسرے معنی بھی دیے جا سکتے ہیں۔

جب رات زیادہ ہو گئی تو ہم چلنے کے ارادے سے باہر آگئے۔ بادلوں کی آغوش میں لپٹا چاند سنولائی ہوئی سی روشنی بکھیر رہا تھا۔ باغ میں ٹھہرے، سہمے سہمے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ جھکے جھکے درخت چپ چاپ کھڑے تھے... عامر آگے چلا گیا تو میں نے صبا سے کہا۔

''صبا میں تم سے ایک ضروری بات کہنے آئی ہوں۔''

''کہیے...'' اس نے اپنی لمبی لمبی پلکیں اُٹھا کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ عامر... آج بھی تمھاری راہ میں آنکھیں بچھائے تمھارا انتظار کر رہا ہے تو یہ شاعری نہیں ہوگی۔ یقین کرو کہ تمھارے سوا وہ کسی لڑکی کا نام تک سننا گوارا نہیں کرتا۔''

صبا نے نظریں جھکالیں اور ناخنوں سے کھیلتی رہی۔

''بولو صبا... کیا کہتی ہو۔ کیا اس کا دل توڑ دو گی؟''

وہ نظریں نیچے کیے کیے بولی، ''شمسہ باجی آپ جانتی ہیں، ابھی وہ سارے زخم تازہ ہیں، ان باتوں کو نہ چھیڑیے... مجھے یہ سب کچھ بھول جانے دیجیے۔'' پھر شاید اس نے زیرِلب دہرایا، ''مجھے یہ سب بھول جانے دیجیے...''

تب گھر آ کر میں نے عامر سے کہا، ''وہ ٹھیک کہتی ہے، وہ تھک چکی ہے۔ اس کے پاؤں میں چھالے ہیں، اسے تازہ دم ہونے دو۔ ان چھالوں کو پھوٹ کر خشک ہو جانے دو۔ اگر وہ ان کا ذکر نہیں کرتی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ زخم بھر گئے ہیں... عامی! تمھارے لیے صرف ایک ہی راہ ہے، انتظار... اس کا مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن اس کا انکار اقرار سے بدل جائے گا۔ مرد کی طلب صادق ہو تو عورت کا انکار آندھی میں جلنے والے چراغ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ کم زور اور تنہا عورت خواہ وہ صبا جیسی آہنی شخصیت کی مالک ہی کیوں نہ ہو، آج بھی برسوں پہلے کی طرح زندگی کے طوفانِ باد و باراں میں اپنے لیے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی، یہی اس کی کم زوری ہے۔''

''اور شاید یہی اس کی جیت ہے۔'' عامر نے زیرِلب کہا۔

OOO

Marfat.com

AABLA PA (Novel) By: **Razia Fasih Ahmad**

رضیہ فصیح احمد عصرِ حاضر کے معروف کہانی کاروں میں ہیں۔ وہ لگ بھگ چالیس برس سے تخلیقِ ادب میں مصروف ہیں۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور ناول بھی اور دونوں ہی اصناف میں اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے سفرنامے بھی شائع ہوئے ہیں اور حال ہی میں ان کی غزلوں نظموں کا مجموعہ بھی منظرِ عام پر آیا ہے۔

رضیہ فصیح احمد کے ناول بی اے اور ایم اے کے ادبی نصاب میں شامل ہیں۔ انھیں ناول اور سفرنامہ نگاری کے حوالے سے اعزازات بھی مل چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کے تراجم انگریزی، چینی، ترکی، ہندی اور گجراتی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی سے ان کے ڈرامے اور کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل بھی نشر ہو چکی ہے۔ بی بی سی ورلڈ سروس سے بھی ان کی کہانیاں براڈکاسٹ ہوئی ہیں۔ ان کے کئی ڈرامے اور ناول ''آبلہ پا'' بھی اسٹیج پر پیش کیے جا چکے ہیں۔

آج کل رضیہ فصیح احمد ایک انگریزی اخبار میں مزاحیہ کالم لکھ رہی ہیں۔

مصنفہ کی کتابیں

۱۔	آبلہ پا	(ناول)	۱۹۶۴ء
۲۔	سیرِ پاکستان	(سفرنامہ)	۱۹۶۵ء
۳۔	انتظارِ موسمِ گل	(ناول)	۱۹۶۵ء
۴۔	اِک جہاں اور بھی ہے	(ناول)	۱۹۶۶ء
۵۔	دو پاٹن کے بیچ	(افسانے)	۱۹۶۶ء
۶۔	متاعِ درد	(ناول)	۱۹۶۹ء
۷۔	تپتی چھاؤں	(ناولٹ)	۱۹۶۹ء
۸۔	آزارِ عشق	(ناول)	۱۹۷۱ء
۹۔	بے سمت مسافر	(طویل افسانے)	۱۹۷۹ء
۱۰۔	بارش کا آخری قطرہ	(افسانے)	۱۹۸۴ء
۱۱۔	صدیوں کی زنجیر	(تاریخی ناول)	۱۹۸۶ء
۱۲۔	یہ خواب سارے	(ناول)	۱۹۹۲ء
۱۳۔	کالی برف	(افسانے)	۱۹۹۲ء
۱۴۔	سچ بولنے کا وقت	(مزاحیہ مضامین)	۱۹۹۲ء
۱۵۔	دو تھے مسافر	(سفرنامہ)	۱۹۹۹ء
۱۶۔	چاکِ قفس	(شاعری)	۲۰۰۳ء
۱۷۔	ورشا اور دوسری کہانیاں	(افسانے)	۲۰۰۳ء